بانی
سہام مرزا

مُدیرِ اعلیٰ ______ منزہ سہام

مُدیر ______ کاشی چوہان/ رضوانہ پرنس

نائب مُدیر ______ دانیال شمسی

منیجر مارکیٹنگ ______ زین العابدین

قانونی مُشیر ______ جی ایم بھٹو (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

انکم ٹیکس ایڈوائزر ______ مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

MEMBER
APNS
CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

اگست 2015ء
جلد: 43 ☆ شمارہ: 08
قیمت: 60 روپے

خط و کتابت کا پتا

88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ

جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز 7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

☆ منیجر سرکولیشن: محمد اقبال زمان ☆ عکاس: موسیٰ رضا/ مرزا محمد یاسر

باتیں ملاقاتیں

ناول

مکمل ناول

افسانے

ناولٹ

افسانے

انتخابِ خاص

رنگ کائنات

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com

پرل پبلی کیشنز کی جانب سے تمام اہلِ وطن کو
14
august
Happy Independence
یوم آزادی
کی مبارک باد

ہیٹ اسٹروک

اگر پانی میں آکسیجن کی تاثیر ختم ہو جائے۔ بس ہائیڈروجن رہ جائے۔ پانی بنتا رہے۔ H_2O کا فارمولہ چلتا رہے مگر...... بے جان پانی۔ زندگی کے بجائے موت دیتا پانی...... گیسیں اپنے ساتھ جوڑ جوڑ کر نئے کیمیکل کو ایجاد کرتا نیا مائع...... اگر ایسا ہو جائے۔ تو کیسا ہو؟

جب زمین پر کچھ نہیں تھا تو پانی تھا۔ شفاف پانی۔ بے رنگ، کانچ جیسا چمکتا پانی۔ گرین لیک کے سبز پانی سا شفاف۔ جس صحرائے اعظم میں صرف جنگلی، آدم خور قبائل کا راج آج بھی قائم ہے۔ جو صرف زندگی سے جڑے رہنے کی حد تک انسان ہیں۔ اور بس ہیں حیوان۔ آدم خور۔ مگر ان کے پاس بھی قدرت نے پانی کی خالص شکل قائم رکھی ہے اور وہی پانی ان کو طاقت بخشتا ہے۔

ساتھیو! حال ہی میں ہم نے دیکھا، محسوس کیا، اور سہا...... جب پانی میں آگ لگ جائے تو Heat Stroke جیسے سانحات کا جنم ہوتا ہے۔ آج بھی ذرا اس کائنات سے پرے ہٹ کر دیکھیں تو پانی کی نیلی گیند ویسی ہی دکھتی ہے۔ جس پر ہوا چل رہی ہے۔ پانی میں کہکشاں کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ مگر اب آہستہ آہستہ یہ عکس دھندلا ہوتا جا رہا ہے۔ زمین کو زندگی کی عفریت کھانے لگی ہے۔

سادہ زندگی، کتنی سہل اور مزیدار تھی، جس میں ماں صحن میں بیٹھی پرات میں پانی بھر کر چاند کو بلاتی تھی، بچوں کو دکھاتی تھیں۔ دل بہلاتی تھی۔ مگر آج!! کہاں گیا وہ پانی...... ہم ترس کر رہ گئے ہیں۔ پانی غائب ہوا اور پھر پانی بھی ہم سے روٹھ گیا۔ پانی نہ ملا تو لوگ مرنے لگے۔ پانی کی ہائیڈروجن بھی Steam بن گئی۔ اب مائیں کیسے چندا ماما کو اپنے صحن میں اتاریں......

پیارو! باز آجاؤ۔ تمہاری نیلی گیند گرد میں اٹتی جا رہی ہے۔ یہ شفاف نیلی زمین میلی ہو چکی ہے یہ ہیٹ اسٹروک آسمان سے نہیں اترا۔ یہ تمہارے اپنے کرموں کا پھل ہے۔ انجنوں سے چلنے والی زندگی نے تمہارے آسمان میں سوراخ کر دیے ہیں۔ اوزون کی تہہ پھٹ رہی ہے۔ تم اپنے ہاتھوں سے اپنا حفاظتی حصار توڑ رہے ہو۔ خدارا لوٹ جاؤ! اسی زندگی کی طرف جو دھواں اگلنے کے بجائے گھنے جنگل اگاتی تھی۔ اگر تم دھواں اڑانے سے باز نہ آئے تو بہت جلد اس کائنات میں دھواں بن کر تحلیل ہو جاؤ گے۔

کاشی چوہان

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلے کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مُدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز : 88-C-II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبر: 021-35893121-35893122
ای میل : pearlpublications@hotmail.com

زادِ راہ

لمحے گزرتے اور ماضی بنتے رہتے ہیں لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اب بھی وہ صرف خود کو ہی دیکھتا ہے۔ جسم تھکنے لگتا ہے۔ مضبوط اعضاء ڈھلک جاتے ہیں۔ ہاتھ کمزور اور پیر شل ہونے لگتے ہیں۔ وہ اسے صرف بڑھاپا قرار دیتا ہے۔ عمر کا تقاضا......

زندگی کو آسان، باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

انسان عمر بھر اپنے سے وابستہ ہر شے پر بھروسہ کرتا اور انہیں اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ انہیں اپنی طاقت جانتا اور فخر کرتا ہے۔ اسے اپنے اعضاء اپنی قوت نظر آتے ہیں، اپنی اولاد اپنی شان، اپنی دولت اپنا سرمایہ اور اپنے اقرباء اپنی مضبوطی لگتے ہیں۔ وہ کنبوں پر، رشتوں، مناصب اور حیثیتوں پر بھروسہ کرتا ہے۔ ان ہی چیزوں کو متاعِ حیات سمجھتا ہے اور انہی کو حیات۔ چنانچہ پوری زندگی یہی گردان کرتا ہے کہ میں، میرا جسم، میرے ہاتھ پاؤں، میرا مال، میری اولاد، میرا کنبہ اور میری طاقت، میرا عہدہ میرا منصب، یہی سوچ اسے خوش رکھتی ہے کہ یہ سب کچھ اس کا ہے۔ ملکیت میں رہنے والی ان ہی چیزوں میں وہ دوسروں سے اپنا مقابلہ کرتا اور ان ہی میں سب سے آگے بڑھ جانے کی تگ و دو کرتا ہے۔ اس کے غم اور خوشی ان ہی چیزوں میں ہوتے ہیں۔ آگے بڑھ جانا اور پیچھے رہ جانا ہوتا ہے۔ اسی کوشش میں زندگی گزارتا ہے۔

وقت گزرتا رہتا ہے۔ اسے کچھ اور سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہاتھ پاؤں اور جسم مضبوط ہے۔ دولت ہے۔ اولاد ہے۔ اس کی پوری زندگی اپنی ذات، اپنی اولاد اور اپنی دولت اور منصب کے گرد گھومتی ہے۔

وہ نہیں سوچتا، زندگی کے اس سفر میں ہر لمحہ کشاں کشاں اسے آخری منزل کی طرف لے جارہا ہے۔ لمحے گزرتے اور ماضی بنتے رہتے ہیں لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اب بھی وہ صرف خود کو ہی دیکھتا ہے۔ جسم تھکنے لگتا ہے۔ مضبوط اعضاء ڈھلک جاتے ہیں۔ ہاتھ کمزور اور پیر شل ہونے لگتے ہیں۔ وہ اسے صرف بڑھاپا قرار دیتا ہے۔ عمر کا تقاضا سمجھتا ہے اور اس کے مطابق اپنی دولت اور منصب کی زیادہ سے زیادہ حفاظت کرتا ہے۔ آنے والے وقت کے اندیشے اب بھی اسے مال کی حفاظت یا مال میں اضافے

پراکساتے ہیں۔
وقت کچھ اور گزر جاتا ہے۔ پھر چلنا پھرنا مشکل اور کام کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ وہی آنکھیں جو جوانی میں موتیوں کی طرح چمکتی تھیں‘ ان میں موتیا اتر آتا ہے۔ کان جو مدھم مدھم سی سرگوشیاں بھی سن لیتے تھے‘ اب بلند آواز پر بھی دھرے نہیں جاتے۔ وہ خود کو ناتواں محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اس کے اشاروں میں جان نہیں اور آرڈر میں طاقت نہیں رہی‘ تب وہ مزید شدومد سے خساروں سے بچنا چاہتا ہے مزید مال سمیٹتا ہے۔

فرمایا گیا۔ ’’تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا سمیٹنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے، یہاں تک کہ تم قبر کے کنارے تک پہنچ جاتے ہو۔‘‘ (102:2)

بچپن غفلت میں۔

لڑکپن کھیل کود میں۔

جوانی دنیا سمیٹنے میں اور بڑھاپا آنے والے وقت کے خوف سے مال کی حفاظت کرنے میں گزر گیا۔

مال کو، منصب، حکومت اور تخت و تاج کو محفوظ کرنے کے لیے انسان وارث کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ مال، یہ منصب، حکومت یا بادشاہت سب کچھ بیٹوں کو دے دوں گا تو یہ سب میرا رہے گا۔ موت کا ہاتھ اسے اس کے مال سے جدا کیے دے رہا ہے اور وہ اسے محفوظ کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے اور سب کچھ وراثت میں دے کر آخر ایک دن مر جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ انسان کے تین دوست ہیں۔ ایک زندگی بھر اس کے ساتھ رہتا ہے موت کے وقت اس سے الگ ہو جاتا ہے۔

دوسرا قبر تک اس کے ساتھ چلتا ہے، اس کے قبر میں جانے کے ساتھ ہی جدا ہو جاتا ہے۔

تیسرا دوست، وہ جو قبر میں بھی اس کے ساتھ جاتا ہے۔ بتاؤ ان میں سے سب سے بہترین دوست کون ہے؟؟؟

صحابہ اکرامؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! جو قبر میں بھی ساتھ جائے‘ وہی دوست سب سے بہترین ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا پہلا دوست مال ہے جو عمر بھر ساتھ رہتا ہے۔

دوسرا دوست اولاد ہے جو قبر تک ساتھ جاتی اور پلٹ آتی ہے اور تیسرا دوست اعمال ہیں، جو قبر میں بھی ساتھ جاتے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

اللہ تعالیٰ تک رسائی کا ذریعہ اعمال ہیں، جو ہمیشہ ساتھ دیتے ہیں مگر انسان سب سے کم ساتھ دینے والی چیزوں پر بھروسہ کرتا ہے اور قبر کے کنارے تک ان ہی چیزوں پر بھروسہ کرتے کرتے جا پہنچتا ہے۔ انسان کبھی بھولے سے بھی یہ نہیں سوچتا کہ ان میں سے کچھ بھی اس کا نہیں۔ اس عارضی زندگی کی طرح یہ سب کچھ بھی عارضی ہے بلکہ اصل معنوں میں مشکل وقت آنے پر یہ سب چیزیں اسی کے خلاف گواہی دیں گی۔ وہی باپ جس سے بیٹا سب کچھ لیتا ہے اور وہی بیٹا جسے انسان عمر بھر اپنی طاقت سمجھتا ہے۔ سب مال متاع اسی کو دے کر مرتا ہے، وہ باپ اور بیٹا سب سے بڑے ہنگامہ (قیامت) کے وقت ایک دوسرے کو پہچانیں گے بھی نہیں۔ اسی کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

’’لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو اور ڈرو اس دن سے، جب کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا اور کوئی بیٹا اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ دینے والا نہیں ہوگا۔ فی الواقع اللہ کا

وعدہ سچا ہے۔ پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔" (33:31)

انسان عمر بھر کنبہ کنبہ کرتا ہے، اسی کو اپنی طاقت گردانتا ہے، پوری زندگی فخر کرتا ہے۔ زمانہء جاہلیت میں تو لوگ فرزند، کنبہ، علاقہ اور ذات پات ہی کو غرور کا سبب سمجھتے تھے، تعارف بھی کراتے تھے تو ان ہی چیزوں کے ذکر سے اور لوگ ان سے مرعوب بھی ہوتے تھے تو ان ہی چیزوں کے ذکر سے، لیکن تفاخر کا سبب یہ چیزیں آج بھی ہیں۔ آج بھی اسی انداز میں اپنی پہچان بتائی جاتی ہے۔ میرے والد فلاں عہدے پر فائز ہیں، بھائی فلاں فلاں پر۔ ہم ڈیفنس میں رہتے ہیں۔ اتنی بڑی کوٹھی ہے اور اتنے ملازم ہیں۔

یہ تفاخر کا قدرے جدید انداز ہے۔ ان ہی سب کے بارے میں فرمایا جارہا ہے۔

"آخر کار جب وہ کانوں کو بہرا کردینے والی آواز بلند ہوگی، اس روز آدمی اپنے بھائی، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھی بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص پر ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔" (37:80)

اسی مضمون کو قدرے دوسری طرح ارشاد فرمایا جارہا ہے۔ "قیامت کے دن تمہاری رشتہ داریاں تمہارے کسی کام نہیں آئیں گی اور نہ تمہاری اولاد ہی بلکہ اس دن تمہارے درمیان جدائی ڈال دی جائے گی وہی تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔" (60:3)

سب سے زیادہ توجہ طلب بات یہ ہے کہ انسان اپنے ہی جن اعضاء کو اپنی شان سمجھتا ہے، انہیں اپنا اور صرف اپنا کہتا ہے، وہ بھی اس کے نہیں ہوتے۔ وہ آنکھیں جو صرف اس کے چہرے پر اس کی ہیں، اس کے حسن میں اضافہ کرنے والی ہیں۔ اس کی مرضی سے چیزوں کو دیکھتی اور نظر انداز کرتی ہیں جن سے وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔

ان ہی سے دھوکہ دیتا ہے، ان ہی سے گناہ کرتا ہے اور ان کی شرارتوں کو راز رکھتا ہے۔ ایک دن اسے پتا چلتا ہے کہ وہ بھی اس کی نہیں بلکہ راز داری کے سب کاموں کو عیاں لیے دے رہی ہیں۔ ان پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

وہ مضبوط ہاتھ جو عمر بھر اس کی مرضی پر کام کرتے رہے اور وہ انہیں اپنا سمجھ کر ہر قسم کے کام کراتا رہا اور سمجھتا رہا کہ کوئی نہ جان پائے گا۔

نعت

چھا رہی ہے گھٹا مدینے کی
نہیں حسرت زیادہ جینے کی
زندگی چاہیے قرینے کی
زندگی اُس کی، موت اُس کی ہے
خاک ہو جائے جو مدینے کی
ہفتِ اقلیم سے ہے بیش بہا
خاک چٹکی سی اک مدینے کی
ہفت قلزم کے موتیوں سے گراں
بوند اک اک ترے پسینے کی
ساقیا چھوڑ ساغر و مینا
اب پلا دل کے آبگینے کی
مئے افرنگ میں وہ بات کہاں
لا مرے واسطے مدینے کی
سلسلہ ختم ہے نبوت کا
مُہر ہے ہاشمی نگینے کی

شاعر: مولانا شہید الاسلام المصری

وہی ہاتھ جنہیں وہ اپنی قوت سمجھتا اور استعمال کرتا رہا۔ ڈکیتیاں بھی ماریں، چوری بھی کیں، انسانی خون سے انہیں رنگتا اور چھپاتا رہا۔ جائز اور ناجائز ہر کام کی جانب بڑھاتا اور فیض اٹھاتا رہا جن مضبوط ہاتھوں سے محنت کم اور صلہ زیادہ وصول کرتا رہا جن کی طاقت سے طاقت ور بنا پھرتا رہا' وہی ہاتھ اسے مجرم ثابت کر دینے والے ہیں۔

وہی پاؤں جو اس کی منشا و مرضی پر سیکڑوں میل کے راستوں کو روندتے رہے، وہ انہیں لے کر کہاں کہاں گیا، کیوں کیوں گیا؟ وہ سمجھتا رہا' یہ سب کچھ پوشیدہ رہے گا' کوئی گناہوں کے ان راستوں کو جان نہ پائے گا کیونکہ وہ اپنے ہی قدموں سے تو گیا تھا۔ بھلا کون جان پائے گا؟ انہی قدموں سے چل کر اس نے کتنوں کو بے آبرو کیا۔

ان ہی قدموں سے چل کر کتنی سازشیں کیں، قوم و ملک کا کتنا نقصان کیا۔ اپنا سودا کیا اور دوسروں کو بھی بیچ دیا اور یقین کرتا رہا کہ یہ سب کچھ راز رہے گا۔ کوئی نہ جان پائے گا کہ اس نے کیا کیا ہے۔ وہ عمر بھر مطمئن رہا کہ وقت گزر جائے گا اور ان قدموں سے لیے جانے والے کاموں سے کوئی واقف نہ ہوگا۔

یہی دھوکہ زبان دے گی۔ تمام عمر اسی زبان سے اپنے جذبات کی ترجمانی کرتا رہا، جھوٹے سچے زمین و آسمان کے قلابے ملا کر دوسروں کو خوش کرتا رہا۔ اپنے لفظوں کی داد وصول کی۔ باطل کو حق ثابت کرتا رہا۔ کبھی اپنے فائدے کے لیے اور کبھی دوسروں کے نقصان کے لیے۔ کتنے جھوٹ بولے۔ کتنی ہی جھوٹی گواہیاں دیں۔ اس زبان سے کتنی ہی مرتبہ دل آزاریاں کیں، حق کو باطل ثابت کیا اور باطل کو حق۔ کتنوں کو جھوٹ بول کر پھنسوا دیا اور سمجھتا رہا کہ یہ زبان میری ہے۔ اس کا راز کون کھول سکتا ہے خود میرے علاوہ؟ لیکن یہی عضو اور یہی زبان اس کا راز کھول دینے والی ہے۔ ایک ایک خطا کی گواہی دینے والی ہے۔ شاید دوسرے تو معاف بھی کر دیں لیکن اپنے ہی اعضاء جرم کا راز کھولنے والے بن جائیں گے۔ اپنے ہی جسم کی کھال جو ہر لحہ جسم کے ساتھ چمٹی رہتی ہے' وہی سب سے بڑی گواہی دے گی۔

ارشاد ہوتا ہے۔ ''وہ (گناہ گار) اس دن کو بھول نہ جائیں جب ان کی اپنی ہی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ انہیں وہ بدلہ ضرور دے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔'' (24:25)

تو یہ ہے میری چیز، میرا مال، میری اولاد اور میری طاقت۔ میری حکومت، میرا راج اور میری ملکیت سب کا یہ انجام ہے۔

مالک حقیقی کے سامنے جا کر ہر شے اصل مالک کے حکم پر چلے گی۔ ہر شے گواہی دے گی کہ یہ بے ننگ و نام ہے اور انسان یہ سوچے گا کہ کیا یہ سب کچھ میرا تھا؟

ہر نیا حاکم پرانے کا وارث بنتا اور خود کو مالک سمجھتا رہا اور دوسرے وارث کو دے کر رخصت ہوتا رہا۔ ہر بیٹا اپنے باپ کا وارث بنتا رہا اور اسے اپنی ملکیت سمجھ کر عیش کرتا رہا مگر کوئی بھی نہ جان سکا کہ جسم و روح، جسم کا ہر عضو، سوچ فکر و دانش۔ دولت و ثروت، حکومت و سلطنت۔ ان سب کا اصل مالک کون ہے۔

ارشادِ ربانی ہے۔ ''ہم ہی زمین کے اور اس پر رہنے والوں کے وارث رہ جائیں گے اور وہ سب ہماری ہی طرف لوٹ کر آئیں گے۔'' (19:40)

☆☆......☆☆

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

خط بھجوانے کے لیے پتا: ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ۔ 88-C II۔ خیابان جامی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بہت پیارے دوستو!

آپ سب کو لندن سے رضوانہ کا سلام قبول ہو۔ اس جدید ٹیکنالوجی کی بدولت ہم اتنی دور ہوتے ہوئے بھی دوشیزہ کے ساتھ رہے۔ آپ لوگوں نے ہمیں پیارے پیارے خطوط لکھے اور مسلسل رابطے میں رہے۔ کہ ہمیں دوری کا احساس نہیں ہونے دیا۔ دوستو! پہلے تو آپ سب کا بہت شکریہ کہ آپ لوگوں نے ہمارے عید نمبر کو اتنا پسند کیا اور ہماری محنت کو رائیگاں نہیں ہونے دیا۔ آج یہاں موسم بہت حسین ہو رہا ہے۔ کالی کالی گھٹائیں ہر سو چھائی ہوئی ہیں۔ تیز بارش ہو رہی ہے لیکن بجلی جانے کا ذرا سا بھی ڈر نہیں۔ سڑکوں پر پانی بھی نہیں جمع ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہاں پر ہم کار میں یا شاپنگ کرتے ہوئے یا پیدل چلتے ہوئے مزے سے موبائل پر باتیں کرتے ہیں۔ کوئی ڈر ہی نہیں ہوتا کہ کوئی موٹر سائیکل رُکے گی اور...... اس کے علاوہ نہ ہی یہاں کوئی نامعلوم افراد فائرنگ کرکے بے قصور لوگوں کو مار کر فرار ہوتے ہیں۔ یہاں پر قانون کی بے حد اہمیت ہے۔ انسانی جان کی بہت اہمیت ہے اور قانون امیر غریب سب کے لیے برابر ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اسلام کی بہت سی باتیں ان لوگوں نے چرا کر اپنالی ہیں۔ بہرحال اس وقت ہم بہت محبت اور خلوص سے جگمگاتی ہوئی اُس محفل میں چلتے ہیں جو لندن میں سجائی گئی ہے۔

افشاں رضا اسلام آباد سے اپنی خوشی کا اظہار کر رہی ہیں۔ ڈیئر رضوانہ باجی۔ عید نمبر پا کر جیسے عید سے

پہلے ہماری عید ہوگئی۔ ہر صفحے پر جیسے عید ہی عید بکھری نظر آرہی تھی۔ میری طرف سے اتنا خوبصورت عید نمبر نکالنے پر ڈھیر ساری مبارک بادیں۔ سارے رائیٹرز نے عید کے حوالے سے کمال لکھا آپ سمیت ...... جسے پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ آخر میں ایک بار پھر اتنا بھرپور اور خوبصورت عید نمبر نکالنے پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ اور بلاشبہ یہ بات میں کہہ سکتی ہوں کہ اس بار کا عید نمبر تمام عید نمبرز پر بازی لے گیا۔

☆ افشاں! تم نے تو بڑا زبردست خط لکھا ہے۔ ہم تمہاری طرف سے مٹھائی خرید کر کھا لیتے ہیں۔

سیالکوٹ سے ماہین محفل میں شریک ہیں، لکھتی ہیں آپ نے میرا خط شائع کر کے جس محبت کا ثبوت دیا وہ میرے لیے عید جیسی ہی تھی۔ میں نے اپنا خط سب اپنوں کو دکھایا۔ میری تو جیسے عید ہی ہوگئی تھی۔ یہ آپ کی محبت کا ثبوت ہے کہ میں آپ کے ساتھ اس بار بھی خط کی صورت میں موجود ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے جیسے مجھے کوئی ایسا اپنا مل گیا ہے جس سے میں اپنی ہر بات شیئر کرسکتی ہوں۔ عید نمبر ہمیشہ سے زیادہ دلچسپ اور زبردست رہا۔ رضوانہ باجی عید نمبر کی بہترین تحاریر کے لیے تمام رائٹرز مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میری عید امی کے بغیر ہر بار کی طرح اداس ہی گزری۔ ہم دونوں بہنوں کو ابو نے ہزار ہزار روپے عیدی بھی دی اور پھر شام کو فوزیہ خالہ کے گھر دعوت تھی۔ بس یہی عید تھی۔ رضوانہ باجی پھر ایک بار شاندار عید نمبر کی مبارکباد قبول فرمائیں۔

☆ تم جب بھی کراچی آنا ہم سے ملنا اور اپنی باتیں ہم سے شیئر کرنا۔ پیاری لڑکی ہم سب تمہارے اپنے ہی تو ہیں۔

ریحانہ مجاہد کراچی سے اپنے مختصر ترین تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ ڈیئر رضوانہ اتنا بھرپور عید نمبر اس سے پہلے کبھی نہیں پڑھا۔ یہ آپ سب کی بہترین کاوش تھی۔ ہر افسانہ عید نمبر کی مناسبت سے نگینے کی طرح جڑا تھا۔ آپ کی فین ہونے کے ناتے آپ کا افسانہ میرے دل کو چھو گیا۔

☆ پیاری ریحانہ! آپ کی حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ آپ لوگوں کی رائے ہمارے لیے مشعلِ راہ کا کام کرتی ہے۔ اپنی قیمتی آراء سے نوازتی رہیے گا۔

ایک طویل ترین غیر حاضری کے بعد جیکب آباد سے ہماری پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل محفل میں قدم رنجہ ہیں، لکھتی ہیں۔

اُس کا انداز جون کی مانند
میرے لہجے میں جنوری ہے ابھی

آج قریب قریب ایک سال بعد دوشیزہ کے لیے خط لکھ رہی ہوں۔ گزشتہ سال بے حد مصروف رہی۔ نو تعمیر شدہ گھر میں منتقلی۔ پھر بیٹے کی شادی کا ہنگام۔ انجام کار کہ ہم بہت مصروف رہے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ اُس طرف سے تو کسی نے پلٹ کر بھی نہیں پوچھا۔ اب آپ کہیں گی کہ آخر یہ خط کس سلسلے میں ہے۔ سو ڈیئر اُس دن تم نے مجھے فیس بک پر کمنٹس دیے بس اس سے دل خوش ہوگیا۔ پھر نزہت جبیں ضیاء اور نگہت غفار سے رابطے ہوئے۔ نسیم نیازی اور رضوانہ کوثر ان سب نے بھی میری اچھی خاصی کلاس لی (حالانکہ ہم خود کالج میں کلاس لیا کرتے ہیں) کہ سب کے بیٹے، بہنوں اور بھائیوں کی شادی کے احوال پڑھ لیے ایک تو

تبدیلی ایجنٹ

عوام اور مشتہرین کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ ادارہ پرل پبلی کیشنز نے الفتح نیوز ایجنسی، مہران مرکز، سکھر کو تبدیل کر کے داؤد بک اسٹال، دکان نمبر 7۔ مہران مرکز سکھر، کو ایجنٹ مقرر کر دیا ہے۔ تمام ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

تمہارا اکلوتا بیٹا اور اتنی کم عمری میں (23 سال) اس کی شادی کروادی۔ (بھئی ہماری شادی بھی کم عمری میں ہوئی تو ہم نے اس کا بدلہ اپنے بیٹے سے لے لیا جو کہ ماشاء اللہ ہمارا بیٹا کم اور 'بھائی' زیادہ لگتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ خالی ہاتھ نہیں آئی احوال کے ساتھ حاضر ہوں) دوشیزہ ہر ماہ باقاعدگی سے مل رہا ہے اکثر و بیشتر دن مصروفیت اور کاہلی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ بہر حال جب میرے پیارے بھائی اور بیٹے جیسے کاشی چوہان کا فون آیا تو میں خفگی، خفت، اور مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر آپ کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ خط سے یاد آیا کہ کبھی دوشیزہ اور سچی کہانیوں میں ہمیں، ہماری تحاریر کی وجہ سے کم اور خطوط کی وجہ سے زیادہ مانا اور جانا جاتا تھا۔ اب کہاں کے خط...... کیا اشعار ہوتے تھے خطوں کی پیشانیوں پر۔

کیا کیا فریب دل کو دیے اپنے اضطراب میں
اپنی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

اب آیئے تبصرے کی جانب ٹائٹل حسب توقع تھا اور یہ بہت اچھا لگا۔ اسی طرح محفل میں کچھ نئے اور پرانے دوستوں کے خط اچھے لگے۔ اس بار سب سے بہترین افسانہ نزہت جبیں ضیاء کا تھا۔ ایک نئے عنوان پر۔ 'واقعی ایسا ہوتا ہے' میرے مشاہدے میں بھی یہ بات ہے اس لیے برحق ہے...... مرد کیسا ہو، کوئی بھی رشتہ ہو...... فاصلہ ضروری ہے۔ نزہت جی بہت مبارک ہو، منہاج کی شادی کے بعد اور افسانے کی بھی۔ عقیلہ حق کا افسانہ بھی اچھا لگا۔ رفعت سراج کا ناول دام دل بھی خوبصورت موڑ پر ہے۔ بہت خوب زمر نعیم بھی پورے نمبر لے گئیں۔ فوزیہ احسان رانا، یار اس کے بعد تم نے رابطہ ہی نہیں کیا۔

غم بانٹنے کی چیز نہیں پھر بھی دوستو
اِک دوسرے کے حال سے واقف رہا کرو

بینا عالیہ کا ناول تیرے عشق نچایا نے واقعی دماغ نچادیا ہے۔ بہر حال اچھی کاوش ہے۔ دوشیزہ کے تمام رنگ ہی ہم آہنگ و ہم رنگ اور سب رنگ تھے۔ کاشی چوہان اور آپ کی محنتیں بار آور ہو رہی ہیں۔ اس بار رمضان کی وجہ سے خط پھیکا سا لگے گا۔ مگر یہ وعدہ ہے کہ اگلے ماہ ہم پرانی جون میں لوٹ آئیں گے۔ صد شکر کہ جون گزر گیا اور جولائی بھی اختتام پذیر ہونے کو ہی ہے اور ایک شعر سنیے اور اجازت دیجیے۔

خوش بخت ہوں جون جولائی کی دھوپ میں
اے نخل آرزو میں تیری چھاؤں میں رہا

☆ صفیہ کیا لکھوں تمہاری آمد پر۔ بس اتنا کافی ہے ہے کہ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ اب غیر حاضر نہ ہونا۔

کراچی سے روبینہ شاہین لکھتی ہیں بہت ساری دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ حاضر ہوں۔ دوشیزہ کا یہ شمارہ خاص عید نمبر تھا۔ اس لیے ہاتھوں میں لیتے ہی دلچسپی بڑھ گئی۔ دوشیزہ کا عید نمبر بے حد

خوبصورت ٹائٹل سے آراستہ تھا۔ اس کو دیکھتے ہی عید کی خوشیوں کا احساس دل کو چھو گیا۔ ابتدائیہ ہمیشہ کی طرح منفرد اور اثر انگیز رہا۔ زادِ راہ میں نور اور ہدایت کی کرنیں جگمگا رہی تھیں محفل میں مصنفین اور قارئین کی اپنائیتیں اور محبتیں تھیں۔ اب افسانوں کی بات کرتے ہیں۔ پھول جیسے رشتے، رشتوں کے خلوص کی کہانی ہے۔ جہاں خلوص ہوتا ہے وہاں اسی پیار سے رشتے نبھائے جاتے ہیں، اس رمضان میں دلچسپ افسانہ رہا۔ اللہ میاں جی ایک اصلاحی اور روحانی احساس والی تحریر ہے۔ ساجن سنگ عید رضوانہ پرنس کی عید رنگ تحریر ہے۔ ''پہلی چاندرات'' چاندرات جیسی ہی تحریر تھی۔ ان میں مجھے سب سے زیادہ خوبصورت افسانے جو لگے وہ ہیں عید کا چاند۔ اس میں نئے نئے ازدواجی رشتے کو جس طرح شکستگی اور بربادی سے بچا لیا گیا ہے۔ وہی اس کی خوبصورتی ہے اور دوسرا افسانہ ہے ابا، راحیل اور عید، اس میں ہنستے ہنساتے بہت سی تلخ سچائیاں بیان کی گئی ہیں، وہی اس کی خوبصورتی ہے۔ قصہ چاندرات ایک اصلاحی مضمون سا لگا لیکن مسکراہٹیں کہیں نہیں تھیں اور یہ ہوئی نا بات میں زین صاحب پلیز کچھ مسکراہٹیں اس صفحے پر بکھیریے منی اسکرین کا سلسلہ بھی اچھا ہے لیکن کسی ایک چینل کے پروگراموں پر تبصرہ اچھا نہیں لگتا۔ چلیے چینل کی اس دوڑ میں کم سے کم تین چار بڑے چینلز پر تو تبصرہ شامل کیجیے تاکہ پڑھنے میں بھی کچھ لطف آئے اور ان چینلز کو پرکھنے میں آسانی ہو۔ نئے لہجے نئی آوازیں کچھ خاص نہیں تھیں لیکن چونکہ عید کے حوالے سے تھیں تو پھر ٹھیک ہے۔ کچھ کچن کارنر کے حوالے سے بات کروں گی۔ یہ بھی اچھا سلسلہ ہے میں خود اس کی ریسپیز ٹرائی کرتی ہوں۔ نفسیاتی الجھنیں کا سلسلہ بھی بڑی عمدگی سے لوگوں کو ان کے مسائل کے حل پیش کر رہا ہے۔ خاص طور پر ایسے دور میں لوگوں پر اتنا دباؤ اور پریشر ہے کہ ان کو نفسیاتی مسائل آگھیریں۔ باتیں ملاقاتیں میں بھی بڑی خوبصورت باتیں رہیں بلال صاحب سے۔ مجموعی طور پر اس عید نمبر کو ایک عمدہ ترین کاوش کہا جا سکتا ہے۔ جس کے لیے کیپٹن آف دی شپ یعنی ایڈیٹر اور دوشیزہ کا تمام اسٹاف مبارک باد کا مستحق ہے۔ ایک مرتبہ پھر تمام قارئین اور دوشیزہ مصنفین اور دوشیزہ ایڈیٹرز کو بہت بہت عید مبارک۔

☆ پیاری روبینہ! کہاں غائب ہیں آپ آج کل۔ تبصرہ اب ریگولر آنا چاہیے۔

کراچی سے خولہ عرفان گلے شکوے کرتی ہماری محفل میں شامل ہیں لکھتی ہیں۔ جون کا شمارہ ہاتھ میں موجود ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی رضوانہ وہ یہ کہ دوشیزہ کا شمارہ آخر آدھا مہینہ گزارنے کے بعد ہی اپنا دیدار کیوں نصیب کرتا ہے؟ یقین کریں سارے افسانے بجلی نہ ہونے کے باوجود اتنی برق رفتاری سے پڑھنے پڑتے ہیں جیسے کل ان کا پیپر دینا ہے کیونکہ ان پر تبصرہ لکھنے کے لیے بہت قلیل وقت ہوتا ہے اور آج کل محکمہ ڈاک کی مجھ سے ویسے ہی کوئی دشمنی چل کہ میرے خطوط ہضم کر جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے۔ جتنا مطالعہ کر لیا اس کا تبصرہ نظرِ محفل ہے۔ کاشی چوہان صاحب کا اداریہ اُمید زندگی ہے۔ پھر سے لکھنے کی امنگ جگا گیا ورنہ تو قلم اور میری ناراضگی چل رہی تھی۔ زادِ راہ میں منورہ نوری خلیق نے آنکھیں کھول دیں۔ اور ایک بات اور کہ رضوانہ جی میرا قلمی نام خولہ ہے وہ اس لیے کہ میری والدہ مرحومہ نے میرا یہی نام رکھا تھا۔ اور اسی نام سے پکارتی تھیں، باقی دنیا کے لیے میں فائزہ عرفان ہوں۔ یمنیٰ زیدی کا انٹرویو، منی اسکرین، اسماء اعوان کا لائف بوائے اور شادی میرے بیٹے کی نزہت جبیں ضیاء صاحبہ سب بہت بہت

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کرجاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

خوبصورت انداز بیاں کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں۔ ناول ابھی نہیں پڑھے ہیں لیکن امید ہے کہ مزید نکھار اور دلچسپی میں اضافہ کر رہے ہوں گے، وہ بھی زیرِ مطالعہ جلد آجائیں گے۔ شمیم فضل خالق کا ناولٹ مقدر کی سکند کا موضوع پرانا تھا اور اختتام بھی واجبی تھا مگر قلم پر عبور تھا۔ سویرا فلک نے افسانہ پچھتاوا میں شک کو موضوع بنایا ہے۔ تمثیلہ زاہد صاحبہ نے راہیں محبت کی میں احساسات کی بہت اچھی عکاسی کی ہے۔ البتہ ثمینہ طاہر بٹ کا ناولٹ مرے نصیب کی بارشیں ذرا ہٹ کر تھا۔ اسلوب نگارش پر اچھی گرفت تھی۔ بشریٰ سعید احمد کا بند دروازے حقیقت پسندی پر مبنی اچھی تحریر تھی۔ صدفِ آصف کا ناولٹ جس بھی زورِ قلم دکھا گیا۔ قسط وار ناولٹ لمحوں نے خطا کی تھی آخر تک اپنے اندر تسلسل اور تجسس قائم رکھتا ہے۔ فوزیہ احسان رانا کی بہت اچھی تحریر ہے۔ خالدہ حسین کا انتخاب خاص اور شوکت تھانوی کے میٹھے چاول ان کے لیے بڑے بڑے قلم خاموش ہو جاتے ہیں۔ ہم کیا چیز ہیں۔ دوشیزہ گلستان میں فرمودات، نظموں اور فکاہیہ و معلوماتی موضوعات کا خوب انتخاب تھا۔ نئے لہجے نئی آوازیں اپنا جلترنگ سناتے رہے۔ اور یوں یہ تبصرہ مختصراً اختتام کو پہنچا۔ دوشیزہ کی ترقی اور کاشی صاحب اور آپ کی کامیابیوں کی خواہاں!!

☆ پیاری خولہ! سلامت رہیے لیجیے اپنے افسانے کا مزہ لیجیے! امید ہے محبتیں یوں ہی برقرار اور ہاں ہماری محبت آپ کے Late خط کی اشاعت سے ملاحظہ کر لیجیے۔

لاہور سے فریدہ فری محفل میں موجود ہیں لکھتی ہیں جولائی کا دوشیزہ ملا مگر یہ کیا...... نہ ہی میرا لیٹر اور نہ ہی نظم لگی تھی۔ پتا نہیں جس لڑکے سے میں پوسٹ کرواتی ہوں، اس نے پوسٹ ہی نہیں کیا اور مجھے یاد نہیں کہ اس نے رجسٹری کروا بھی دیا تھا یا نہیں۔ اتنی بیماری کے بعد بھی اتنا اچھا لیٹر لکھا تھا۔ چلو اب میں خود پوسٹ کروں گی۔ ٹائٹل گرل کی چوڑیاں بے حد خوبصورت لگیں۔ عید مبارک کاشی چوہان نے بہت اچھا لکھا۔ سب سے پہلے فصیحہ آصف نے مجھے فون کیا کہ فری کیا دوشیزہ مل گیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ میرا لیٹر لگا ہے تو انہوں نے کہا آپ کا تو کچھ بھی نہیں لگا۔ میں تو دل تھام کر رہ گئی کیونکہ پورے ایک ماہ کے بعد تو دوشیزہ کا دیدار ہوتا ہے۔ اور ہمارا حال بھی بہن خولہ جی کی طرح ہوتا ہے۔ پلیز ہماری تحریریں ضرور لگائیے گا کہ دوشیزہ بن ہم ادھورے ہیں۔ نبیلہ نازش راؤ کا افسانہ عید کا چاند دریچے میں۔ پھول جیسے رشتے غزالہ عزیز کا افسانہ رُخ چوہدری کا ابار احیل اور عید۔ اور غزالہ فرخ کا اللہ میاں جی بہترین لگے۔ فصیحہ آصف کا ناولٹ چاند عید اور ہم نے تو کمال بلکہ دھمال کر دیا مبارک ہو۔ فصیحہ جی اتنا اچھا افسانہ لکھنے پر۔ عقیلہ حق تو لکھتی ہی اتنا اچھا ہیں کہ پڑھ کر مزہ آجاتا ہے۔ حیا بخاری کا پہلی پہلی چاند رات۔ نزہت جبیں کا عید سرپرائز بھی خوب تھا۔ نزہت کے بیٹے کی شادی مبارک ہو۔ فوزیہ احسان رانا کا ناولٹ لمحوں نے خطا کی تھی بھی بے حد اچھا جا رہا ہے۔ خوش رہو فوزیہ جی۔ فوزیہ جی ہمیں آپ کا ناول چاہیے۔ مگر شاید آپ ہم سے ناراض ہیں پلیز ناراضگی چھوڑ دیں ہمیں آپ سے بے حد پیار ہے۔ ہم بے حد بیمار ہیں اور اگلے دو ماہ کے لیے کوہِ مری جا رہے ہیں۔ زمر نعیم، فصیحہ آصف خان، فوزیہ احسان رانا، اور سب رائٹرز اور قارئین کی خدمت میں سلام اور دعا۔

☆ لیجیے فریدہ جی! اب خوش ہو جائیں آپ کا لیٹر اور شاعری دونوں شاملِ اشاعت ہیں۔

کراچی سے عافیہ رحمت کی احوال میں پہلی بار آمد ہے لکھتی ہیں۔ زندگی اتنی برق رفتاری سے گزرے گی

کبھی ہم نے سوچا نہ تھا۔ ہمارا آپ کا ساتھ نو سال پرانا ہو چکا ہے۔ اس دوران فون پر رابطہ ہوتا ہی رہا۔ اب آپ نے ہمارے افسانے کو شائع کیا تو دل بہت خوش ہو گیا اس بات پر کہ آپ لوگوں نے ابھی تک ہمیں یاد رکھا ہوا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ اب آتے ہیں افسانہ نمبر کی طرف۔ اتنے سارے نئے ناموں سے سجا افسانہ نمبر کافی صحت مند اور دلچسپ نظر آ رہا ہے۔ بارہ یعنی پورے ایک درجن افسانے شامل ہیں۔ جن میں سے نو تو نو آموز لکھاریوں کے معلوم دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تمام لکھنے والوں کی گرفت قلم پر، موضوع اور اظہار خیال میں مضبوط ہے۔ الماس روحی میری استانی ہیں۔ افسانے کی شکل میں ان کا سامنا ہوا، اچھا لگا۔ کاشی بھائی! آپ کے افسانے پر تبصرہ اُدھار رہا چند ایک کے سوا تمام افسانے مختلف موضوعات پر تھے۔ عام طور پر تمام افسانے عشق و محبت سے سجے ہوئے تھے مگر یہاں (آمز) میں ماں کی محبت ہے تو ''بہار آئے گی'' میں اللہ کی محبت۔ چمکیلا بکل میں کپڑوں آرائش کی محبت ہے۔ تو آگ کی کہانی بھی انوکھی محبت ہی کی داستان ہے۔ مسلسل سلسلے بھی تمام ہی اپنی آب وتاب سے جلوہ افروز ہیں۔ قارئین کی محفل میں یہ ہماری پہلی دستک ہے۔ اُمید ہے شاملِ اشاعت کریں گی۔ زرافشاں میری بے حد عزیز سہیلی ہیں۔ ان کی خدمت میں بھی سلام۔

☆ اچھی عافیہ! چلیے آپ کو بھی ہمارے اس محبتوں بھرے طلسم کدے نے اپنی جانب کھینچ ہی لیا۔ منفرد تبصرہ پسند آیا۔ افسانہ نمبر کی پسندیدگی کا شکریہ۔

منعم اصغر ڈیرہ غازی خان سے پہلی بار احوال میں موجود ہیں لکھتے ہیں۔ دوشیزہ کی محفل میں پہلی بار آیا ہوں کیونکہ ہمارے شہر میں سچی کہانیاں تو آتا ہے مگر دوشیزہ نہیں آتا۔ اس بار صد شکر کہ 15 جون کو ہی سہی مگر آ ہی گیا۔ رسالہ لیٹ ملا اس لیے لیٹر نہیں بھیجا کہ شائع ہونے سے رہ نہ جائے۔ خیریت سے پہلے دوشیزہ کی محفل میں قدم رکھا۔ ارے یہاں تو رضوانہ پرنس جی براجمان ہیں۔ خوشگوار حیرت ہوئی۔ رضوانہ آپی کیسی ہیں؟ دوشیزہ کی محفل میں طویل تبصرے مزہ دے گئے۔ غزالہ عزیز، شائستہ عزیز، انزا نقوی، فصیحہ آصف، ثمینہ عرفان، عادل حسین، رضوانہ کوثر، شاہانہ احمد خان، فرح عالم، حنیفہ بیگم کے طویل تبصرے شاندار تھے۔ بہت مزہ آیا۔ ناولٹ میں مقدر کی سکندر اچھا ناولٹ تھا۔ راہیں محبت کی اور اچھا لگا۔ مرے نصیب کی بارشیں ٹھیک تھا۔ البتہ حبس بہت اچھا لگا خاص کر آئمہ اور ازل کی ملاقات پر بہت ہنسی آئی۔ لمحوں نے خطا کی بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ افسانے تینوں زبردست تھے۔ خاص طور پر پچھتاوا اور سالگرہ بہت پسند آئے۔ سلسلے وار ناولز ''دام دل'' سب سے پہلے پڑھا۔ رفعت سراج میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ کمال کر دیا۔ ندا آخر ایسی کیوں ہے۔ بہت ہنسی آئی اس کی باتوں پر۔ اُم مریم کا اپنا انداز ہے۔ بہت منفرد لکھا ہے۔ خیر باقی پورا رسالہ شاندار تھا۔

☆ پیارے منعم! خوش آمدید! تحریر پڑھ کر رائے دیں گے۔ فی الحال آپ کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ آپ دوشیزہ کے سالانہ خریدار بن جائیں۔ پرچہ آپ کو وقت پر ملتا رہے گا۔

پشاور سے ہماری بہت عزیز ترین تجسیم فضل خالق کی محفل میں آمد ہے لکھتی ہیں اس بار عید گاؤں میں گزری اس لیے بروقت تمہیں عید کی مبارک باد نہ دے سکے۔ سو باسی عید کی مبارک باد دے دی۔ تم نے بر

وقت یاد رکھا۔ بہت شکریہ! ہمیشہ کی طرح ادارہ یہ زبردست تھا...... کاش...... ہر دل میں گمشدہ محبت واپس پلٹ آئے اور زندگی خوبصورت بن جائے۔...... تم نے محفل کو کیوں خیر آباد کہہ دیا کاشی۔ عید کی مصروفیات اتنی تھی کہ دوشیزہ سارا نہ پڑھ سکی۔ ایک دلچسپ بات سنو! روزوں میں میرا دماغ بہت کام کرنے لگتا ہے۔ اس بار تو 5-4 افسانے لکھ ڈالے۔ اب یہ نہ کہنا کہ صرف افسانے ہی لکھتی رہیں، نہیں عبادتیں بھی کی ہیں...... ذکر اذکار بھی...... ترجمے کے ساتھ قرآن پاک بھی ختم کیا۔ لیکن ذرا فارغ وقت ملا تو فوراً کاغذ قلم سنبھال لیا۔ احسان ہے خدا کا۔ ہاں میرا کچن کا کام نہیں ہوتا۔ سحری افطاری تیار مل جاتی ہے۔ اس لیے تو فارغ وقت زیادہ ہوتا ہے۔

☆ اچھی شمیم! خط کیا تھا لگا جیسے ہمارے سامنے ہو اور مزے سے باتیں ہو رہی ہیں۔ خوش رہو۔ اور کبھی کبھی ایسی خوشی سے ہمکنار کرتی رہا کرو۔

ملتان سے ہماری بہت پیاری ساتھی فصیحہ آصف خان نے ہمیں یاد کیا ہے۔ لکھتی ہیں امید ہے مزاج اچھے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل کرم ہے۔ اللہ پاک ہمارے پاکستان پر رحمت کی بارشیں برسائے آمین۔ مختصر سا افسانہ جلد ہی دوشیزہ میں جگہ پا گیا۔ باقی سب خیریت ہے مصروفیت الگ مگر دوشیزہ کا ساتھ تو ہم چھوڑ نہیں سکتے۔ اللہ پاک آپ کو آپ کے مقاصد میں کامیاب کرے۔ آمین، رضوانہ شہزادی کو میرا اسلام اجازت درکار ہے۔

☆ پیاری فصیحہ آصف! افسانہ مل گیا ہے اور آپ کا پیغام بھی متعلقہ شعبے تک پہنچا دیا گیا ہے۔ تبصرہ کہاں گیا لڑکی!

کراچی سے فرح انیس شامل احوال ہیں لکھتی ہیں دوشیزہ میں دوسری بار خط لکھ رہی ہوں اس اُمید کے ساتھ کہ سچی کہانیاں کے ساتھ ساتھ یہاں بھی میری حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ دوشیزہ ہماری طرف ہمیشہ لیٹ ملتا ہے۔ اس لیے کبھی تبصرہ نہیں کر پائی۔ رفعت سراج کا ناول ''دام دل'' حقیقت کی عکاسی کرتا ہوا شاندار ناول ہے۔ اُم مریم اور بینا عالیہ کا ناول نہایت دلچسپ اور شاندار ہیں۔ نئے لہجے نئی آوازیں میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ دوشیزہ میں، میں نے اپنی دو تحریریں بھیجی تھیں ان کا کیا ہوا۔ پلیز مجھے بتایئے گا ضرور۔ اپنی ایک نظم بھیج رہی ہوں میرا یہ خط اگست کے شمارے میں لگایئے گا ضرور۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔

☆ پیاری فرح! خوش رہو تحریریں پڑھ کر رائے دیں گے۔ تھوڑا سا انتظار پلیز......

کراچی سے یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری قاری اور شاعرہ ثمینہ عرفان کی لکھتی ہیں۔ کل رات کی بارش کے بعد موسم نے تھوڑی سی انگڑائی لی، تو طبیعت میں کچھ بشاشت آئی۔ اور رمضان کی نعمتیں اور رحمتیں سمیٹنے کے بعد عید جیسی میٹھی خوشی ہم سب امت مسلمہ کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک بہترین تحفہ ہے۔ میری طرف سے آپ لوگوں کو عید الفطر کی دلی مبارک باد، عید کی مبارک باد دینے میں، ہم سے تھوڑی دیر ہوگئی۔ لیکن شوال کے مہینے میں اور آج شوال کی پانچ تاریخ ہے میری کوشش ہوگی کہ خط آج ہی T.C.S کروادوں تاکہ اسی ہفتے خط بلکہ کل ہی آپ کو مل جائے۔ اس خط میں جولائی کے شمارے کی تحریروں کے لیے تبصرہ نہیں ہے کیونکہ

جولائی کا شمارہ رمضان اور آخری طاق راتوں کی مصروفیات کی وجہ سے بالکل پڑھنا نہیں ہوا ہے۔ ابھی خط لکھنے بیٹھی تو دوشیزہ ڈائجسٹ نکالا تو کاشی کی تحریر محبت سے عید مبارک پڑھی۔ لفظوں کو افسانوی رنگ دے کر موتیوں کی جو مالا کاشی نے بنی ایک لمحے کو اس کے لفظوں نے دل کو چھوا لیکن کاشی کا یہ کہنا کہ یہ لفظ کسی مردہ زبان میں لکھا گیا ہے۔ جواب شاید کرہ ارض پر موجود ہی نہیں، اب تو محبت کی بولی سمجھی نہیں جاتی۔ کاشی اگر محبت کرہ ارض پر موجود نہیں ہوتی اور محبت کی بولی سمجھی نہیں جاتی تو ڈیئر کاشی تم کو دوشیزہ کی محفل چھوڑے ہوئے کئی مہینے ہو چکے ہیں لیکن آج بھی تم کو یاد کیا جاتا ہے۔ تمہاری بات کی جاتی ہے۔ میرے کیا سب کے خطوں کے عزت سے دیے گئے محبت سے بھرے پر لطف جوابات آج بھی ہماری سماعتوں میں محفوظ ہیں تو کاشی محبت کہیں کھوئی نہیں اور نہ ہی یہ لفظ مردہ ہوا ہے۔ میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے آپ نہیں تم کہہ کر یہ سب تمہاری اور دوشیزہ کے تمام اسٹاف کی محبت کے جواب میں میری بے لوث محبت ہے بلکہ تمام لکھنے والوں کی تحریر کے جواب میں پڑھنے والوں کی محبت ہے۔ جو اپنی دوشیزہ کی محفل میں آمد اور اپنی تحریروں سے لکھنے والوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ ایک خراج تحسین میری طرف سے۔ شگفتہ شفیق کو اور یاسمین صاحبہ کا میری نظم پسند کرنے کا بہت شکریہ۔

☆ عزیز ثمینہ جی! ادارئیے میں یہ لکھا تھا کہ اگر ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا؟؟ محبت کا لفظ مردہ ہو ہی نہیں سکتا۔ خوش رہیے اور اگلا تبصرہ مکمل پرچے پر کرنا ہے آپ نے۔

دبئی سے تسنیم منیر علوی اپنی محبتوں کے ساتھ محفل میں حاضر ہیں لکھتی ہیں۔ ہمیں ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ نامعلوم افراد کی طرح ہمارا داخلہ بھی دوشیزہ میں ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ ایک سال سے نہ کوئی مراسلہ شائع ہو رہا ہے اور نہ ہی کہانی...... جبکہ ہم نے عید کے حوالے سے بھی ایک تحریر تیار کی تھی۔ مگر اپنی پہلے ارسال کی ہوئی تحریروں پر رونا آیا۔ جانے کیوں روک دی گئیں۔ آخر کیوں؟ پھر سالانہ خریدار بن کر ہم سے ایسی ہمالیاتی خطا سرزد ہوئی کہ اللہ کی پناہ۔ نہ صنم ملا نہ وصال صنم۔ مارچ کے بعد یعنی سالانہ خریدار بننے کے بعد سے آج تک یہاں تک دبئی ایک رسالہ بھی نہیں پہنچا۔ جون کے پرچے ہم نے اپنی بہن کے ذریعے منگوا لیے اب پھر محو انتظار ہیں۔ جولائی تو مانو گزر ہی گیا۔ اگست آیا چاہتا ہے۔ ہنوز خاموشی ہے۔ جانے یہ کیا راز ہے۔ رضوانہ پلیز ہماری مدد کرو۔ چلیے اب جون کے پرچے کی طرف چلتے ہیں۔ جون کے پرچے میں اسماء اعوان صاحبہ لائف بوائے کی نمائندگی کرتی نظر آئیں۔ اور ان کی اشتہاری مہین کا حصہ قرار پائیں۔ ذُمر نعیم کی 'سال گرہ' آرمی پبلک اسکول کے حوالے سے ایک انتہائی پر اثر تحریر تھی۔ پہلے بھی اس سانحے پر آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی اور اب بھی اس تحریر نے رُلا دیا۔ 'پچھتاوا' سویرا فلک کا ایک اچھا افسانہ ہے۔ ذرا سے شک نے کہانی کا افسانہ کر دیا۔ بشریٰ سعید احمد کی کہانی یوں تو ایک عام سی کہانی تھی۔ مگر انداز تحریر نے اس کو بہت خاص بنا دیا۔ شاید کوتاہی دونوں طرف سے ہوئی تھی۔ 'زنجیر اور تالا' انتخاب خاص واقعی خاص تھا۔ خالدہ حسین ادب کی دنیا کا ایک اہم نام تو افسانہ بھی اہم ٹھہرا۔ ثمینہ طاہر بٹ 'میرے نصیب کی بارشیں' لے کر حاضر ہوئیں۔ یہ ایک ڈرامائی سچویشن سے لبریز کہانی تھی۔ جس میں بھرپور تھرل تھا۔ مکالموں نے خوب اپنا رنگ جمایا۔ ناولٹ کا ابتدائیہ بہت خوب اٹھا تھا۔ مگر آخر میں آ کر لیکچر کا

ایم اے راحت کے قلم سے تخلیق پانے والا ایک لافانی سلسلہ
ہم شکل
ایک نوجوان کی سرگزشت، جسے بچپن کی ایک بات یاد تھی،
جب اُس کی دادی اماں نے کہا تھا۔
''اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر انسان کے سات ہم شکل بنائے ہیں......''
کیا یہ روایت دُرست ہے؟
اسی روایت کی کھوج میں موت سے پنجہ کش اُس سرکش نوجوان کی
ناقابلِ فراموش داستان......
کیا اُسے ساتوں ہم شکل ملے؟
کیا اُس نے موت سے جنگ کی؟
ایک انوکھی داستان...... جو ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں دھوم مچا رہی ہے
آپ بھی پڑھنا مت بھولیے اور ناول ہم شکل کا حصہ بن جائیے

زیادہ گمان ہوا۔ لیکن بہر حال ایک اچھا ناولٹ کہا جا سکتا ہے۔ تمثیلہ زاہد کی 'راہیں محبت کی' نانی کے گھر پلنے والی ایک دوشیزہ کی کہانی...... والدین کی جدائی نے بچی کو حساس بنا دیا تھا، جب ہی تو اس نے ماں کے بتائے رشتے سے انکار کر کے اپنی راہیں الگ کر لیں۔ شمیم فضل خالق کی 'مقدر کی سکندر' ایک سلجھی ہوئی کہانی تھی۔ جو گھر آئے رشتے پر دوست کا قبضہ ہوا مگر قسمت مینا پر مہربان رہی۔ ویل ڈن! خوب، کہانی کی بنت عمدہ اور منفرد تھی۔ پڑھنے میں لطف آیا۔ تبصرہ تاخیر سے سہی مگر اس کو لگا دیں کیونکہ دور پردیس رہنے والے اتنی جلدی نہیں کر سکتے کہ آپ کے پاس پہنچ جائیں۔ اس کے لیے طاقت پرواز چاہیے۔ سلسلے وار ناولز بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ خاتمے پر انشاء اللہ تبصرہ بھی ہوگا۔ اب اجازت دیجیے۔

☆ اچھی تسنیم! لو تمہارا افسانہ تو اسی ماہ شائع ہو رہا ہے۔ رہیں دیگر شکایات تو وہ بھی جلد دور ہو جائیں گی۔ بس اب مسکرا دو۔

بھکر سے محسن علی شامی پہلی بار محفل میں اپنی خوبصورت تحریر کے ساتھ موجود ہیں لکھتے ہیں۔ میری طرف سے دوشیزہ ڈائجسٹ کی پوری ٹیم کو سلام خدا کرے۔ دوشیزہ ڈائجسٹ کی کامیابی ہمیشہ قائم دائم رہے۔ آپ کو خط لکھتے ہوئے مجھے بہت ہنسی آ رہی ہے کہ بیس، پچیس صفحات کے افسانے لکھنا کتنا آسان ہے۔ مگر ایک چھوٹا سا خط لکھنا بھی کتنا مشکل ہے۔ مجھے اپنی زندگی کے پندرھویں سال کے آخری مہینے میں کہیں احساس ہوا کہ میری انگلیوں کی پوروں میں لفظ سانس لیتے ہیں۔ اور انہیں آزادی دینے کے لیے میں نے قلم اٹھایا۔ مقامی اخبارات میں افسانے لکھتے ہوئے میں خوش تھا۔ پھر کہیں جا کے خیال آیا کہ اب مجھے کسی بڑے پلیٹ فارم پر قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔ میں نے مشہور ڈائجسٹ سے آغاز کیا۔ اب تک میرے تقریباً سات افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ اس پر میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے لفظوں کی دولت سے نوازا۔ میرے کالج پروفیسر نے مجھے دوشیزہ ڈائجسٹ کے لیے لکھنے کو کہا...... بنیادی طور پر مجھے رومانی کہانیاں لکھنا پسند نہیں اگر لکھوں بھی تو شاید وہ صرف مجھے ہی پسند ہوں گی۔ مجھے مختلف موضوعات پر لکھنے کا شوق ہے...... تجسس کے اسرار میں لپٹی کہانیوں کی مجھے کھوج ہے۔

☆ پیارے بھائی محسن! خوش آمدید! تبصرے کا شکریہ۔ آپ کی تحریر میں کمی نہیں بلکہ موضوع میں تبدیلی لائیے۔ بہتر ہوگا اگر موضوع ماضی کے بجائے 'حال' اور دیکھا بھالا منتخب کیا جائے۔ رومان نہ ہو مگر معاشرتی تو ہو۔ اُمید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

کراچی سے ہماری بہت پیاری شگفتہ سی شگفتہ شفیق کا برقی نامہ موصول ہوا ہے لکھتی ہیں پیاری رضوانہ جی السلام علیکم بڑی پیاری دلہن کی تصویر سے سجا ہوا جولائی کا دوشیزہ بے حد پسند آیا اور جب ہم نے اک تقریب خاص پڑھی تو حسب سابق منزہ، کاشی چوہان اور آپ کی محبتوں نے میری آنکھوں کو آبدار موتیوں سے سجا دیا۔ میں سوچتی ہوں کہ یہ دوست ہی ہوتے ہیں کہ جو جینا سکھاتے ہیں۔ یہ کاشی چوہان اور رضوانہ کی محنتوں کا ہی پھل ہے کہ دوشیزہ حسین اور بہترین ہو رہا ہے۔ سارے افسانے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ بالکل سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ کس کو کس پر ترجیح دی جائے ہم کو فوزیہ احسان رانا، نزہت جبیں، فصیحہ آصف اور سب سے زیادہ رضوانہ پرنس کا افسانہ پسند آیا۔ آگے کے چار افسانے

بھی پڑھے نہیں ہیں۔ محفل میں ہم کو خولہ عرفان، کراچی کا خط بہت اچھا لگا۔ انزاء نقوی کی مبارک باد کا بے حد شکریہ۔ فصیحہ آصف کو بہت سلام اور پیاری رضوانہ کوثر کی صحت کے لئے ڈھیر ساری دعائیں۔ آپ تو آجکل لندن میں انجوائے کر رہی ہیں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔ آمین۔ قدسیہ ندیم لالی کا قصہ چاندرات۔ بہت پسند آیا۔ انتخاب خاص بھی شاندار رہا۔ اے ون دوشیزہ لانے پر کاشی چوہان مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اب اجازت۔

☆ اچھی شگفتہ! تم نے محفل میں آکر ہمارا مان بڑھایا۔ ہم لندن میں انجوائے کر رہے ہیں اور بہت زیادہ کیونکہ اس بار دوشیزہ کے پیارے ہمارے ساتھ رابطے میں ہیں۔

کراچی سے شاہانہ احمد اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ محفل میں حاضر ہیں لکھتی ہیں۔ رضوانہ باجی! دا سب سے پہلے تو دوشیزہ کا اتنا خوبصورت عید نمبر نکالنے پر میری، میری بہن بسمہ اور میری امی اور دا بھابیوں کی جانب سے مبارک باد قبول کیجیے۔ ٹائٹل دیکھتے ہی دل باغ باغ ہوگیا، اتنا شاندار ٹائٹل ویلڈن رضوانہ باجی اور کاشی صاحب۔ سب سے پہلے اپنا فیورٹ ناول دام دل پڑھا۔ رفعت جی! آپ کے ہاتھ چومنے کو جی چاہتا ہے۔ اتنا خوبصورت ناول لکھنے پر مبارک باد قبول فرمائیے۔ اُم مریم کا رحمٰن، رحیم سدا سائیں بھی شاندار جا رہا ہے۔ امن، قدر اور اتباع پرانے کرداروں کی موجودگی میں بھی اپنی ڈھاک بٹھانے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔ مریم جی! سچ سچ بتائیں کہ اتنے خوبصورت کردار کیسے تخلیق ہوتے ہیں۔ مریم جی! میری طرف سے آپ کو بھی میری طرف سے مبارک باد قبول ہو۔ کم تو خیر لمحوں نے خطا کی تھی بھی نہیں ہے۔ فوزیہ احسان رانا بھی اس بار پوری فارم میں ہیں۔ بینا عالیہ کا تیرے عشق نچایا بس اب بور کرنے لگا ہے۔ عید کے ناولٹ نزہت جبیں ضیا، نے عید سرپرائز اور فصیحہ آصف خان نے چاند، عید اور ہم کے نام سے پڑھنے کو دیے۔ عید سرپرائز بازی لے گیا۔ افسانوں میں غزالہ فرخ، رُخ چوہدری، غزالہ عزیز، عقیلہ حق، جیسے بڑے نام موجود تھے۔ لیکن رضوانہ باجی آپ کا افسانہ سب سے شاندار رہا۔ افشاں شہزاد نے اپنی پہلی ہی تحریر سے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ اُمید ہے افشاں بہت آگے تک جائیں گی۔ نبیلہ نازش راؤ اور حیاء بخاری متاثر کرنے میں ناکام رہیں۔ انتخاب خاص میں جوگندر پال کی تحریر نے مزہ دیا۔ جبکہ قدسیہ ندیم لالی نے قصہ چاندرات کا لکھ کر رنگ کائنات کا حسن دوبالا کر دیا۔ ارے! کاشی چوہان صاحب آپ کا اداریہ محبت سے عید مبارک نے سوچ کے دریچے وا کر دیے۔ جبکہ رضوانہ باجی آپ نے بھی محفل کے رنگ دوبالا کر دیے ہیں۔ دوشیزہ کے دیگر مستقل سلسلے بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے۔

☆ اچھی شاہانہ! تمہارے تبصرے نے ہمارا دل موہ لیا۔ ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ ہمیں اتنی محبت کرنے والے پیاروں کا ساتھ نصیب ہے۔ خوش رہو۔

اسلام آباد سے فرح عالم محفل میں اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ موجود ہیں، لکھتی ہیں کاشی بھائی! یقیناً آپ مجھے میری غیر حاضری پر کوئی سزا نہیں دیں گے۔ بھیا! سب سے پہلے تو میں رضوانہ پرنس صاحبہ کو ادارت سنبھالنے پر مبارکباد پیش کروں گی۔ اور پھر وہی بات کروں گی۔ ہوئی تاخیر تو کچھ

باعثِ تاخیر بھی تھا۔ اسلام آباد کی بارشوں نے ہمارا برا حال کیا ہوا ہے اللہ جانے رحمتِ خدا بندی کیا رنگ دکھائے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ سب کے حال پر رحم فرمائے۔ دوشیزہ میں تاخیر سے تبصرہ لکھ رہی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوشیزہ سے دور رہی ہوں۔ ہر ماہ دوشیزہ کا مطالعہ میرے معمولات میں شامل ہے۔ اس بار انتہائی کوشش کر کے آخر کاغذ قلم کو راضی کر ہی لیا کہ کچھ اپنے دوشیزہ کے لیے بھی ارسال کر دیا جائے۔ کیونکہ کہتے ہیں محبت طفلِ سادہ ہے۔ اسے ہر دم تائید محبت کی ضرورت ہے۔ دوشیزہ کا جولائی کا شمارہ عید نمبر کی صورت میرے ہاتھوں میں موجود ہے۔ ٹائٹل خوبصورت ہے۔ اداریے میں محبت سے عید مبارک شاندار ہے۔ محفل رضوانہ پرنس خوب سنبھال رہی ہیں۔ دوشیزہ کی سب سے خوبصورت چیز اس وقت دوشیزہ کے سلسلے وار ناول ہیں۔ دفعت سراج کا دام دل ہو یا اُم مریم کا رحمٰن، رحیم، سدا سائیں۔ یا فوذیہ احسان رانا کا ناولٹ لمحوں نے خطا کی تھی۔ زبردست ہے ایسے میں اگر کوئی ہلکا ناول آ جائے تو برداشت کر لیا جاتا ہے۔ اُمید ہے بینا عالیہ برا نہیں مانیں گی۔ کسی چیز کی بے جا تعریف اُس کے حسن کو کھا جاتی ہے۔ یہی کچھ آج کل تیرے عشق نچایا میں بھی ہو رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آخر کیا وجہ ہے کہ بینا عالیہ اُم فروا، اُم زارا، ماہین، مہر النساء، امل، اور گھر کی نوکرانیوں تک کو جنت کی حوریں بنانے پر کیوں تلی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ملک عمار ہو یا ملک مصطفیٰ علی یا اسماعیل بخش ارے! رحم کر دیں بینا یہ ناول اسی زمین پر بیٹھ کر لکھا ہے نا آپ نے۔ مگر اعتدال ہر معاملے میں بہتر ہوتا ہے۔ چاہے صورت ہو یا سیرت۔ چلیے اب آتے ہیں عید کی تحریروں کی جانب۔ ناولٹ نزہت جبیں ضیاء اور فصیحہ آصف دونوں ہی کے عامیانہ سے رہے۔ مزہ نہیں آیا۔ عید کی تحریر میں رنگ ہوتے ہیں۔ یہاں یہ چیز مفقود رہی۔ آخر رضوانہ پرنس نے بھی تو ساجن سنگ عید لکھا تھا۔ شاندار تحریر رہی۔ رُخ چوہدری سے کہنا ہے کہ پلیز رُخ آپ کی چلبلی تحریریں آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ بھئی! مجھے اپنی وہی رُخ چوہدری اپنے دوشیزہ میں بھی چاہیے۔ غزالہ فرخ کی تحریر انتہائی سنجیدہ تھی۔ مزہ نہیں آیا۔ غزالہ عزیز، عقیلہ حق، حیاء بخاری، افشاں شہزاد اور نبیلہ نازش راؤ نے بھی بس عام سی تحریریں لکھیں۔ افسانوں میں رضوانہ پرنس کا افسانہ ہی اے ون رہا۔ (یہ ایڈیٹر کی تعریف نہیں۔ افسانہ پڑھ کر خود دیکھ لیجیے گا) انتخابِ خاص، رنگِ کائنات اور دیگر مستقل سلسلے شاندار رہے۔ میری کسی بات سے کسی کا دل دُکھا ہو تو میں معذرت چاہتی ہوں لیکن تبصرے کا مطلب سب کچھ اچھا تھا نہیں ہوتا۔ ہمیں ایمان داری سے تبصرہ کرنا چاہیے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر ملاقات ہو گی اگر خدا لایا۔

☆ پیاری فرح! تم تو آئیں اور چھا گئیں۔ ہمیں تمہارا تبصرہ اے ون لگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ پیاری سی لڑکی جس کا نام فرح عالم ہے ہر ماہ ہمارے ساتھ محفل میں شامل رہے۔

لاہور سے یہ آمد ہے ہماری ہر دل عزیز رضوانہ کوثر کی لکھتی ہیں۔ جولائی کا شمارہ عید سے پہلے حاصل کرنا جیسے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ لیکن پھر بھی حاصل کر ہی لیا۔ ٹائٹل دیکھتے ہی بے اختیار منہ سے 'واہ' نکلا۔ اشتہارات کو یکسر فراموش کرتے اداریے تک پہنچے۔ اداریے سے پہلے سہام

مرزا کی تصویر نے جیسے گئے وقتوں کی یاد دلادی۔ سہام صاحب کی عظمت کو ہم سب سلام کرتے ہیں۔ اور واقعی سہام صاحب ہم آپ کو نہیں بھولے۔ اداریے میں کاشی نے جس طرح عید کی مبارکباد پیش کی۔ اس نے ہر بار کی طرح سوچ کے دریچے وا کر دیے۔ ویلڈن کاشی! جیتے رہو بیٹا۔ زادِ راہ سے ہوتے ہوئے رضوانہ پرنس کی بارگاہ میں پہنچے۔ رضوانہ نے محفل میں اپنی خوبصورت شخصیت سے چار چاند لگا دیے ہیں۔ جیو رضوانہ پرنس اور یقیناً ماہ اگست کی محفل آپ لندن سے براہِ راست سجائیں گی۔ بشریٰ سعید احمد کو ایوارڈ کی بہت بہت مبارک باد۔ بشریٰ سچ مچ تمہارا قلم ادب کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اک تقریبِ خاص میں شگفتہ شفیق کے اعزاز میں سجائی گئی تقریب پذیرائی کا مختصر احوال بہت خوبصورت لگا۔ شگفتہ خدا تمہیں مسکراتا رکھے آمین۔ س سے سوال میں محمد بلال قریشی اپنی بیگم کے ساتھ بہت پیارے لگے۔ منی اسکرین کے بعد رفعت سراج کا لازوال سلسلہ دامِ دل اپنی چھٹی قسط میں بھی شاندار رہا۔ چمن کا کردار ہو یا بانو آپا کا۔ ثمر ہو یا یاور۔ فردوس ہو یا حامد حسین یا ندا اور عمیر۔ ہر کردار اپنی بھرپور عکاسی کے ساتھ موجود ہے۔ یقیناً دامِ دل کو ہم بہت جلد ٹی وی اسکرین پر بھی دیکھ لیں گے۔ رفعت خدا تمہیں اسی طرح رفعتیں عطا کرتا رہے آمین۔ بینا عالیہ کا تیرے عشق نچایا تیزی سے اختتام کی جانب رواں دواں ہے۔ دیکھیے اُم فروا اور ملک مصطفیٰ علی کی محبت کیا رنگ لاتی ہے۔ اُم مریم کا رحمٰن، رحیم، سدا سائیں تیسرے حصے میں بھی بھرپور گرفت لیے ہوئے ہے۔ فوزیہ احسان رانا کے لمحوں کی خطا، خوب محظوظ کر رہی ہے۔ فوزیہ جیتی رہو اس بار تو تم نے حیران کر دیا۔ نزہت جبیں ضیاء نے عید سرپرائز کمال لکھا۔ بہت خوب نزہت۔ فصیحہ آصف کا چاند عید اور ہم بھی بہتر تھا۔ افسانوں میں رضوانہ پرنس، عقیلہ حق، غزالہ عزیز اور افشاں شہزاد کے افسانے بہت خوبصورت تھے جب کہ حیاء بخاری اور نبیلہ نازش راؤ نے بھی بہتر لکھا۔ انتخاب خاص میں جوگندر پال کا آزمودہ نسخہ عالم گیر سچائی لیے ہوئے تھا۔ قدسیہ ندیم لالی نے چاند رات کا قصہ خوب سنایا۔ دوشیزہ میگزین کے دیگر مستقل سلسلے بھی ہمیشہ کی طرح خوب رہے۔ آخر میں صرف اتنی گذارش ہے کہ پیارے ساتھیوں! میری صحت کے لیے دعا کریں۔ اُمید ہے آپ کی دعائیں میرے لیے شفا کا باعث ہوں گی۔ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ اگر خدا لایا۔

☆ پیاری رضوانہ! بھئی دیکھو ہم تمہیں ہنستا مسکراتا ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم انشاء اللہ بہت جلد صحت یاب ہو کر ہم سے آفس میں ملاقات کرو گی۔ ہم لندن میں ہیں لیکن پھر بھی ہمارا دل ہمارے پیاروں کے پاس ہی ہے۔ تبصرہ بہت خوبصورت کیا اس کے لیے بہت بہت شکریہ۔ خوش رہو۔

اچھا ساتھیو! اس پیارے خط کے ساتھ ہی ہماری اور آپ کی اس ماہ کی ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر انہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔

ساتھیو! ہم لندن میں ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم آپ کو یاد نہیں کرتے۔ یقین جانیں لندن میں ہوتے ہوئے بھی آپ لوگوں کی محبتیں اور خلوص ہمیں مطمئن رکھتا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

دعاؤں کی طالب
رضوانہ پرنس

ماہنامہ دوشیزہ کراچی ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

- ...... پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے' جس کا گزشتہ بیالیس برس سے چار نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔
- ...... اِس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھر پور اعتماد کرتے ہیں۔
- ...... اِس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔
- ...... پوری دنیا میں پھیلے' اِس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں' جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔
- ...... اِس لیے کہ دوشیزہ ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔
- ...... جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔
- ...... اِس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں' جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
- ...... آپ کی مصنوعات کے اشتہار با کفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔
- ...... جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

شعبہ اشتہارات: دوشیزہ

88-C II ۔خیابان جامی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7 ۔کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

☆ وہ نام جو شناخت کا باعث ہے؟

♥ :عاصمہ جہانگیر۔

☆ گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟

♥ :یہی کہہ کر پکارتے ہیں۔

☆ وہ مقام جہاں سے آشنا ہو کر آنکھ کھولی؟

♥ :کوئٹہ۔

☆ زندگی کس برج (star) کے زیر اثر ہے؟

♥ :دلو۔

☆ علم کی کتنی دولت کمائی؟

♥ :سائیکالوجی اور سوشیالوجی میں گریجویشن کی ہوئی ہے۔

☆ کتنے بھائی بہن ہیں۔ آپ کا نمبر؟

♥ : ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ میرا نمبر دوسرا ہے۔

☆ برسر روزگار ہو کر پریکٹیکل لائف میں داخل ہوگئیں؟

♥ : کہہ سکتے ہیں۔

☆ موجودہ کیریئر (مقام) سے مطمئن ہیں؟

♥ :ابھی مجھے بہت آگے جانا ہے۔

☆ پروگرام کے لیے اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس موڈ بنانا ضروری ہوتا ہے؟

♥ :بالکل۔

☆ :اس زندگی میں کون سا کام سب سے مشکل ہے؟

♥ :اپنے لیے وقت نکالنا۔

☆ :کوئی ایسی خواہش جواب تک پوری نہ ہوئی ہو؟

♥ : ہر خواہش اپنے وقت پر پوری ہو جاتی ہے۔ بس نیت صاف ہونی چاہیے۔

☆ :کون سی چیز کی کمی آپ آج محسوس کرتی ہیں؟

♥ :میں بہت پریکٹیکل ہوں۔ کسی چیز کی کمی محسوس نہیں۔

☆ :اپنی کون سی عادت بہت پسند ہے؟

♥ :میں سب کا بہت خیال رکھتی ہوں۔

☆ :اپنی کون سی عادت سخت ناپسند ہے؟

♥ :ضد...... اپنی ضد بہت ناپسند ہے۔

☆ :زندگی میں کون سے رشتوں نے دُکھ دیے؟

♥ :اللہ نہ کرے۔

☆ :لباس جگ بھاتا پہنتی ہیں یا من بھاتا؟

♥: مجھے ڈھکا ہوا لباس بہت پسند ہے۔ شلوار قمیض، دوپٹہ۔

☆: اردو والے ''سفر'' کا ذریعہ کیا ہے؟

♥: اپنی گاڑی۔

☆ صبح کا آغاز کس طرح کرتی ہیں؟

♥: پانی پی کر۔

☆ دن کا کون سا پہرا اچھا لگتا ہے؟

♥: شام کا۔

☆: حساس ہیں یا......؟

♥: بہت زیادہ۔

☆: کون سے ایسے معاشرتی رویے ہیں جو آپ کے لیے دکھ اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں؟

♥: میں کسی کے ساتھ بہت اچھا کروں مگر وہ مجھے اچھا ریسپانس نہ دے اور ڈبل چہرے کے ساتھ سامنے آئے تو دکھ ہوتا ہے۔

☆: دولت، عزت، شہرت، محبت اور صحت اپنی ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیجیے۔

♥: عزت، صحت، محبت، شہرت، دولت۔

☆: سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

♥: خدا بہت بڑا ہے۔ اس کی قدرت ہی نرالی ہے۔

☆: پہلی ملاقات میں ملنے والے کی کس بات سے متاثر ہوتی ہیں؟

♥: اچھی شخصیات مقناطیس ہوتی ہیں اور خود بخود متاثر کرتی ہیں۔

☆: خودستائشی کی کس حد تک قائل ہیں؟

♥: ایک حد تک سب قائل ہوتے ہیں۔

☆ یاد کا کوئی جگنو جو تنہائی میں روشنی کا باعث بنتا ہو؟

♥: سوال اچھا ہے مگر جواب...... بہت سارے صفحات بھر دے گا۔

☆: غصے میں کیا کیفیت ہوتی ہے، خاموشی یا چیخ وپکار؟

♥: مارتی نہیں، چیختی چلاتی نہیں، بس دماغ گھوم جاتا ہے۔

☆: لوگوں کی نظر میں آپ کی شخصیت کیسی ہے، اعلیٰ، اچھی، بس ٹھیک؟

♥: لوگ مجھے خوش قسمت کہتے ہیں۔

☆: موت خوف کا باعث ہے؟ اور اس کے علاوہ ڈرنے کی کوئی وجہ؟

♥ :بابابا.....موت سے کون ڈرتا ہے۔

☆ :فراز کے اس خیال پر کس حد تک یقین رکھتی ہیں کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا؟

♥ :سو فیصد۔

☆ :کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا فاسٹ فوڈ؟

♥ :گھر کا۔

☆ :زندگی کے معاملات میں آپ تقدیر کی قائل ہیں یا تدبیر کی؟

♥ :دونوں کی۔

☆ :کون سے الفاظ عام بات چیت میں زیادہ استعمال کرتی ہیں؟

♥ :کبھی غور نہیں کیا۔

☆ :زندگی کا وہ کون سا پل تھا جس نے یکدم زندگی ہی تبدیل کردی؟

♥ :جب مجھے ماں کی دعائیں ملنے لگیں اور میں نے ماں کے کہنے مطابق ہر کام کیا تو زندگی بدل گئی۔

☆ :ویک اینڈ کیسے گزارتی ہیں؟

♥ :اپنے گھر میں۔ گھر والوں کے ساتھ۔

☆ :شہرت، رحمت ہے یا زحمت؟

♥ :لوگ آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں تو شہرت۔ اور آپ بھی انہیں ایسی ہی عزت دیں تو شہرت کبھی زحمت نہیں بنتی۔

☆ :اگر آپ میڈیا پر نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟

♥ :ماہر نفسیات ہوتی۔

☆ :''ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا'' کس حد تک عمل کرتی ہیں؟

♥ :جتنا عمل کر سکوں کرتی ہوں۔

☆ :اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ موسیقی روح کی غذا ہے؟ اگر ہے تو کیسی موسیقی؟

♥ :بالکل۔ میوزک تنہائی اور خوشی کا ساتھی ہے۔

☆ :پسندیدہ شخصیت؟

♥ :بھئی میری کوئی پسندیدہ شخصیت نہیں ہے۔ سب اچھے ہیں۔

☆ :اپنے ملک کی کوئی اچھی بات؟

♥ :یہ ہمارا ملک ہے۔ یہ سب سے اچھی بات ہے۔

☆ :کیا ہم آزاد ہیں؟

♥ :الحمدللہ ہم آزاد ہیں اور پاکستانی ہیں۔

☆ :لوگوں کی کوئی عادت جو بہت بری لگتی ہے؟

♥ :لوگوں کی منافقت بہت بری لگتی ہے۔

☆ :خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟

♥ :بزدل۔ جو حالات کو فیس نہ کر سکے وہ بزدل ہی ہوگا۔

☆ :آپ پاکستان میں کس تبدیلی کی خواہاں ہیں؟

♥ :ہم خود کو بدل نہیں سکتے تو اپنے ملک میں کیا تبدیلی لا سکتے ہیں۔

☆ :مطالعہ عادت ہے یا وقت گزاری؟

♥ :عادت۔

☆ :شاپنگ کے لیے پسندیدہ جگہ؟

♥ :مخصوص نہیں۔

☆ :جھوٹ کب بولتی ہیں؟

♥ :جب ضرورت پڑ جائے......

☆ :انٹرنیٹ اور فیس بک سے کتنی دلچسپی ہے۔

♥ :بالکل نہیں۔ ضرورت کے تحت استعمال کرتی ہوں۔ بلکہ فیس بک سے تو اپنا اکاؤنٹ ہی ختم کردیا ہے۔

☆ :مردوں کی کیا بات سب سے اچھی لگتی ہے؟

♥ :اچھے کردار والے مرد خواب وہ باپ ہو، بھائی ہو یا شوہر اچھے لگتے ہیں۔

☆ :مردوں کی سب سے بری بات کیا لگتی ہے؟

♥ :مرد اگر سائباں نہ رہیں تو مرد ہی نہیں۔

☆ :حرف آخر کیا چاہنا چاہیں گی؟

♥ :دوسروں کو ڈسکس کرنے میں اپنا وقت برباد نہ کریں۔ وقت کی قدر کریں۔

☆☆.....☆☆

منی اسکرین

اے آر وائی کے خوبصورت پروگرام

م ش خ

قارئین گرامی آپ کی مہربانی اور محبت کے ناتے ہم نے رمضان کے پروگرام ''شان رمضان'' بہت کامیابی سے پیش کیے۔ ہم اس دفعہ پھر خوبصورت پروگراموں کے ساتھ حاضر ہیں۔اس بار پھر ARY عید کے پروگراموں کے حوالے سے بازی جیت گیا اور ہمارے عید کر پروگراموں کو ناظرین نے بہت سراہا۔جس کے لیے ہم آپ سب کے بے حد مشکور ہیں اور آیئے ناظرین اب آیئے چلتے ہیں خوبصورت پروگراموں کی طرف جو آپ کی رائے اور حوصلے کے منتظر ہیں۔

''مجھے قبول ہے'' ہمارے معاشرے میں بسنے والے ایسے کرداروں کی کہانی ہے۔ جو اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے بہت سے بے قصور انسانوں کو ان کے فطری حقوق سے محروم کر دیتے ہیں اور اپنے حقوق سے محروم لوگ مختلف انداز میں ردعمل کرتے ہیں۔ بعض گھروں میں مردوں کی انا اتنی خودسر ہو جاتی ہے کہ ہر فیصلہ وہ خود کرتے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ ان کے فیصلوں کے کیا اثرات گھرانوں پر پڑیں گے۔اس سوپ کی کہانی شاکر علی اور ان کے بھائی زاہد علی کے خاندان کے گرد

ARY ڈیجیٹل کے سوپ 'مجھے قبول ہے' میں عائشہ کیریو اور اسد صدیقی

گھومتی ہے۔ اس سوپ کے ہدایت کار رابعہ شاہد اور اسے تحریر کیا ہے امر حسین اور صوفیہ خرم نے جبکہ فنکاروں میں ساجد حسین، اسد صدیقی، عصمت اقبال، ندا ممتاز، احمد زیب، زارا احمد، سمیع ثانی، برجیس فاروق، عبیر قریشی، عمران رضوی، وجیہہ فاطمہ، اور دیگر شامل ہیں۔ "سوپ" مجھے قبول ہے" پیر سے لے کر جمعرات تک روزانہ رات 7:30 بجے دکھایا جارہا ہے۔

ARY ڈیجیٹل اس دفعہ لایا ہے اپنے ناظرین کے لیے خوبصورت پروگرام MADVENTURES SEASON-2 جس کی ریکارڈنگ تھائی لینڈ میں

ARY ڈیجیٹل کے سوپ 'مجھے قبول ہے' میں برجیس اور سمیع ثانی

ہوئی ہے اور اس میں پاکستان کے مقبول فنکاروں نے اپنے فن کا جادو جگایا ہے اداکارہ شاہ ان کے ہمراہ فخر امام اور مہوش حیات نے اس کھیل میں بہت جاندار اداکاری کر کے اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ یہ ایک بہت خوبصورت گیم شو ہے۔ جو تھائی لینڈ میں مختلف لوکیشن پر ریکارڈ کیا گیا ہے۔

شوخ چنچل شاہ، مہوش حیات، اور شاہ عسکری نے خوبصورت پرفارمنس دے کر ناظرین کے دل جیت لیے ہیں۔ اس کے دیگر فنکاروں میں فخر امام، احمد علی بٹ، دانش حیات، ثنا شاہ علی، فاطمہ آفندی، انور اور سالان، دمام علی، فائق خان، نعمان جاوید، فرح علی، دانیال راحیل، صائمہ اظہر، طافور خان، سامر علی، حنا الطاف، اور خرم پطرس قابل ذکر ہیں۔ یہ خوبصورت شو، ہر ہفتہ اور اتوار رات دس بجے دکھایا جائے گا۔ پاکستان کے تمام چینلوں پر نمبر ون پوزیشن حاصل کرنے والے پروگرام "جیو پاکستان" نے مقبولیت کے ریکارڈ پاش پاش کر دیے ہیں۔ فہد مصطفیٰ ناظرین کے دلوں کی دھڑکن بن گئے ہیں۔ یہ معرکۃ الآراء پروگرام اپنی مثال آپ ہے۔ جیو پاکستان جمعہ، ہفتہ 7:30 بجے پیش کیا جارہا ہے۔ پروگرام "سر عام" میں گمنام لوگوں کی کردار کشی اقرار بہت خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ عام لوگوں میں انصاف کی پاسداری کے تحت مقبول ہے اور اعلیٰ سطح کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ یہ پروگرام جمعہ، ہفتہ 7 بجے پیش کیا جاتا ہے۔ ندا کلثوم مارننگ پاکستان خوبصورتی سے کر رہی ہیں اور اس پروگرام نے اپنی مقبولیت کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ مذہبی چینل کیو ٹی وی سے پروگرام "میری پہچان" ہر منگل کی رات ہوسٹ سحرش خان 7 بجے پیش کرتی ہیں۔ خواتین کے دینی مسائل پر مبنی پروگرام "دین اور خواتین" بدھ اور جمعرات کو 7 بجے پیش کیا جارہا ہے۔ پروگرام "کتاب اور قلم" مستند اسلامی کتابوں پر تبصرہ مفتی منیب الرحمن رات 8 بجے پیر سے جمعرات تک پیش کرتے ہیں۔

☆☆......☆☆

Life Buoy... بچھڑوں سے ملائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

کتنی ہی دیر سے وہ لان میں ٹہل رہی تھی۔ گھڑی دیکھنے کی فرصت ہی کسے تھی اور وقت...... وقت سے کیا لینا دینا تھا اُسے۔

وہ تو بس معمول کی طرح مغرب کے بعد بائیں ہاتھ پہ بنے اس کچے قطعے میں آ جایا کرتی تھی۔

بوا جی نے رحیم سے کہہ کر گھر کے اس حصے میں سبزیاں لگوائی تھیں۔

زمین زرخیز تھی، دیکھتے ہی دیکھتے دنوں میں سر سبز ہوگئی۔ گھاس نے اس حصے کی ہریالی ہی نہیں رونق بھی بڑھا دی تھی۔

ادھر آتے ہی ایک خوشگوار مسرت کا احساس ہوتا اور ذہن و دل تراوٹ سے سرشار ہو جاتے۔ اس کا معمول تھا صبح صادق فجر کی نماز کے بعد وہ گھر سے باہر بنے اس چھوٹے سے لان میں چہل قدمی کر کے ذہن و دل کو ریفریش کرتی اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اپنی پینٹنگ کا سامان مع کینوس اسٹینڈ باری باری رکھتی اور اپنے کام میں مگن ہو جاتی۔

دو گھنٹے وہ یہیں کام کرتی اور پھر سامان اندر رکھ کر اپنی شیٹس اور رنگوں کے ساز و سامان اٹھائے 40 چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر موجود اپنی آرٹ اکیڈمی میں آ جاتی، وہاں سے واپسی اس کی شام تک ہوتی۔ واپس آ کر وہ بنا کچھ کھائے اپنے بیڈ پر گر جاتی اور تھکن اُسے تھپکیاں دے دے کر سلا دیتی۔

وہ ظہر اور عصر کی نماز اکیڈمی میں ادا کر کے آتی تھی۔ اٹھ کر پہلے وضو بناتی اور پھر مغرب کی نماز کے بعد جعفری بوا اُسے فوراً چائے دیتیں اور اسنیکس، نگٹس اور سادہ سلائس ہمیشہ کی طرح اس کے پاس ہوتے۔

وہ چائے کے ساتھ یہ چیزیں بھی تناول کرتی جاتی اور اس کا پیٹ بھر جاتا۔

چائے سے فارغ ہو کر پھر وہ گھر کے بائیں

حصے پر بنی اس جنت میں آ کر چہل قدمی شروع کر دیتی۔

ایسے میں اُسے علی حمزہ کی یاد شدت سے ستاتی۔

''تمہیں پتا ہے امی مجھے جب تک اپنے ہاتھ سے کھانا نہ کھلائیں میرا پیٹ نہیں بھرتا۔'' وہ بڑے فخر سے اُسے بتاتا۔

''شرم کرو! اب تم اتنے بڑے ہو گئے ہو۔'' وہ اُسے چڑاتی۔

ارے یار تم بھی نا! تم نہیں جانتیں کہ یہ مائیں کیا ہوتی ہیں......''

اور پھر فوراً اُسے اپنی بات کا احساس ہوتا۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہمیشہ بھول جایا کرتا تھا، جس سے بات کر رہا ہے اس کے لیے یہ لفظ ''ماں'' دل میں انی بن کر چبھ جاتا ہے۔

''جب تم آؤ گی نا میری زندگی میں...... پھر کھلانے والے ہاتھ تبدیل ہو جائیں گے۔''

وہ اس کی نم آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولتا۔

''بالکل نہیں...... میں کیوں کھلاؤں گی آپ کو۔ اپنے ہاتھوں کو استعمال کرنا سیکھو...... بڑے آئے......''

وہ بڑبڑاتے ہوئے اُسے چڑاتی۔

''اے......ادھر دیکھو......تمہارے ہاتھ کس کے ہیں۔ میرے ہیں نا۔'' وہ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیتا۔

''تو۔'' وہ شرمگیں مسکراہٹ چہرے پر سجائے کہتی۔

''تو انہیں میرے لیے ہی رہنے دو۔''

وہ اس کے ہاتھ چومتے کہتا۔ وہ الرٹ ہو جاتی۔

''ہم م م...... میاں مجنوں۔''

''وہ تو ہم ہیں۔''

''پلیز...... یہ میرے ہاتھ ہیں۔ یہ ہاتھ اس کینوس کی امانت ہیں اور بہت جلد میں یہ امانت آرٹ گیلری کی زینت بناؤں گی۔ سمجھ گئے آپ۔''

وہ اپنے برش اٹھائے اُسے یکسر اگنور کر کے پھر سے کینوس کی ویران دنیا کو رنگوں سے آباد کرنے لگتی۔

☆......☆......☆

''لو بتاؤ۔ مجھے چلی ہے سکھانے۔ کل کی لونڈیا اور جنے کیا بن جائے ہے۔ اری کمبخت چل اٹھ۔ جا کر نہا دھو لے۔ تیار شیار ہو جا۔ وہ باپ آنے والا ہے لینے تجھے۔''

اصغری خاتون نے اُسے دھنک ڈالا۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے ان کے دیسی جڑی بوٹیوں والے شیمپو سے سر دھونے سے انکار کر دیا تھا۔

اس شیمپو سے اٹھتی باس سے اس کی ناک جل گئی تھی۔ اس کی نانی نے اُسے اپنی محنت کو سیکنڈوں میں غارت کرتے دیکھ کر دو ٹھو مار کر جیسے کمر ہی توڑ دی تھی۔

وہ اپنی آج کی پاکٹ منی مانگ رہی تھی۔ اُسے صرف لائف بوائے شیمپو خریدنا تھا۔

اس کی ماں اسے بچپن سے لائف بوائے شیمپو استعمال کراتی آئی تھیں۔

اس کی وجہ سے اُس کے بال بہت لمبے اور چمکدار ہو گئے تھے۔

ساتھ ساتھ لانبے بھی تھے۔ مگر پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ اس کی ماں کھو گئی تھی......

نانی کے پاس اُسے چھ ماہ ہو گئے تھے۔
اس کے ننھیال کا متوسط طبقے سے تعلق تھا۔
قسمت نے امینہ بیگم کو بشیر احمد کے گھر پہنچا دیا تھا۔ بشیر احمد ایک خوشحال خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔
شادی سے پہلے امینہ بیگم کے بال جھڑتے تھے اور دو موہے بھی تھے۔
انہوں نے جب سے لائف بوائے شیمپو استعمال کرنا شروع کیا تھا، ان کے بالوں کی ساری پرابلمز حل ہو گئی تھیں۔
وہ بالوں کے مسائل کے حل کے لیے ہر ایک کو لائف بوائے شیمپو ہی کے استعمال کا مشورہ دیتی تھیں۔
کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ یہ سب اس لیے کرتی ہیں کیوں کہ ان کی جاب اس ادارے میں ہے اور وہ اس کمپنی کی پبلسٹی کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں لیکن امینہ بیگم کے پاس ہر سوال کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔
''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔''
اور واقعی لوگ لائف بوائے شیمپو استعمال کر کے اپنی ہاتھوں خود ہی پشیمان ہو جاتے۔
شادی کے پہلے ہی سال انہوں نے نوکری کو خیر آباد کہہ دیا۔
بشیر احمد کو قطعاً پسند نہیں تھا کہ امینہ، اُن کی شریک سفر کمانے کے لیے باہر جائیں۔
سو امینہ بیگم نے نوکری کو خیر آباد کہہ دیا لیکن جہاں کسی کو بالوں کے مسائل کا سامنا ہوتا وہ جھٹ سے اُسے لائف بوائے شیمپو کے استعمال کا مشورہ دیتی تھیں۔
لوگ انہیں امینہ بیگم کے بجائے لائف بوائے بے بی کے نام سے پکارتے تھے اور وہ مسکرا کر رہ جاتیں۔

☆......☆......☆

وہ نہا دھو کر تیار بیٹھی تھی۔ لائف بوائے سے بال دھو کر اس کے بال نرم، ملائم اور چمکدار ہو گئے تھے۔ وہ ماتھے پر آنے والی لٹ کو پھونک مار مار کر اڑاتی۔ بشیر احمد کی گاڑی کا ہارن سنائی دینے لگا تھا۔
ہارن کی آواز سن کر اصغری بیگم کی تیوری پر بل از خود ہی پڑ گئے تھے۔
باپ کی آمد نے یقین میں برق سی بھر دی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی دروازہ کھولنے گئی تھی۔ بشیر احمد نے گھر کے اندر قدم رکھ دیے۔
یقین کو گود میں اٹھا کر اندر آ گئے۔ فضل ان کا ڈرائیور پیچھے پیچھے پھلوں کے شاپرز اصغری بیگم کے پاس رکھ چکا تھا۔ اصغری بیگم کی تیوری کے بل اب بھی جوں کے توں تھے۔
''کچھ پتا چلا۔'' بشیر احمد نے دھیمے سے استفسار کیا۔
''واہ بھئی واہ۔'' لونڈیا میری غائب کرا دی اور پوچھتے ہیں، پتا چلا...... اے لو...... میں تو میاں پرچہ کٹوا دوں گی۔ چھ مہینے تم جنے کون سے سمندروں کی سیر کر آئے۔
ادھر کلیجے پر مونگ دلنے کو اپنی لونڈیا چھوڑ گئے۔ غضب خدا کا۔ اچھا اندھیر ہے۔
گو موت دھلانے کو ہی تو یہ چنڈا اسفید کیا ہے میں نے۔ تم سمجھتے ہو گے بڑھیا چھ ماہ بعد سب کچھ بھول جائے گی۔ شرافت سے میری لونڈیا کو میرے حوالے کر دو بس......
یا الٰہی! میری امینہ کے دشمنوں کو خاک کر دے۔ الٰہی برباد کر دے۔''
سکون غارت کر دے۔ اصغری بیگم واہی

تباہی بکے جارہی تھیں۔
بشیر احمد کو لگا کہ وہ کچھ دیر یہاں اور عزت افزائی کراتے رہے تو دل دھڑکنا بھول جائے گا۔ وہ بیٹی کو گود میں لے کر اصغری بیگم کی دہلیز پار کر گئے، کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔

☆......☆......☆

پاپا۔ کیوں پریشان ہیں۔'' رات کو جب بشیر احمد یشفین کو دودھ کا گلاس پلا کر جانے لگے تو وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی۔
''نو ...... مائی سویٹ ہارٹ! کوئی بات نہیں۔'' انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرے۔
''پاپا! ماما!'' وہ آنکھوں میں نمی بھر کر بولی تھی۔
''بیٹا! آج پرامس کرو تم ماما کا ذکر نہیں کرو گی۔'' وہ کرب سے بولے۔
''تمہاری ماما تم کو اور مجھ کو چھوڑ کر بہت دور چلی گئی ہیں۔ میں نے ہر جگہ ان کو تلاش کیا مگر وہ کہیں نہیں ملیں۔''
اس سے زیادہ ضبط کا یارا ان میں نہ تھا۔ وہ اکیلے آدمی تھے۔
آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ اچانک بزنس ٹور پر جانا پڑا تو یشفین کو دل پر پتھر رکھ کر وہ اس کو نانی اماں کے گھر چھوڑ گئے۔
'امینہ تم کہاں چلی گئیں'۔
یہ سوال ان کے ذہن میں گونجتا تھا لیکن پھر اس بازگشت کے نتیجے میں وہ ذہنی مریض بنتے چلے جارہے تھے۔
کاروبار میں مسلسل ان کی عدم دلچسپی کی بنا نقصان ہونے لگا اور نوبت یہ آگئی کہ وہ دیوانے اور کاروبار دیوالیہ ہوگیا۔

وہ امینہ کو یاد کرنے اور اس وقت کو قید میں رکھنے کی ضد میں نفسیاتی اسپتال پہنچا دیے گئے تھے۔
یشفین کو جعفری بوا کے ساتھ بنگلہ چھوڑ کر ایک مضافاتی بستی کی مکین بننا پڑ گیا تھا۔
یہ بھی مالک کا کرم تھا کہ اتنا کچھ جانے کے بعد بھی یشفین کے پاس اتنا کچھ تھا کہ وہ اپنی زندگی سہولت سے گزار سکے۔
یشفین نے دل لگا کر پڑھائی کی۔ فائن آرٹس کی طرف رجحان کے باعث اس نے اسی فیلڈ میں کیریئر بنانے کا سوچا تھا۔
شاید وہ اپنی بے رنگ زندگی کو کینوس پر رنگ بکھیر کر رنگین کرنا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

''جعفری بوا! میں ذرا گروسری کے لیے جا رہی ہوں۔ یشفین اسکول سے آنے والی ہے۔ آپ ذرا اُسے کھانا کھلا دینا۔ صبح ناشتا بھی بس تھوڑا سا کر کے گئی ہے۔ میں جلد واپس آجاؤں گی۔''
امینہ شال کو ہاتھ سے سیدھا کرتی باہر گاڑی کی جانب چل دیں۔
''بی بی ......ایک منٹ!''
جعفری بوا کچن کی طرف جاتے ہوئے انہیں دروازے پر ہی روک گئی تھیں۔
''جعفری بوا! جلدی۔ آئی ایم سو لیٹ۔'' امینہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولیں۔
''افوہ......'' اتنے میں ان کا موبائل بجنے لگا۔ وہ بیگ سے موبائل نکال کر بات کرنے لگیں۔
جعفری بوا کچن سے سرسوں کے تیل میں سفید سوتی کپڑے بھگو کر لے آئی تھیں۔ امینہ نے

ماتھے پہ ہاتھ مارا۔
"ارے بوا نہیں لگتی مجھے نظر۔"
وہ مسکرائیں اور موبائل وہیں ٹیبل پر دھر دیا۔
"لو بتاؤ بیٹا اللہ تیرے بھاگ بھرے۔ ترقی دے۔ خوشحالی دے۔ نظر کیوں نہیں لگتی۔ ماشاء اللہ آپ کی اور بشیر بیٹے کی چاند سورج کی جوڑی ہے میری بچی!"
بوا نے سات بار کپڑے اس پر سے وارے اور اُن پر آیات پڑھیں۔
اس کو دیر ہو رہی تھی۔ شادی کو چھ برس ہو گئے تھے۔
گود میں صرف ایک پھول کھلا تھا "یشفین" اور وہ بھی نازک اندام ماں کی طرح نازک سی گلاب جیسی گلابی گڑیا ہی تو تھی۔
"بیٹا آج یشفین کو لے کر کیوں نہیں جا رہی ہو۔ ہمیشہ تو ساتھ لے کر جاتی ہو۔ ذرا کی ذرا انتظار کر لیتیں۔
بچی آ جاتی تو چلی جائیں۔" بوا آیتیں پڑھ کر پھونکیں مارنے لگیں۔
"ارے بوا! آج آپ کو پتا ہے یشفین پورے پانچ سال کی ہو جائے گی۔
اس کی سالگرہ ہے اور میں تو اس کے لیے گفٹ بھی لوں گی۔ اُسے ساتھ لے کر گئی تو کیا مزہ آئے گا۔"
امینہ نے اصل صورتحال سے تو آگاہ کیا۔
بوا نے کمر تک لہراتے اس کے سیاہ ریشمی جھولتے بالوں پر آخری پھونک ماری اور کچن کی جانب چل دیں اور برنر پر تیل کے کپڑے رکھ دیے۔
"بتاؤ بھلا! ارے بڑی تیز نظر لگی ہوئی ہے۔
شعلے آسمان کی طرف رُخ کیے بالکل سیدھے تھے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر آئیں۔
"لو جی۔ بٹیا چلی بھی گئیں۔ اوئی میا! موبائل تو بٹیا ادھر ہی بھول گئیں۔"
بوا موبائل اٹھا کر ان کے بیڈ روم میں رکھنے چل دیں۔ یشفین اسکول سے آ گئی۔
ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، تین گھنٹے، سات گھنٹے بیت گئے۔
کس سے پتا کرتیں۔ بالآخر جب مغرب کی اذانیں ہو گئیں تو ہول کر انہوں نے بشیر احمد کو فون ملایا اور ساری کتھا کہہ سنائی۔
بشیر احمد کی تلاش کا سفر اس دن سے جو شروع ہوا تو کاروبار کی تباہی پر اختتام پذیر ہوا لیکن امینہ بیگم کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔
انہیں زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ معمہ حل نہ ہو سکا۔

☆......☆......☆

وہ ایک ٹک بس گلاس وال سے باہر دیکھے چلی جا رہی تھی۔ کتنے گھنٹے سے وہ وہاں کھڑی تھی۔
اُسے خود بھی معلوم نہ تھا مگر باہر سفید برف کی چادر میں کچھ ایسا تھا جسے وہ کھوجنا چاہ رہی تھیں۔
"ایکسیوز می میڈم! پلیز You Can Sit۔" اس نے تھک ہار کر اُسے مخاطب کیا وہ یکدم چونک کر مڑی۔
"سوری!" وہ واپس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔
"You are not a robot" وہ مسکرا کر بولا۔
وہ بس اسے دیکھتی ہی رہی۔ کچھ نہ بول پائی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اُسے یہاں وہ جانتی ہی نہ تھی۔
کبھی کبھی بے خبری بھی کتنی بڑی نعمت ہوتی

ہے۔

آ گہی عذاب ہوتی ہے۔

کتنے بڑے بڑے حادثے، ایک نیم دیوانہ، عقل وخرد سے بیگانہ سہہ جاتا ہے کتنے معمولی حادثے یہ ہوش وحواس رکھنے والا قوی انسان کو ہارٹ اٹیک سے دوچار کر کے سب سے دور کر دیتا ہے۔

درد سے کچھ بعید ہوتا نہیں
شاخ سے توڑ دے یا جوڑ دے یہ
یا سر عام سب کو چھوڑ دے یہ
درد سے کچھ بعید ہوتا نہیں
رکھ دے مرہم یا ذات گم کر دے
یا کسی شاہ کو گدا کر دے
کب کسی کی رسد ختم کر دے
درد سے کچھ بعید ہوتا نہیں

وہ بھی سب کچھ بھولے بیٹھی تھی۔

چھ ماہ گزرنے کے بعد یہ ضرور ہوا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس انجان سرزمین پر اجنبی محسوس نہ کرتی تھی۔ اس کے ساتھ حادثہ اچانک ہی پیش آیا تھا۔

جس کا کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا۔

وہ اس شاپنگ مال میں گفٹ شاپ پر گفٹ پیک ہونے کا Wait کر رہی تھی۔

وہ پانچ نقاب پوش نجانے کس رُخ سے دکان کو گھیرے ہوئے تھے کہ اُسے پتا ہی نہ چل سکا۔

بالکل فلمی سچویشن تھی۔ وہ بالکل عالم خواب میں تھی۔

اُسے ان میں سے ایک نے سائرن بجاتی پولیس موبائل کے آگے ڈھال بنایا ہوا تھا، سر پر گن ٹکائے۔ وہ کسی قیدی کی طرح بے بس چلتی جا رہی تھی۔

اُسے گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔

پیچھے سے پولیس نے فائرنگ شروع کر دی اور اندر اس کی چیخیں گونگی ہو گئیں۔ کب برسٹ مار کر اُسے خاموش کر دیا گیا۔ اُسے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔

☆......☆......☆

اُسے ہوش آیا تو وہ اپنا سب کچھ ہار چکی تھی۔

یہاں تک کہ اپنے ذہن ودل سے بھی اس کی یادداشت چلی گئی تھی۔

ایک بین الاقوامی NGO نے اس کی ذمہ داری اٹھا لی تھی اور علاج کی غرض سے اُسے نیویارک لے آئی۔

اس کے بارے میں معلومات کرائی گئی تھیں مگر جب وہ اپنا سب کچھ بھول چکی تھی تو کون اس کی تلاش میں اُسے کھوجتا۔

انتہائی ٹریٹمنٹ سے اُس میں یہ تبدیلی ضرور آئی کہ وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں ڈھالنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

ڈیوڈ اسمتھ اس کا کیئر ٹیکر تھا۔

وہ سب کچھ بھول چکی تھی لیکن جب پہلی بار ڈیوڈ اُسے گروسری شاپ پر لے کر گیا تو اس نے شیمپوز میں سے لائف بوائے شیمپو اٹھایا۔

ڈیوڈ اس کے انتخاب پر حیران ہوا کبھی کبھی ان کیسز میں یادداشت اور روزمرہ کی استعمال کی اشیاء سے بھی واپس آنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

ڈیوڈ اسمتھ اسے اس دن کے بعد سے لائف بوائے بے بی کہنے لگا۔ پھر وہ اِسی نام سے پکاری جانے لگی۔ ''لائف بوائے بے بی'' پکارے پر وہ بڑا خوش ہوتی تھی۔

ڈیوڈ اسمتھ کو اس کی کیئر ٹیکنگ کرتے بارہ سال ہو گئے تھے۔

ڈیوڈ اسمتھ ایک آرٹسٹ بھی تھا۔ وہ شوقیہ یہ ہنر جاری رکھے ہوئے تھا۔

اس نے اپنے فن کے شاہکار پاکستان میں تازہ ترین خشک سالی کے شکار اندرون سندھ کے لوگوں کی امداد کے لیے NGO کے توسط سے دان کر دیے تھے۔

بہت جلد کراچی میں ایک انٹرنیشنل ایگزیبیشن میں کچھ دن رکھے جانے کے بعد یہ ساری پینٹنگز امریکہ میں سیل آؤٹ ہونا تھیں۔

اس اہم کاز کے لیے ڈیوڈ کو بھی پاکستان جانا تھا۔

وہ لائف بوائے بے بی کو بھی ساتھ لے کر جا رہا تھا۔

ان کی 20 جون کی فلائٹ تھی اور 22 جون کو ایگزیبیشن کا افتتاح تھا۔

☆......☆......☆

وہ گھر کے بائیں حصے میں کینوس لیے سوچوں میں گم تھی اس کی چار پینٹنگز ریڈی تھیں۔ مگر وہ اس آخری پینٹنگ کو شاہکار بنانا چاہتی تھی۔

علی حمزہ کی آمد نے اُسے خوشگوار سی حیرت میں مبتلا کر دیا۔

اس کی آمد کے ساتھ ہی اُسے ماں کی یاد ستائی۔ وہ بہت مسرور دکھائی دینے لگی۔

''ماں کے ہاتھ سے کھانا کھا کر آ رہے ہیں جناب۔'' اس کا گلابی چہرہ کھل اٹھا۔

''آف کورس! اب بیگم کے ہاتھ سے کھانے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔'' وہ شوخ ہوا۔

''مجھے منظور ہے۔ میں اس ایگزیبیشن میں اپنی آخری پینٹنگ بنا کر اپنے تمام جملہ حقوق آپ کے نام کر دوں گی۔''

وہ شوخ ہوئی۔ اس کے ہاتھ بات کرنے کے ساتھ ساتھ تیزی سے کینوس پر بھی چل رہے تھے۔

''محترمہ بندہ بے دام غلام ہے آپ کا! فرمایئے کب تک یہ جملہ حقوق ہمارے نام ہوں گے۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتا ہوا بولا۔

''جعفری بوا!'' یشفین نے غیر متوقع طور پر آواز لگائی۔

''بوا ہانپتی کانپتی وہاں موجود تھیں۔

''جی بیٹا! کیا بات ہے؟''

وہ پریشانی میں گویا ہوئیں۔

''بوا! صاحب بہادر سے وہ سب کہہ دیں جو آپ نے رات میں مجھ سے کہا تھا۔'' وہ پینٹنگ میں جُت گئی۔

''ارے بیٹا میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ جانے کیا آفت آ گئی۔

ہاں تو علی بیٹا میں نے بٹیا سے کہہ دیا ہے کہ میری زندگی اب چراغ سحری ہے۔ بھیا اپنی امانت لے جاؤ۔ میں نے آپ کی والدہ کو بھی اس عید کے بعد کا کہہ دیا ہے۔ بٹیا کا گھر اب بس جانا چاہیے۔

میں سکون سے مرنا چاہتی ہوں۔''

''ارے بوا! مریں آپ کے دشمن! میرا تو سب کچھ آپ ہی ہیں۔''

یشفین برش سائیڈ پر رکھتی ان کے پاس آ گئی۔

''اوہو! تو یہ بات ہے۔ چلیے پھر کینوس پر اس بار شہنائی اور ڈھول تاشے بجائیں، ہم بھی سہرے کا بندوبست کر لیتے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے وہ یشفین کی کینوس پر لگی

پینٹنگ کی طرف بڑھا جو تیزی کے ساتھ مکمل پذیر ہو رہی تھی۔
وہ کینوس پر ابھری اس تصویر کو دیکھ کر حیران ہی رہ گیا۔ آخر یہ سب پینٹ کر کے وہ کیا کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ خاموش رہا۔

☆......☆......☆

ایگزیبیشن کا افتتاح ہو گیا تھا۔ ملک اور بیرون ملک کے ماہر پینٹرز کے شاہکار فن پارے لوگوں کی توجہ کا مرکز تھے مگر ایک پینٹنگ نے سب کو دم بخود کر کے رکھ دیا تھا۔
سب کی نظریں اس پینٹنگ کی تخلیق کار سے سوال کرنا چاہ رہی تھیں۔
پینٹنگ میں لائف بوائے شیمپو کی بوتل بنی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی بال لہراتی ایک گریس فل خاتون تھیں۔ پینٹنگ پر یہ لکھا تھا ''لائف بوائے بے بی۔''
غیر ارادی طور پر جب ڈیوڈ اسمتھ کی نظر اس پینٹنگ پر پڑی تو پلکیں جھپکانا ہی بھول گیا۔ اس کی 'لائف بوائے بے بی' ناسازی طبع کے باعث ہوٹل میں تھی۔
وہ اس بھیڑ سے نکل کر فوراً ہوٹل گیا۔ اور اُن کو ایگزیبیشن ہال میں لے آیا۔ پینٹنگ میں موجود لائف بوائے بے بی اور اس میں رتی بھر فرق نہ تھا ہو بہو وہی شکل۔
لگتا تھا تصویر والی گریس فل شخصیت تصویر سے نکل کر باہر آ کھڑی ہوئی ہو۔ پینٹنگ دیکھ کر امینہ تصویر میں کھو گئی۔
ایگزیبیشن کے پہلے دن کا اختتام ہوا تو مائک پر اعلان ہوا کہ 'یشفین بشیر' فوری طور پر ایگزیبیشن انتظامیہ سے ملیں۔
علی حمزہ کے ساتھ چلتی یشفین راؤ احمد علی کے کمرے میں موجود تھی۔ کمرے میں ٹیبل کی جانب پہلے سے دو غیر ملکی ان سے ڈسکشن میں مصروف تھے۔ یشفین کو دیکھ کر انہوں نے اپنی جانب اشارہ کر کے بلایا۔ یشفین خاتون کے ساتھ والی چیئر پر بیٹھ گئی۔ خاتون نے گردن گھما کر اس کی جانب دیکھا تو یشفین کی چیخ نکل گئی۔
''ماما!'' وہ ان کے گلے لگ کر شدت سے رونے لگی۔ علی حمزہ بھی اس معجزے پر حیران تھا۔
امینہ بیگم کے ذہن میں جھماکے ہونے لگے۔ آدھی یادداشت تو ان کی، تصویر میں موجود بشیر احمد اور یشفین کے نام سے آ گئی تھی، باقی رہی سہی یادداشت پر جمی برف کو یشفین کی محبت کی گرمی نے پگھلا دیا تھا۔
''یشفین! میری گڑیا۔ میری ننھی پری۔ میں تو تیری برتھ ڈے کا گفٹ لینے گئی تھی۔ میری گڑیا مجھے کیا پتا تھا کہ یہ گفٹ مجھے تجھ سے جدائی کا تحفہ دے دے گا۔ معاف کر دے مجھے میری بچی...... میں ...... میں کچھ بھی نہ کر سکی تیرے لیے۔ تُو اتنی بڑی ہو گئی ہے......اور......اور......'' آگے امینہ کا گلا رندھ گیا اور آواز حلق میں پھنس گئی۔
ڈیوڈ اسمتھ، راؤ احمد علی، حمزہ بھی اس جذباتی صورت حال سے اپنے آنسوؤں کو آنکھوں میں قید نہ رکھ سکے تھے۔

☆......☆......☆

دوسرے دن اخبار میں یہی کہانی واضح طور پر شائع ہوئی تھی۔
''لائف بوائے شیمپو نے لائف بوائے بے بی کو بارہ سال بعد ملا دیا تھا۔ لائف بوائے شیمپو نہ صرف بالوں سے پیار جگائے بلکہ بچھڑے کو بھی ملائے۔''

☆☆......☆☆

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں بے ترتیب کر دیں گی
رفعت سراج کے جادوگر قلم سے، نئے سلسلے وار ناول کی ساتویں کڑی

"امی جان...... پلیز روئیں مت...... آخر اس نے کیا کہا ہے؟ کچھ تو بتائیں۔" ثمر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہ پوچھو...... کچھ نہیں چھوڑا...... ارے لگتا ہے وہ تو خود چاہتی ہے کہ تمہاری دوسری شادی

ہو جائے۔ اُس نے اندر ہی اندر پتا کر لیا ہوگا کہ وہ ماں نہیں بن سکتی۔'' بانو آپا نے آنسو آنچل میں جذب کرتے ہوئے بڑے مغموم انداز میں کہا۔

ثمر نے ماں کی طرف دیکھا اور ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں جیسے سنی ہوئی بات کا بڑے سکون سے تجزیہ کر رہا ہو۔

''یہ بات نہیں ہے امی...... ٹیسٹ رپورٹ میں نے خود دیکھی ہیں۔ ان میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ چمن 100 فیصد فٹ ہے۔ اسے کوئی پرابلم نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی ماں بن سکتی ہے۔ آپ کو ٹینس ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اب ثمر نے آنکھیں کھول کر ماں کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی۔

''کبھی بھی...... یہ تم نے کیا نرالی بات کی۔ بیٹا ماں بننے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ عورت کی عمر زیادہ ہو جائے تو ماں بننے کے چانس نہیں رہتے۔'' بانو آپا تو اندر سے بھری بیٹھی تھیں۔ کسی خوش خبری سے خوش ہونے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

''تو کون سا اس کی عمر بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ بس اللہ کی مرضی...... آپ نے اور افشاں نے دوسری شادی کی بات کی ہو گی تب ہی اس نے کچھ کہا ہوگا۔ اب دیکھیں ناں...... اس کا تو کوئی قصور نہیں ہے پھر کیوں اس کے سر پر دوسری شادی کی تلوار لٹکائی جائے۔ یہ انسان کے اختیار میں تو نہیں ہے۔'' ثمر بہت جلد ہی معاملے کی تہہ میں اُتر گیا تھا۔ تھکن سے بری حالت تھی لگی۔ لپٹی بات کرنے کا یارانہ تھا۔ بڑی بے زاری سے گویا ہوا تھا۔

بانو آپا نے حق دق ہو کر ثمر کی شکل دیکھی۔ مگر مچھ کے آنسو بہا بہا کر آنکھوں میں خارش ہونے لگی تھی۔ ساری محنت ہی اکارت گئی۔ اس نے تو اُلٹا ماں بہن کو موردِ الزام ٹھہرا دیا تھا۔ دوسری شادی کا ذکر چھوڑ اب تو عزت بچانے کی فکر پڑ گئی تھی۔

''اے بیٹا...... مجھے بھلا کوئی لالچ ہے۔ میں بھی تو تمہارے سکھ اور خوشیوں کے لیے ہی سوچتی ہوں۔ ایک ہی ایک بچہ ہے میرا...... کب تک جھوٹی آس سے دل بہلاتی رہوں۔'' انہوں نے پھر رونے والی شکل بنائی۔ زبردستی کے آنسو بہانا کوئی کھیل تو نہیں۔ جھوٹ بولتے بولتے آنسوؤں کی نالی میں ایسا کارک لگ جاتا ہے جو زور آزمائی سے بھی جگہ نہیں چھوڑتا۔

''میں سمجھتا ہوں امی جان! آپ میری خوشی ہی کے لیے سوچتی ہیں۔ مگر کسی انسان کو اس قصور کی سزا دینا ظلم ہے جو اس نے کیا ہی نہیں۔'' ثمر نے اٹھتے ہوئے بحث سمیٹنے کی کوشش کی۔

اسے احساس تھا کہ کوئی بیڈ روم میں اس کی آہٹوں کا منتظر ہے۔ اپنا کوٹ اور بریف کیس اٹھا کر وہ سوئے منزل چل پڑا۔

بانو آپا کلستی رہ گئیں۔ ایک مرتبہ پھر نشانہ خطا گیا تھا۔

☆......☆......☆

چمن بیڈ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے کوئی تازہ میگزین دیکھ رہی تھی۔ پڑھ نہیں سکتی تھی کہ ذہن تو ثمر کی آہٹوں پر لگا ہوا تھا۔

آخر کار دروازہ کھلا۔ اور اس نے نظر اُٹھا کر اندر آتے ہوئے ثمر کی طرف دیکھا۔ یہ اس کا معمول بن چکا تھا۔ وہ سلام کرتے ہوئے چہرہ پڑھتی تھی اور چند سیکنڈ میں فیصلہ کر لیتی تھی کہ اسے سلام کے بعد کیا بات کرنا چاہیے۔

''اسلام علیکم!'' وہ بستر چھوڑ کر شوہر کی تھکن دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے آگے بڑھی۔

''وعلیکم اسلام!'' ثمر نے بظاہر اچٹتی مگر درحقیقت بہت گہری نظر سے چمن کا چہرہ دیکھا۔

''آج پھر لیٹ ہو گئے۔ فون بھی بند مل رہا تھا۔'' چمن نے کوٹ ثمر کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے، بظاہر محبانہ ڈلار کیے۔

''ہوں...... '' ثمر نے ٹائی کی گرفت سے گردن آزاد کرتے ہوئے ہنکارا ابھرا۔

''آپ فریش ہو جائیں میں کھانا لگاتی ہوں۔'' چمن نے کوٹ ہینگر کرتے ہوئے ثمر کے موڈ کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی نئی اور غیر ضروری بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''کھانا ابھی نہ لگاؤ، گھر میں آتے ہی جیسے بھوک ہی مر گئی۔'' ثمر نے شرٹ اُتار کر صوفے کی طرف اُچھالی اور گرنے کے انداز میں بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹ گیا۔

''خیریت کیا ہوا؟'' چمن اندیشوں کی آندھی میں اُڑنے لگی۔ اتنی سی بات ہی اسے سمجھانے کے لیے بہت تھی کہ ماں سے گزر کر بیوی تک آتے آتے بھوک کیوں مر جاتی ہے؟

اس نے گہری سانس لے کر صوفے سے شرٹ اٹھائی اور ڈریسنگ کی طرف بڑھی۔ ثمر کی بات کے جواب میں اس وقت خاموشی سے بڑی فراست ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے آپ کچھ دیر ریسٹ کر لیں...... جب کہیں گے کھانا لگا دوں گی۔''

اُس نے پُرسکون اور دوستانہ انداز میں اتنا ضرور کہا۔ کیونکہ بعض اوقات خاموشی بھی اعلان جنگ ہوتی ہے۔ اس نے باور کرا دیا تھا کہ وہ ہتھیار زیرِ زمین دبا چکی ہے۔ وہ خاطر جمع رکھے اور طبیعت بحال کرنے کی مشق فرمائے۔

ڈریسنگ میں شرٹ لٹکا کر وہ کمرے سے باہر جانے لگی تو ثمر نے اسے ٹوکا۔

''باہر کیوں جا رہی ہو۔ کام ختم نہیں ہوئے؟'' چمن نے پلٹ کر ثمر کی طرف دیکھا۔

''آپ کی تھکن دیکھ کر سوچا شاید آپ کچھ لائٹ لینا پسند کریں۔ سوپ بنا لیتی ہوں۔'' چمن نے اسی طرح صلح جو انداز میں جواب دیا۔

''رہنے دو...... جو بنایا ہے وہی کھا لوں گا۔ بس ذرا میری ایک بات سن لو۔'' ثمر کا لہجہ بولتے بولتے نامہرباں ہو گیا۔

''جی...... کہیے۔'' چمن نے قریب آ کر غور سے ثمر کا چہرہ دیکھا۔

''دیکھو امی جان کی عمر ایسی نہیں کہ میں ٹیچر بن کر ان کو لیکچر دینا شروع کر دوں۔ ان کو تو نہیں بدل سکتا، مگر تم تو مجھ پر رحم کر سکتی ہو۔ ہزار مرتبہ کہا ہے کہ امی جان کو جواب مت دیا کرو۔ وہ دل پر لے لیتی ہیں اور ماں کے آنسو برداشت کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر دُکھ سے ٹوٹنے لگتا ہوں۔''

چمن کے لیے یہ الفاظ کوئی انکشاف یا نئی خبر نہیں تھے۔ اسے کبھی بھی یہ خوش فہمی نہیں رہی تھی کہ ثمر ماں سے گزر کر مسکراتا ہوا اس کے پاس آئے گا۔

''میں جواب دینے میں کبھی جلدی نہیں کرتی۔ مگر انسان ہی ہوں۔ خیر میں اس وقت آپ سے بحث نہیں کروں گی۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گی اگر آپ ماں کی خوشی پوری کر سکتے ہیں تو دیر نہ کریں۔'' یہ کہہ کر چمن رُکی نہیں فوراً کمرے سے نکل گئی۔ اس کے قدموں کا رُخ گیسٹ روم کی طرف تھا جو بہر حال اس کے لیے ایک پناہ گاہ کا کام دیتا تھا۔

جاتے ہوئے اس نے دروازہ آہستگی سے بند کر دیا تھا۔

ثمر نے انگلیوں سے اپنی پیشانی کو دبانا شروع کر دیا۔ خوش حالی، آرام دہ گھر، سواری خوبصورت سمجھدار بیوی، پھر بھی سر میں درد کی ٹیسیں...... خوشی کا کوئی فارمولہ نہیں ہوتا ورنہ وہ گھر بیچ کر بھی خرید لیتا۔

☆......☆......☆

اب اتنے دنوں بعد کھانا بنایا ہے پتا نہیں کیسا بنا ہوگا۔ فردوس سالن کا ڈونگہ کناروں سے پکڑے ڈائننگ میں داخل ہوئی اور پٹخنے کے انداز میں رکھ دیا۔ حامد حسین جو ابھی تک اچھے بچے بنے سر جھکائے کھانا لگنے کے منتظر بیٹھے تھے۔ بیگم کے لب و لہجے پر چونک پڑے۔ اور غور سے لاڈلی بیگم کا چہرہ دیکھا۔ بیگم کی تکلیف کے خیال سے بڑا قلق ہوا۔ بہت آرام سے گویا ہوئے۔

''اس کے ساتھ چاول بنائے ہیں یا روٹی۔'' وہ سالن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بھوک غضب کی تھی۔ روزانہ آٹھ بجے کھانا کھا لیتے تھے۔ آج رات کے دس بج گئے تھے۔

''بھئی اس عمر میں مجھ سے اتنا کام نہیں ہوتا۔ پہلے تو سوچا کہ روٹی بازار سے منگوالوں پھر خیال آیا بیس روپے کی روٹی کے لیے پچاس روپے کا پیٹرول پھونکیں گے جیسے تیسے دو چار روٹیاں بنالیں۔'' فردوس نے آنچل سے چہرہ پونچھتے ہوئے بڑی بے زاری سے کہا تھا۔

''سلاد نہیں بنایا؟'' حامد حسین نے مدت بعد اتنی بے رونق ٹیبل دیکھی تھی۔ یونہی منہ سے نکل گیا۔

''شکر کریں کھانا مل رہا ہے۔ اب یہ چونچلے نہیں چلیں گے۔ مجھ اکیلی کو سارے گھر کا کام کرنا پڑتا ہے۔ خود کو تو اخبار چاٹنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔'' کچن میں جو تپش روم روم میں اُتر گئی تھی وہ ساری کی ساری حامد حسین پر اُلٹ دی۔

''ماسی صفائی کرتی ہے۔ برتن اور کپڑے دھونے دوسری ماسی آتی ہے۔ استری کلو ڈرائیور کی بیوی آ کر کر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کون سے کام باقی رہ جاتے ہیں؟'' حامد حسین کو شاندار ڈنر کرنے کی پکی عادت پڑ چکی تھی۔ دو سالن، روٹی، سادہ چاول، سلاد، میٹھا...... کیا سجی ہوئی میز ملتی تھی۔ اور آج ایک سالن دو روٹی اور ٹھنڈے پانی کی بوتل۔

''کبھار پر بس نہ چلا تو گدھے کے کان اینٹھ دیے۔ واہ...... ایک تو وقت پر کھانا بنا کر دیا ہے، اوپر سے مجھ پر ہی گرم ہو رہے ہیں۔'' فردوس نے علی علی کرتے حامد حسین پر چڑھائی کر دی۔

''بھئی میں تو اس لیے کہہ رہا ہوں کہ خود پر ترس نہ کھاؤ۔ اللہ کا شکر ادا کرو۔ دنیا کی عورتیں صبح سے رات تک کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتی رہتی ہیں۔ تمہیں تو ہر طرح کی سہولت حاصل ہے۔ دو بندوں کا

کھانا بنانا کون سا مشکل کام ہے۔'' حامد حسین کھانے پر کمپرومائز نہیں کر سکتے تھے۔ خوش خوراک تھے۔ سیر شکم ہو کر کھانا کھاتے تھے۔ اچھا کھانا ان کے خوشگوار موڈ کی حتمی ضمانت تھا...... بھرے پیٹ کے ساتھ بیگم بھی ہر وقت چوتھی کی دلہن دکھائی دیتی تھیں۔

''وقت وقت کی بات ہوتی ہے حامد حسین صاحب۔ ہم نے بھی آپ کے گھر میں آ کر کولہو کے بیل کی طرح کام کیا ہے۔ آپ کی اماں جان ایک منٹ سکون سے بیٹھنے نہیں دیتی تھیں۔ سارے کام ختم کر کے ذرا کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گئے تو آ جاتی تھیں۔ دال چاول کا تھال لے کر۔ لو بہو بیگم بے وقت لیٹنے کی ضرورت نہیں...... دال چاول الگ الگ کرو۔

'بہو بیٹی کو دن کے وقت بستر پر نہیں لیٹنا چاہیے۔ دن میں تو مریض بستر پر لیٹتے ہیں۔'

فردوس کو تلخ یادوں نے زہریلا کر دیا۔

''تو پھر تم نے بھی تو اماں جان سے یہی کچھ سیکھا اور بہو سے خوب خدمتیں لیں۔'' حامد حسین پتلا پانی شوربہ پلیٹ میں احتیاط سے ڈالتے ہوئے بولے۔ جس میں سے بدقت تمام ایک بوٹی حسبِ پسند ڈھونڈ نکالی تھی۔ وگرنہ گھوم پھر کر آلو کا ٹکڑا ہی بار بار چمچ میں آ رہا تھا۔ اِس صورتِ حال میں تو وہ سامنے کھڑے معصوم فرشتے سے بھی سیدھے منہ بات نہ کرتے۔

''میں نے جس طرح اپنی بہو کو رکھا کوئی ساس رکھ کر تو دکھائے۔ وہ تو نمک حرام ہے قدر نہیں کی میری۔''

''اچھا...... اب مجھے کھانا زہر مار کرنے دو۔ نام مت لو اس کا۔''

''مجھے کوئی شوق نہیں اس کا نام لینے کا۔ کوئی کچھ کہتا ہے تو جواب بھی سنتا ہے۔'' فردوس تنک کر بولی۔

''اچھا...... اب یہ ڈھب ڈھب قلیا بنا کر رکھ دیا ہے۔ خود بھی تو تناول فرماؤ۔ کیا بھوکی سوؤ گی۔'' حامد حسین کوشش کے باوجود طنز کرنے سے باز نہ رہ سکے۔

''اب تو یہی ڈھب ڈھب قلیا کھانا پڑے گا۔ دس ڈشیں سامنے رکھنے کا شوق ہے تو کوئی خانساماں رکھ لیں۔ میں جا رہی ہوں سونے۔'' فردوس کرسی دھکیل کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔'' اب جذباتی بلیک میلنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

حامد حسین تو یہ سن کر جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ بیگم ساری رات بھوکی سوئے گی تو اِس رات کی صبح کیسی ہو گی۔ دماغ کا درجۂ حرارت رگوں میں دوڑنے لگا۔ بخار سا چڑھنے لگا۔ فردوس جا چکی تھی۔ حامد حسین نے بچی ہوئی آدھی روٹی ہاٹ پاٹ میں رکھ دی اور خود بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اب دوسری لوکیشن یعنی بیڈروم میں شوٹ چلنا تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ رات کالی ہو رہی ہے۔

☆......☆......☆

بانو آپا کچن میں ایک ایک کیبنٹ کھول کر جانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔ کھٹاک پٹاخ کی آوازیں سُن کر چمن کچن میں چلی آئی۔

''کیا ڈھونڈ رہی ہیں امی جان؟'' اس نے بہت مہارت سے لب و لہجہ کنٹرول کر کے بڑے دوستانہ انداز میں پوچھا تھا۔

''ارے بلڈ پریشر کی گولیاں جانے کہاں رکھ کر بھول گئی۔ وہی ڈھونڈ رہی ہوں۔'' بانو آپا نے بہو کے دوستانہ لب و لہجے کو محسوس کر کے خود بھی بڑی رسانیت سے جواب دیا۔

''فریج میں بہت سی ٹیبلیٹس پڑی ہیں۔ دیکھ لیں شاید ان میں مل جائیں۔'' چمن نے راہ سمجھائی۔

''اے بیٹا فریج میں دیکھ کر ہی تو اِدھر ڈھونڈ رہی ہوں۔ خیر دن چڑھ جائے تو جا کر لے آؤں گی۔ ایک تو بازار بھی گیارہ بجے سے پہلے نہیں کھلتے۔'' انہوں نے کمال مہربان لہجے میں جواب دیا تو چمن نے سکون کا سانس لیا کہ شکر ہے آج صبح صبح ساس کا موڈ تو اچھا ہے، اس کے باوجود کہ بلڈ پریشر کی گولی نہیں کھائی۔

چمن سر جھکا کر کلمۂ شکر ادا کرتی کچن سے جانے لگی۔ مگر بانو آپا کی آواز قدموں کی زنجیر بن گئی۔

''بیٹا...... ایک منٹ ذرا میری بات تو سنو۔''

چمن نے پلٹ کر بڑی حیرت سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ غیر معمولی شیریں لہجہ، چمن تو ایک انجانے سے خوف میں مبتلا ہونے لگی۔

''جی امی......'' وہ ان کے قریب چلی آئی۔

''دیکھو بیٹا! میں ماں ہوں۔ مجھے ہر وقت فکر رہتی ہے۔ کیونکہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اولاد نہ ہوئی تو ہمارا نام و نشان مٹ جائے گا۔ مجھے تم پر سوت لادنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں تو اولاد کی خاطر ہی یہ سب کچھ سوچتی ہوں۔''

''جی امی...... مجھے احساس ہے۔ مگر ہمارے اختیار میں تو کچھ نہیں ہے۔ اللہ کی مرضی۔'' چمن بانو آپا کے شیریں و شہد لہجے سے بہلنے لگی۔ ان کا انداز ہی ایسا تھا جیسے آج سے پہلے کبھی ساس بہو کی تلخ کلامی ہی نہ ہوئی ہو۔

''تم صرف ایک بار میرے ساتھ شاہ صاحب کے آستانے چلو۔ اللہ والوں کی بعض اوقات ایک نظر ہی مقدر بدل دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ایک مرتبہ اپنی بہو کو لے آؤ۔ دم بھی کروں گا اور تعویذ بھی دوں گا۔ اکتالیس دن کا علاج ہے۔ اللہ نے چاہا تو بہت جلد گود ہری ہو جائے گی۔'' بانو آپا نے بہو کو موم کی طرح نرم پایا تو مارے دلار کے سر پر ہاتھ بھی پھیر دیا۔

چمن کی جان جل کر رہ گئی۔ گھوم پھر کر پھر وہی بات۔

''امی جان...... میں آپ کو صاف صاف کہہ چکی ہوں میں جگہ جگہ بیٹھے ہوئے پیر فقیروں کو نہیں مانتی...... ان لوگوں نے پیسے بٹورنے کے لیے یہ دکانیں سجائی ہوئی ہیں۔'' چمن نے ہر صورت اپنا لہجہ کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کی۔

''ارے نہیں مانتیں تو کم از کم زبان تو قابو میں رکھو۔ اللہ والوں کی شان میں کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔''

بانو آپا پھر اپنی اصل بنیاد پر آ گئیں اور کڑے تیور سے چمن کو گھورا۔

''فرض نماز ادا نہ کریں۔ حقوق العباد پورے نہ کریں تب تو ہمیں مصیبت نازل ہونے کا ڈر نہیں ہوتا۔''

"اچھا...... بس۔ چپ کر جاؤ۔ کیسی کترکتر زبان چلتی ہے۔ یہی سکھایا ہے ماں نے۔ جو اللہ والوں کی عزت کرنا نہ سکھائے، آگ لگے ایسی پڑھائی کو۔" بانو آپا پھٹ پڑیں۔

"اسی پڑھائی نے تو بتایا ہے کہ اولاد نہ ہونے کی ذمہ داری صرف عورت پر نہیں آتی۔ مرد میں بعض اوقات کوئی پرابلم ہو سکتی ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر میاں بیوی دونوں کو ٹیسٹ کرانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ میں تو ٹیسٹ کرا چکی ہوں، رپورٹس کلیئر ہیں۔ کوئی پرابلم نہیں ہے۔ آپ ثمر کو کہیں وہ بھی اپنا ٹیسٹ کرالیں۔ تاکہ یہ معاملہ ایک طرف ہو جائے۔" چمن اپنی رو میں بولتی چلی گئی۔

بانو آپا نے پھر وہی بات چھیڑی تھی یعنی اپنے شاہ صاحب کی...... جس کو سنتے ہی چمن کا ذہن ماؤف ہو جاتا تھا۔ بانو آپا سکتے کی کیفیت میں چمن کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ یوں جیسے ان کے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا ہو۔

"بدزبان...... بے حیا...... اپنے شوہر کو گالی دے رہی ہے؟" بالآخر وہ برداشت کی آخری حد کراس کر گئیں۔

"میرے بیٹے پر الزام لگا رہی ہے۔ میں ماں ہوں۔ میں جانتی ہوں میرا بیٹا بالکل صحت مند اور ٹھیک ہے۔ اپنا عیب چھپانے کے لیے مرد کو ذلیل کر رہی ہے؟"

"آپ ٹھنڈے دماغ سے میری بات پر توجہ دیں۔ یہ میں نہیں کہہ رہی، میڈیکل سائنس کہہ رہی ہے۔ آج کل سب پڑھے لکھے لوگوں کو یہ بات پتا ہے۔ میں نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کی۔"

بانو آپا کا سراپا شعلہ ہونا بہت بڑے خطرے کی گھنٹی تھی۔ اب چمن کا ہی کام تھا کہ وہ واپس اس جگہ لا کر کھڑا کرے جہاں وہ کچھ دیر پہلے تھیں۔

"منہ بند کرو...... ارے تمہارے یہ ڈاکٹر اتنے قابل ہیں تو دنیا میں لاکھوں لوگ بے اولاد کیوں نظر آتے ہیں؟" بانو آپا بھڑک کر بولیں۔

"یہی تو میں آپ کو بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ عورت یا مرد میں کوئی کمی کسر ہو تو علاج ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے ہاں علاج کے بعد اولاد ہو جاتی ہے۔"

"بکواس بند کرو اور جا کر اپنی مکار ماں کے چرن چھوؤ۔ میں ثمر کی دوسری بیوی لے کر آتی ہوں اور تمہیں دکھاتی ہوں کہ اس آنگن میں بچے کیسے کھیلتے ہیں۔ بے حیا، بے شرم، توبہ توبہ، پانچ سال سے جس سے نان نفقہ لے رہی ہے اسی کو بے عزت کر رہی ہے۔

پانچ سال سے حرام لقمہ توڑ رہی ہے اس گھر میں...... توبہ توبہ...... استغفراللہ۔"

بانو آپا پاؤں پٹختی کچن سے چلی گئی تھیں۔ مگر چمن لب بستہ کھڑی تھی۔

☆......☆......☆

"آج صبح صبح تمہارا منہ گیس والے غبارے کی طرح کیوں پھولا ہوا ہے؟" عمیر اپنے کام میں بڑی تندہی سے مصروف تھا۔ بری طرح چونک پڑا۔ ندا اس کے سر پر کھڑی تھی۔

"کام کرنے دو۔ آج بہت کام ہے۔ تم بھی خود کو یاد دلاؤ کہ یہاں کام کرنے آتی ہو۔ لوگوں کے Face چیک کرنے نہیں۔" عمیر نے ٹکا سا جواب دے کر کی بورڈ پر انگلیاں چلانا شروع کر دیں۔

''شارق اوپر اکاؤنٹ میں گیا تھا، جا کر ہی بیٹھ گیا۔ کم از کم سیدھے منہ بات تو کر لیتا ہے۔ تم تو ہر وقت Boss بننے کی ناکام ٹرائی کرتے رہتے ہو۔'' ندا منہ بنا کر اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔

''ابھی باس تمہیں کال کریں گے پھر تمہاری شکل دیکھوں گا۔ مجھے تو تمہارے قریب بیٹھتے ہوئے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔'' عمیر نے کام چھوڑ کر اپنے دونوں کان چھونے کی مہلت نکال ہی لی۔

''کیوں؟ میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔'' ندا بھڑک اٹھی۔ عمیر نے اس کی زبردست توہین جو کی تھی۔

''سینگ والوں کو تو میں آسانی سے قابو کر سکتا ہوں...... مگر تم ان سے بھی اوپر کوئی شے ہو۔'' عمیر نے چڑ کر کہا تھا۔

''دیکھو تم میری مسلسل انسلٹ کر رہے ہو۔ میں اس سے زیادہ کر سکتی ہوں فی الحال وارننگ دے رہی ہوں۔ سنبھل جاؤ ورنہ تمہیں ایک مزیدار واقعہ سننا پڑے گا۔'' ندا نے انگلی اٹھا کر دھمکاتے ہوئے کہا۔

''یار...... سر آ چکے ہیں۔ آج آفس میں سب سے پہلے وہی آئے ہیں۔ کسی بھی وقت بلا سکتے ہیں۔ کام تو ابھی شروع کیا ہے بلا لیا تو کیا منہ لے کر جاؤں گا؟'' عمیر اسی انداز میں چڑ کر بڑبڑا رہا تھا۔

''ابھی جا کر پتا کرتی ہوں اتنا جلدی آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کولیگز کو اتنا زیادہ اسٹریس دیں گے تو سب بھاگ جائیں گے۔'' ندا نے اپنی دانست میں بڑی طرم خانی جھاڑی۔

''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں تم نہیں بھاگو گی۔'' عمیر دانت پیستے ہوئے پرنٹر کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیوں؟ مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟'' ندا نے بڑی ادا سے گردن اکڑا کر سوال کیا تھا۔ اسے گمان تھا کہ عمیر نے اس کی تعریف کی ہے۔

''تم ایک نمبر کی ڈھیٹ ہو۔ جتنی جھاڑیں تم کھا چکی ہو کسی اور کو پڑتیں تو وہ مارے غیرت کے ریزائن کر کے چلا جاتا۔'' عمیر نے عجلت کے انداز میں وجوہات بتائیں۔ نظریں ہنوز مانیٹر پر جمی ہوئی تھیں۔ ندا کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

''تم مجھ سے جیلس ہو۔ ایسے لوگوں کو ڈھیٹ نہیں ارادے کا پکا کہتے ہیں۔ جو کہتے ہیں کر کے دکھاتے ہیں۔ صبح سے رات تک نانا جان کی جھاڑیں سن سکتی ہوں تو کیا باس کی نہیں سن سکتی؟ باس کی جھاڑیں کھانے کے تو پیسے ملتے ہیں۔ نانا جان تو فری میں جھاڑتے ہیں۔ تو کیا گھر چھوڑ کر چلی جاؤں؟''

ندا نے سسٹم آن کرتے ہوئے بمشکل کام کا موڈ بنایا اور خفا خفا لہجے میں گویا ہوئی اور ایک منٹ میں چار مرتبہ گھور گھور کر عمیر کی طرف دیکھا۔

''پھر ٹھیک ہے۔ گزارا ہو جائے گا۔'' عمیر نے پرنٹر سے پیپر کھینچتے ہوئے اب نارمل لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب......؟'' ندا کچھ سمجھی نہیں۔

''تمہیں جھاڑیں کھانے کی پرانی عادت ہے۔ گھر سے پریکٹس کر کے آ رہی ہو۔'' عمیر نے پیپر فائل میں رکھتے ہوئے اتنی دیر میں پہلی بار ندا کی طرف دیکھا تھا۔ اسی وقت انٹر کام پر Ring ہوئی تھی جو دونوں کی ٹیبلز کے درمیان رکھا تھا۔

''تم اٹھاؤ...... تمہیں ہی بلایا ہوگا۔'' ندا نے دونوں ہاتھ یوں پیچھے کر کے کہا جیسے عمیر زبردستی ریسیور

اس کے ہاتھ میں تھما دے گا۔
عمیر نے گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا اور ریسیور اٹھالیا۔ ندا خوفزدہ ہرنی کی طرح عمیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔
''جی سر...... اپنی ٹیبل پر ہیں کام کر رہی ہیں۔'' عمیر نے ماؤتھ پیس میں کہا تو ندا کو یقین ہو گیا کہ ثمر ہی نے Ring دی ہے۔ جلدی سے Mouse لے کر یوں چلانے لگی جیسے دیر سے کام میں لگی ہوئی ہو۔
''جاؤ! بلاوا ہے۔'' عمیر نے ریسیور رکھتے ہوئے آنکھوں سے روانگی کا اشارہ کیا۔
''ہائے اللہ! خود صبح سے آئے بیٹھے ہیں۔ ہم تو ابھی آئے ہیں۔ سسٹم آن کیا ہے۔ یہ پھونک مارنے سے تو آن نہیں ہوتا۔'' ندا نے بڑی حواس باختہ سی ہو کر کہا تھا۔ عمیر مسکراہٹ چھپانے کی کوشش میں اتنا جھک گیا گویا سجدے میں جا رہا ہو۔ یا سجدۂ شکر بجا لا رہا ہو۔

☆......☆......☆

چمن ابھی تک کچن سے باہر نہیں آئی تھی۔ وہیں درمیان میں رکھی چھوٹی راؤنڈ ڈائننگ ٹیبل کی Chair پر بیٹھ گئی تھی۔ ذہن بالکل سُن ہو رہا تھا۔ لاشعوری طور پر رات کی بند کمرے میں جنگ کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔
ثمر یہ کہے گا...... پھر میں یوں کہوں گی...... اگر اس نے وہ کہا تو میں بھی یہ جواب دوں گی...... ایک زور دار لڑائی ہو گی...... پھر...... پھر کیا ہو گا؟ اس سے آگے سوچ جواب دے جاتی تھی۔
معاً اس نے گیٹ پر گاڑی کے ہارن کی آواز سنی۔ کچن کی بڑی سی کھڑکی باہر لان میں کھلتی تھی جو پورچ سے ملحق تھا۔
دل زور سے اچھلا۔ ہائیں...... کیا ثمر آفس سے واپس آ گیا ہے؟ مگر فوراً ہی اس نے لاؤنج میں بانو آپا کے قدموں کی آواز سنی۔
اوہ...... بات سمجھ آ گئی...... بانو آپا نے صبح جاتے ہوئے ثمر کو گاڑی بھیجنے کا بولا ہو گا اس لیے اس نے جاتے ہی بھجوا دی تھی۔
جب بھی بانو آپا کو بیٹی کے گھر یا میڈیکل چیک اپ کے لیے جانا ہوتا تھا۔ وہ ثمر کو جاتے ہوئے بول دیتی تھیں۔ جاتی تو وہ پتا نہیں کہاں کہاں تھیں۔ اکثر ان کی بہت قدیم تاریخی قسم کی سہیلیاں گھر آتی تھیں۔ تو پتا چلتا تھا کہ وہ بھی اکثر و بیشتر ان کے گھروں میں جاتی ہیں۔ مگر ثمر سے وہ دو ہی جگہوں کی بات کرتی تھیں یا تو افشاں کے گھر گئے بہت دن ہو گئے ہوتے یا پھر ان کو کسی نئی یا پرانی میڈیکل پرابلم نے ستایا ہوتا تھا۔

گاڑی کے دروازوں کی کھٹا کھٹ کے بعد گاڑی روانہ ہونے کی آواز آئی۔ چمن نے سانس لیا تو خود ہی حیران ہوئی کہ اتنی دیر سے کیا سانس روک کر بیٹھی ہوئی تھی؟ کھل کر سانس لیا تو زندگی پھول کی طرح ہلکی لگی۔ اس سے پیشتر کہ وہ کچن سے باہر نکلتی صفائی کرنے والی ماسی نے سر اندر کر کے جھانکا غالباً وہ چمن کو تلاش کر رہی تھی اور اسی وقت گھر میں آئی تھی۔ جس وقت بانو آپا گھر سے نکلی تھیں۔
''سلام بھابی!'' ماسیوں میں گھر کی بہوؤں کو بھابی کہنے کا عام رواج ہوتا ہے۔

''وعلیکم السلام زرینہ ایسا کرو، تم پہلے امی جان کے بیڈروم کی صفائی کرلو، میں آرہی ہوں۔'' وہ اب بھرپور طریقے سے ماحول میں 'IN' ہوگئی۔

''جلدی آجائیں بھابی! مجھے آپا جی کے کمرے میں اکیلے کام کرتے بہت ڈر لگتا ہے۔ کوئی چیز ادھر اُدھر ہوگئی تو میرا نام آئے گا۔''

زرینہ کئی سالوں سے آرہی تھی اور گھر کے مکینوں کے مزاج سے بخوبی آگاہ تھی۔ بانو آپا ماسی کے سرپر کھڑی ہوکر صفائی کراتی تھیں اور ان کی غیر موجودگی میں یہ ڈیوٹی چمن کے سر لگتی تھی۔

''ہاں ہاں...... تم چلوتو سہی میں دومنٹ میں آتی ہوں۔'' چمن کو تو اس سیدھی سادھی ماسی پر پورا اعتماد تھا مگر قسم کھانے کے لیے ساتھ جانا تو تھا۔ وہ چیزیں اپنی جگہ ٹکا کر کچن سے باہر آئی تو اکیلے گھر میں ایک عجیب سے سُکھ کو دورہ کرتے پایا تو انکشاف ہوا۔ کبھی کبھی صرف ایک انسان کی وجہ سے گھر کتنا نامانوس اور بھاری لگتا ہے۔

کبھی زمین پاؤں تلے ہلتی ہے۔ کبھی چھت سر پر آرہی ہوتی ہے۔

آج تو دن کا اُجالا بھی اور دنوں کی نسبت زیادہ چمکیلا محسوس ہورہا تھا۔

گویا سورج Re Charge ہوکر طلوع ہوا ہو۔ باطنی کیفیت کا اپنا طلسم ہوتا ہے۔

زرینہ اٹھا پٹخ کھسڑ پھسڑ میں لگ چکی تھی جب وہ بانو آپا کے کمرے میں داخل ہوئی۔ زرینہ سائیڈ ٹیبل کھسکا کر کھڑا جھاڑو چلا رہی تھی۔ جیسے کوئی چیز جھاڑو کے ساتھ اٹک رہی ہو۔ زرینہ نے ٹیبل کو تھوڑا اور آگے کھسکا کر جھاڑو چلائی تو ایک پلاسٹک کی تہہ شدہ تھیلی سامنے آگئی۔ زرینہ سے پہلے چمن نے ہاتھ بڑھا کر وہ تھیلی اٹھالی۔ تھیلی کی تہیں کھولیں تو پتا چلا ایک اخباری کاغذ کی پڑیا ہے۔ جسے دیکھ کر چمن کے دل میں یہی خیال آیا کہ ہوگی کوئی پسی ہوئی جڑی بوٹی...... کسی حاذق زندہ یا مرحوم حکیم کا نسخہ......

زرینہ پر کام کی عجلت سوار تھی جو عام طور پر ماسیوں کی عادتِ ثانیہ ہوتی ہے۔ وہ جھاڑو لگانے میں جتی ہوئی تھی۔ اس نے اس تھیلی کو چنداں درخوراعتناء نہ جانا تھا۔

ایسے نوادرات تو سامان کھسکانے سے مل ہی جاتے ہیں۔

چمن نے پڑیا نکالی تو اسے محسوس ہوا کہ پڑیا میں کوئی نرم نرم سی چیز ہے۔

ایک انوکھا سا احساسِ تجسس دل میں انگڑائیاں لینے لگا۔ پڑیا کی دبازت و نرمی اپنی نوعیت کی منفرد شے تھی۔ اس نے زرینہ کی طرف دیکھا جو اب بیٹھ کر بیڈ کے نیچے لمبے لمبے ہاتھ کر کے جھاڑو دے رہی تھی۔ بانو آپا کو مسلسل کھانسی رہنے لگی تو ڈاکٹر کے مشورے پر ان کے کمرے سے کارپٹ ہٹا دیا گیا تھا روز جھاڑو پونچھا لگتا تھا۔ کرٹن بھی اتار دیے گئے تھے۔ ان کی جگہ بلائنڈز لگ چکے تھے۔ اسی لیے زرینہ کا سب سے زیادہ کام اسی کمرے میں ہوتا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنی اُجرت میں تین سو روپے کا اضافہ بھی کروا چکی تھی۔

پڑیا کھولتے ہی چمن کو زور سے جھٹکا لگا تھا۔ پڑیا میں تو اس کے اپنے کٹے ہوئے بال تھے۔ اخباری کاغذ میں اس کے پسندیدہ شیمپو کی خوشبو تک جذب ہو چکی تھی۔

اس نے بے اختیار، لاشعوری طور پر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ جانے کتنی مرتبہ پارلر میں بالوں کی تراش خراش کا عمل وقوع پذیر ہوا تھا۔ بال کٹ کٹ کر اس کی گود میں بھی گرتے تھے۔ ایک یقین واثق اس

کی روح میں اترنے لگا۔ یہ تو اس کے بال ہیں۔ بانو آپا تو بالوں کو بلیک ڈائی کرتی تھیں۔ یہ شیمپئن براؤن کلر تو اسی کے بالوں کا ہے...... معاً کاغذ کی پڑیا اس کے ہاتھوں میں کانپنے لگی۔

یہ بال کب کٹے؟ کب اس پڑیا میں لپٹے...... اور کیوں؟

معاً ایک خیال چمک کی صورت اس کے ذہن میں اترا۔ یہ اتنا بڑا ثبوت خود بخود اس کے ہاتھ آ گیا ہے۔ ثمر کو ضرور دکھانا چاہیے تاکہ اس کو بھی پتا چلے کہ اس کی ماں کن چکروں میں لگی رہتی ہے۔ کیونکہ جب وہ اپنی سی کرنے پر آتی ہیں تو اس کو اپنا دفاع کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ کچھ نہ کر کے بھی مجرم بن جاتی ہے۔ کئی کئی دن ثمر کا موڈ خراب رہتا ہے۔ زندگی بوجھ لگنے لگتی ہے۔

اُس کے انگ انگ میں توانائیاں دورہ کرنے لگیں۔ آج کے بعد بانو آپا کے ترکش کا کوئی تیر اسے زخم نہیں دے گا۔ زرینہ اپنے کام میں تندہی سے مصروف تھی۔ اس کی جانے بلا کہ چمن کھڑے کون کون سے قضیے نمٹا رہی ہے۔

☆......☆......☆

''تھینک گاڈ آپ کی پرفارمنس بہتر ہو رہی ہے۔'' ثمر ندا کے ٹائپ کیے ہوئے پیپرز دیکھتے ہوئے گویا سکون کا سانس بھی لے رہا تھا۔

''وہ تو ہونا ہی تھی سر! نانا جان کہتے ہیں بچہ یا تو ڈر سے پڑھتا ہے یا شوق سے۔''

''آپ بچی ہیں؟ پڑھ رہی ہیں ابھی؟'' ثمر کا موڈ پھر خراب ہونے لگا۔

''نہیں نہیں سر! میں تو آپ کو یہ سمجھانا چاہ رہی ہوں......''

''آپ مجھے سمجھائیں گی؟'' ثمر نے اس کی بات کاٹ کر کڑے تیور سے گھورا۔

''سر آپ سنیں تو سہی، میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ آپ سے اتنا ڈر لگتا ہے کہ ڈر کے مارے کام خود بخود صحیح ہو جاتا ہے۔'' ندا نے تھراتے ہوئے اپنی بات بالآخر مکمل کر ہی دی۔

''کیوں ڈرتی ہیں آپ...... میرے سر پر سینگ نکلے ہوئے ہیں یا ہاتھی کی طرح دکھانے والے دو دانت باہر لٹکے ہوئے ہیں۔ اگر آپ صرف اپنے کام پر توجہ دیں تو کبھی کسی سے ڈر نہیں لگے گا۔ سمجھیں؟''

ثمر نے اب اس کی حالت سے حظ اٹھاتے ہوئے ڈپٹ کر کہا تھا۔ پہلی بار وہ بہت اچھا کام کر کے لائی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ اس میں کام کرنے کی اہلیت بدرجہ اتم موجود ہے، صرف اپنی لاابالی طبیعت کی وجہ سے کام کو سیریس نہیں لیتی۔

''سر آپ کو اتنا غصہ کیوں آتا ہے۔ کیا آپ کو اپنے گھر میں کوئی سیریس پرابلم ہے۔'' ندا نے کانپتے لرزتے دل کے ساتھ وہ بھی کہہ دیا جو کوئی اور کہنے کی ہمت تو درکنار کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

ثمر پر کوئی بجلی گری تھی۔ کڑکڑاتی ہوئی۔ جیسے کوئی نیزہ اڑتا ہوا دل میں ترازو ہو جائے۔

ایک لمحے کے لیے تو وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ ندا سے کیا بات کر رہا تھا۔ پلکیں جھپکنا ہی بھول گیا تھا۔ ثمر کا یوں ایک ٹک اس کی سمت دیکھنا تو گویا ظہور پذیر قیامت میں ایک اور دھماکے کا الارم تھا۔

''میں...... باقی کا کام کمپلیٹ کر کے لاتی ہوں۔ Peon سے کہتی ہوں آپ کو ایک گلاس ٹھنڈا پانی اور گرم چائے دے۔ سوری سر منہ سے نکل گیا ورنہ میں تو کسی کو کچھ بھی نہیں کہتی۔ کبھی بھی پرسنل نہیں ہوتی۔

نانا جان بہت ڈانٹتے ہیں۔'' وہ پیپرز لے کر جواب کا انتظار کیے بغیر وہاں سے پھوٹ لی۔

وہ کمرے سے جا چکی تھی۔ ثمر ابھی تک کسی حیرت کدے میں سیر کناں تھا۔ بے وقوف لوگ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں۔ جو دل میں ہوتا ہے پھوٹ دیتے ہیں۔ ہمیں دل کی بھڑاس نکالنا ہو تو دو دو دن جنگی مشقیں کرتے ہیں۔

لاحول ولا قوۃ۔'' ثمر سر جھٹک کر اپنی حالیہ کیفیت سے پیچھا چھڑانے کے لیے بار بار سر جھٹک رہا تھا۔

☆......☆......☆

چمن نے جیسے تیسے موڈ بنا کر لنچ تیار کر ہی لیا تھا۔ اندر سے دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ آج دو لیٹر پانی میں پچاس گرام چنے کی دال پکائے اور خمیرے آٹے کے پھلکے بنا کر ساس کو کھلائے۔

مگر وہ ثمر کے آنے سے پہلے کسی نئی قیامت کو دعوت نہیں دینا چاہتی تھی۔ اسے لنچ تیار ہی کرنا نہیں ہوتا تھا ٹیبل سجا کر ساس کو تشریف لانے کی درخواست بھی کرنا ہوتی تھی۔

وہ کام سے فارغ ہو گئی تھی۔ ابھی اُدھیڑ بن میں تھی کہ اپنے کمرے میں جائے یا بانو آپا کا انتظار کرے کہ باہر گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے سکون کا سانس لیا کہ اب ساس کے سامنے دستر خوان 'چن' کر ہی اپنے کمرے میں جائے گی۔ آج اسے کمرے میں جانے کی جلدی اس لیے بھی تھی کہ ایمن کو فون کر کے اس کی خیر خیریت پتا کرنا تھی۔ اس کی طبیعت سیکنڈ میں بگڑ جاتی تھی جس کی وجہ سے چمن کو ہر وقت اندیشے ستاتے تھے۔

بانو آپا غبارے کی طرح منہ پھلائے لاؤنج میں داخل ہوئیں اور چمن کی طرف یوں دیکھا جیسے دشمن پر حملہ کرنے سے پہلے اس کی طاقت وصلاحیت کو تولا جاتا ہے۔

''اسلام علیکم! کھانا تیار ہے، لگا دوں۔'' یہ چمن ہی جانتی تھی کہ وہ اس وقت کس دل سے ساس سے مخاطب تھی۔ اس نے سلام کر کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا تھا اور کل کی گڑیا کی طرح متحرک ہو گئی تھی۔

''ارے میں نے کون سا دعوت کھانی ہوتی ہے۔ آدھی روٹی پیٹ میں ڈالنا ہوتی ہے میرے لیے اتنے جتن مت کیا کرو۔ مفت کا احسان۔'' بانو آپا نے ٹھیکرے توڑے۔ خلاف معمول ان کے انداز پر نہ چمن کا دل دھڑکا، نہ اعصاب بوجھل ہوئے۔ اس نے بڑی تولتی ہوئی نظروں سے بانو آپا کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

''یہ کام تو روز ہوتا ہے آج پہلی مرتبہ تو نہیں ہوا۔ آپ اسی ٹائم لنچ کرتی ہیں۔''

''اچھا بی بی میرے منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔'' بانو آپا متجسس نظریں دور دور تک دوڑا رہی تھیں۔ اس وقت تو ان کا دل چاہ رہا تھا کہ ایک ماچس کی تیلی سے کائنات کو آگ لگا دیں۔ اتنے جتن کر کے آستانے پہنچیں دیکھا تو بالوں کی پڑیا غائب...... بابا صاحب کے سامنے جو خفت اٹھائی اس کا تو جیسے کوئی حساب ہی نہیں۔

''زرینہ کام کر کے چلی گئی؟'' بانو آپا نے اسی خراب موڈ میں سوال کیا۔

''جی...... وہ تو کب کی چلی گئی۔'' چمن کو کچھ سمجھ نہ آئی کہ زرینہ کو کیوں یاد فرمایا جا رہا ہے۔

''میرے کمرے کی صفائی کر کے گئی ہے۔'' بانو آپا کے چہرے پر تفکرات جھنجلاہٹ اعصابی تناؤ کی

کیفیت سب کچھ تھا۔ بلکہ غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا دکھائی دے رہی تھیں۔

''جی...... میں نے خود کھڑے ہو کر صفائی کرائی تھی۔'' چمن کو کچھ کچھ سمجھ آ رہا تھا۔

''کچرے والے نے کچرا اٹھالیا؟'' وہ سوال کرنے پر مجبور تھیں۔

''وہ تو دس بجے اٹھالیتا ہے۔ خیریت...... آپ کی کوئی چیز گم ہو گئی ہے؟'' اب چمن لطف لینے لگی۔

''اللہ نہ کرے، میری کوئی چیز گم ہو۔ میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی چوبیس گھنٹے کچرا گھر میں پڑا رہے تو نحوست ہوتی ہے۔''

''اچھا اچھا...... میں سمجھی کچھ گم ہو گیا ہے۔ پہلے آپ نے زرینہ کا پوچھا پھر کچرے والے کا۔''

''ارے جاؤ...... جا کر اپنا کام کرو۔ پانچ سال پہلے جو کچرا اٹھا کر لائی تھی وہ کیسے گھر سے نکالوں۔ منحوس شکلیں گھر سے دیکھ کر نکلو تو کوئی کام سیدھا نہیں ہوتا۔ نصیب ہی پھوٹ گئے ہمارے تو۔''

بانو آپا بظاہر بڑبڑاتی جا رہی تھیں مگر کچھ اس انداز میں کہ ایک ایک حرف چمن کے کان میں جا پڑے۔ ضائع نہ ہو جائے۔ چمن شکست خوردہ سی ساس کو دیکھ کر مدتوں بعد بڑے سکون سے مسکرا رہی تھی۔ گویا بانو آپا اس کی نحوست کا تذکرہ نہ کر رہی ہوں اس پر گلاب کی پتیاں نچھاور کر رہی ہوں۔

☆......☆......☆

''ارے آتے ہوئے بیگم سے اجازت بھی لی تھی۔'' فردوس نے یاور کو اندر آتا دیکھ کر علی علی کر کے چڑھائی کر دی۔

''سلام کا جواب تو دے دیں امی۔ آفس سے سیدھا آپ کے پاس آ رہا ہوں۔ گاڑی اور ڈرائیور ساتھ ہے۔ آپ نے کسی کام سے جانا ہو تو چلی جائیں۔ میں دو تین گھنٹے ریسٹ کر لوں گا۔''

''ارے اب یہ گاڑی ڈرائیور صرف تمہارے بیوی بچوں کے ہیں۔ ساتھ رہتے تھے تو ہر چیز اپنی تھی۔ ہم نے ہیرے جیسا بیٹا اس کلموہی کو سونپ دیا۔ یہ گاڑی اور ڈرائیور اپنے سر پر رکھ کر ناچوں۔'' فردوس ناشتے کھانے بنا بنا کر، حامد حسین کی نکتہ چینیاں سُن سُن کر پک چکی تھی۔ بیٹھے بیٹھے سارے کام ہوئے ملتے تھے تو موڈ بھی مستی بھرا رہتا تھا اور شیطانی چالیں چلنے کا بھی خوب وقت مل جاتا تھا۔ اب ایک کے بعد ایک کام...... ناشتے سے فارغ ہوئی تو صفائی والی اور کپڑے دھونے والی آ گئی۔ کبھی فنائل ختم ہونے کی اطلاع کبھی جھاڑو منگوانے کی فرمائش...... کپڑے دھونے والی کی الگ سے آوازیں۔ آپا جی نیل ختم ہو گیا۔

''ایریل میں رنگ دار کپڑے دھولوں؟ سرف ایکسل تھوڑا سا ہے۔'' خدا خدا کر کے دونوں پدھاریں تو حامد حسین کو چائے کوئی کی طلب ہوگئی۔ ایک پیالی چائے پنچ کر فارغ ہوئیں تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا۔ پکے ہوئے دماغ سے سوچنا شروع کیا کہ کیا پکایا جائے تو چکر آنے لگے۔ گوشت میں گوبھی ڈالوں تو حامد حسین کے پیٹ میں گیس ہو جاتی ہے۔ دال چاول بناؤں تو دس لوازمات ساتھ بناؤ۔ ورنہ حامد حسین کہیں گے سرکاری اسپتال میں لا کر بٹھا دیا ہے یا جیل میں۔ خوب غور و خوض کے بعد قیمہ شملہ مرچ بنایا۔ ذرا سی دودھ سویاں کہ جلدی بن جاتی ہیں۔ میٹھے کے نام پر خانہ پُری کرنا تھی۔ خشک سالن کے ساتھ چاول کیسے بناتیں چار پانچ پھلکے بھی بنانے پڑے۔ آٹا گوندھا تو لئی ہو گیا پھر اتنا ہی آٹا ڈال کر اسے سخت کیا۔ خوب گٹھلیاں بنیں جنہیں پوروں میں لے لے کر پھوڑا۔ ذرا سا آٹا جان کو آ گیا۔ اتنا ہو گیا کہ دس بندوں

کی روٹیاں یا پھلکے تھوپ دیے جائیں۔

سات سال میں پھلی نہ توڑی۔ ایمن پریگنینسی میں کچن سنبھالتے سنبھالتے ہانپ جاتی مگر اللہ کی بندی نے پھوٹے منہ سے کبھی نہ کہا کہ لاؤ میں بیٹھے بیٹھے سبزی ہی بنا دوں۔

ڈلیوری کے شروع دن بازار سے کھانا آتا۔ تیسرے دن ایمن بچہ جھولے میں لٹا کر پھر کولہو کا بیل بن جاتی۔

''امی سب کچھ آپ کے صلح مشورے سے ہوا ہے۔ آپ ہی نے کہا تھا۔'' یاور نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو فردوس نے درمیان میں ہی جملہ اُچک لیا۔

''ہاں...... ہم نے ہی کہا تھا۔ تمہارے بیٹے کی آس میں یہ مصیبت بھگت رہے ہیں۔ بس ایک بار پوتا ہاتھوں میں آجائے۔ پھر کرتی ہوں سارے حساب کتاب۔'' فردوس نے دانت کچکچائے۔

''امی! کسی سے کہہ کر کھانا بنانے والی بھی رکھ لیں۔ اب آپ کو کچن میں کام کرنے کی عادت نہیں رہی۔'' یاور کو ہانپتی کانپتی ماں پر ترس آگیا جو بیوی پر کبھی نہیں آیا تھا۔

''یہ لو...... کھانا بنانے والی پکا کر ڈھک کر رکھ کر چلی جائے گی۔ ہم ٹرین کے مسافروں کی طرح نکال نکال کر کھاتے رہیں گے۔'' فردوس کو بیٹے کے احمقانہ مشورے پر مزید طیش آگیا۔ کیونکہ وہ شوہر کا مزاج جانتی تھیں جو ناشتے میں بھی باسی سالن کھانا پسند نہیں کرتے تھے۔

''پانچ چھ ہزار گرہ سے دیں اور باسی کھانے کھائیں۔ خانساماں پندرہ ہزار سے کم میں نہیں ملتا پھر اسے ٹھکانہ دو، نگرانی کرو، اتنا خرچہ کھانے پینے پر نہ اٹھے جتنا خانساماں پر اٹھے گا۔ بیٹا تم ہماری فکر نہ کرو۔ جیسے تیسرے یہ وقت گزر جائے گا۔ وہ سمجھ رہی ہے بیٹا پیدا کر کے تخت پر بیٹھ جائے گی۔ ہم اسے تاج پہنائیں گے۔ مگر...... خیر چھوڑو......'' فردوس کو اپنے مرتب پروگرام یاد آگئے۔ وہ بدلے جو آنے والے دنوں میں اس نے ایمن سے لینا تھے۔ وہ بھی سُود کے ساتھ۔

یاور صوفے پر ہی سیدھا سیدھا لیٹ گیا۔

''ارے تم بیوی کے قدموں میں لوٹنے کے بجائے یہاں آ کر کیوں لیٹ گئے۔ خیریت تو ہے۔'' فردوس کا دماغ قدرے ٹھنڈا ہوا تو کسی اچانک آنے والے خیال سے چونک پڑیں۔

''اُس گھر میں میرا دم گھٹتا ہے۔ اپنا گھر چھوڑ کر کرائے کے گھر میں رہنا کوئی آسان بات نہیں امی۔'' یاور نے ماں سے دل کی بات کہہ دی۔ ماں سے ہی دل کی بات بے فکری سے کی جاتی ہے۔

''ہاں میرا نازوں پلا بیٹا جانے کس جھونپڑے میں جا بیٹھا ہے۔ تمہارے باپ نے پانچ بیڈروم کا یہ بنگلہ کتنی چاہ سے بنوایا تھا۔ جب نقشہ پاس ہوا تو مجھے دکھاتے ہوئے بولے ایک بیڈروم ہمارا، ایک یاور کا، ایک گیسٹ روم، اور دو بیڈروم یاور کے بچوں کے۔ یہ گھر تو ہم نے بنایا ہی تمہارے لیے ہے۔ مگر اللہ کی مار اِن ناشکری عورتوں پر۔ محل جیسا گھر چھوڑ کر جھونپڑے میں جا کر بیٹھ گئی ہے۔'' فردوس نے جل بھن کر کہا۔

''ابا جان سو رہے ہیں۔ گاڑی تو پورچ میں کھڑی ہے۔ اس کا مطلب ہے گھر میں ہیں۔''

''ارے تمہارے باپ کو میرے جیسی بیوی ملی ہے۔ جنت میں رہتے ہیں۔ چین کی بنسی بجاتے ہیں۔ انہیں کام ہی کیا ہے۔ اخبار رسالے چاٹے، کھایا پیا، نمازیں پڑھ لیں نیند آئی اور سو گئے۔'' فردوس کے

انداز میں خود پسندی جھلک رہی تھی۔
''یہ بات نہیں امی! ابا جان نے تیس سال دبا کر کام بھی تو کیا ہے۔ ظاہر ہے اب آرام کرنا اُن کا حق ہے۔''
یاور کو گزرے ہوئے وقت کی تمام جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ کس طرح حامد حسین صبح صبح آفس جاتے تھے اور بیٹے کو اسکول بھی ڈراپ کرتے تھے۔ لنچ بریک میں اسکول سے گھر چھوڑنے جاتے تھے۔
''اللہ کا شکر ہے قسمت بہت اچھی ہے تمہارے باپ کی۔ میرا بیٹا تو بیٹیوں کے چکر میں پھنس گیا ہے۔ دیکھو کب بڑی ہوتی ہیں۔ کب اپنے اپنے گھر کی ہوتی ہیں۔ اور میرے بچے کی جان چھوٹتی ہے۔''
''آپ ہر وقت یہ باتیں نہ سوچا کریں۔ ابھی بہت وقت ہے۔'' یاور نے ماں کو دلاسا دینے کی اپنی سی کوشش کی۔
''اے ہٹاؤ...... لڑکیاں دیکھتے ہی دیکھتے ماں کے قد کی ہو جاتی ہیں۔ کیا کریں، گلے پڑا ڈھول تو بجانا ہی ہے۔ میں تمہارے لیے فالودہ لاتی ہوں۔ تمہارے ابا جان رات کو لائے تھے۔ ویسے کا ویسا دھرا ہے۔ برا مت ماننا بیٹا روٹی بنانے کی ہمت نہیں ہے۔ ویسے بھی بیوی والے ہو۔ یہ اس کا کام ہے۔'' فردوس نے صاف معذرت کی تھی کہ وہ بھوکے بیٹے کو فالودہ تو کھلا سکتی ہے۔ روٹی بنا کر نہیں کھلا سکتی۔
''لنچ کر لیا تھا میں نے، آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' یاور نے تسلی دی۔
''گھر سے باندھ کر لے گئے تھے؟'' فردوس جاتے جاتے رُک کر پوچھنے لگیں۔
''نہیں...... کچھ لوگوں کے ساتھ آج میٹنگ تھی انہی کے ساتھ Red Onion چلے گئے تھے۔ بہت اچھا لنچ کیا ہے۔'' یاور نے جذبہ تشکر کے ساتھ ماں کو تسلی دی۔ فردوس تو اتنی مطمئن ہوئیں کہ فالودہ لانے کا ارادہ ترک کر کے دھپ سے دوبارہ صوفے پر ڈھے گئیں۔ یاور کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ بہت پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ فردوس کو بیٹے پر ٹوٹ کر پیار آنے لگا جس نے اچھے لنچ کی خبر سنا کر فالودہ لانے کی 'مشقت' سے بھی بچا لیا تھا۔

☆......☆......☆

شام ڈھلے ہی دل پر تھاپ پڑتی تھی۔ یوں جیسے ہی گوری نے بھاڑ پر توا چڑھایا اور ڈنگر مویشی کے گلے میں پڑی گھنٹیوں نے محبوب کے آنگن میں پاؤں رکھنے کی خبر دی ہو۔
مگر کسی کسی دن محبوب کا کوئی ڈنگر سرکشی دکھاتے ہوئے بے وفائی کی ٹھان لیتا ہے تو اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے کالی رات سر پر آ جاتی ہے۔
شام ڈھلتے ہی وہ جلے پیر کی بلی بنی اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ شام ہوتے ہی کالی رات بھی بے صبری سے ننگے سر، ننگے پاؤں دہلیز پر آ کھڑی ہوئی تھی۔
بانو آپا کے دھواں دھار رونے کی آواز ڈنگر مویشی کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کے مصداق ہی تھی پتا چل گیا تھا کہ ثمر گھر آ چکا ہے اور بانو آپا نے اسے راہ میں ہی آ لیا ہے۔
''امی! پلیز کچھ بتائیں تو سہی...... کیا ہوا ہے؟''
گوری کی توے پر پڑی روٹی جلنے لگی۔

''ارے بیٹا، کب سے دل سنبھالے بیٹھی تھی۔ تمہاری شکل دیکھتے ہی دل کا چھالہ پھٹ پڑا۔ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔'' بانو آپا زاروقطار روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
گوری نے جلی ہوئی روٹی چمٹے سے اٹھائی اور انگار میں دبا دی۔ دل سکڑ کر سمٹ کر پھیل رہا تھا۔ جلی ہوئی روٹی کی بُو عشق اور مشک کی طرح چہار سو پھیل جاتی ہے۔ روٹی کیوں جلی؟ یہ بتانا پڑے گا۔
''دنیا میں تمہیں ذلیل کر رہی ہے۔ الزام لگا رہی ہے تم پر، ایک ماں یہ سب کچھ کیسے برداشت کر سکتی ہے۔''

گوری کا ہاتھ آٹے میں دھنسا کا دھنسا رہ گیا۔
''ارے اسے یہ نہیں پتا شوہر کی عزت نہیں کرے گی۔ تو اسے کون عزت دے گا۔''
''امی ...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ خدا کے لیے کچھ تو بتائیں۔ کس نے بے عزتی کی۔ کیا الزام لگایا؟''
''روٹی کیوں جلی؟ زناٹے کا تھپڑ گوری کے منہ پر پڑا۔ خبر نہیں بھوکا پیاسا سانوریا...... خالی پیٹ کیسے عشق بگھارے گا؟''
کان میں پڑی جھمکیوں کو انگلی سے چھو کر کیسے ہلورے دے گا؟ بھوکا شیر، جوانی کی مستی سے بھرا سانڈ جنگل پھونس بنا دیتے ہیں۔
''کہتی ہے آپ کے بیٹے میں عیب ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنے بیٹے کو ڈاکٹروں کو دکھاؤ اور جنے کیا کیا مجھے تو بولتے ہوئے بھی حیا آتی ہے۔ کہاں مر جاؤں، شرم سے زمین میں دھنسی جاتی ہوں۔''
سانوریا نے جلی ہوئی لکڑی اٹھائی اور اس دل میں ترازو کر دی جس دل میں محبوب کے قدموں کی آہٹیں دھڑکنیں بنتی تھیں۔

وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگنے لگا۔ گھبرو، جوان، سرشار، سانڈوں کو قابو میں کرنے والا...... گھوڑے کو ناچ سکھانے والا...... کسی نے اُسے ہتھیلی پر رکھا اور پھونک سے اڑا دیا؟
ٹکے ٹکے بکتی ہیں...... گلی گلی ملتی ہیں...... میری جوانی سے بھیکتی ہے...... میری محنت سے دوزخ ٹھنڈا کرتی ہے۔ چولہے میں جلتی لکڑی ہاتھ میں پکڑ کر اس کی ناک پر داغ لگاتی ہے...... ایسی کی تیسی اس کی۔
دھڑ سے دروازہ کھلا اور چمن کو یوں لگا جیسے دروازے کو زور سے لات لگی ہو۔ اس نے اندر آتے ہوئے ثمر کو دیکھا جس کی آنکھوں کے شعلے بتا رہے تھے کہ اس کی مردانگی اُلٹی چھری سے ذبح ہوئی ہے۔
''جا کر اپنے لیے کوئی پرفیکٹ ساتھی ڈھونڈ لو۔ میری ماں کے سامنے مجھے ذلیل کرنے والی عورت کا اس گھر میں کیا کام؟ ماں کو سُن کر اتنا دکھ ہوا کہ وہ رو رو کر آدھی ہو گئی۔ سوچو...... اس وقت میری کیا حالت ہو گی؟'' ثمر نے بریف کیس پھینک کر اس کا بازو دبوچ لیا۔
''گالی دیتی ہے مجھے...... پانچ سال ایک نامکمل مرد کے ساتھ گزارے ہیں؟ وہ ایک بات جو میرے دماغ میں انگارے بھر دیتی ہے۔ آج ماں سے کہہ دی۔ ماں کی نظروں میں مجھے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا۔ میں نے ہمیشہ ایسے بیڈ روم کی بات سمجھ کر بیڈ روم میں ہی دفن کر دیا۔ مگر آج پتا چلا شہر میں تو میری مردانگی کے چرچے ہو رہے ہیں۔''

''ثمر...... خدا کے لیے ہوش میں آئیں۔ آدھی بات سُن کر کیوں اپنا دماغ اُلجھا رہے ہیں۔ مجھ سے تو پوچھیں کیا بات ہوئی تھی۔ کیسے شروع ہوئی تھی اور جواب میں، میں نے کیا کہا؟ پلیز کول ڈاؤن۔''

چمن نے اپنا بازو گرفت سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ بہت ہمت سے وہ ثمر کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''کچھ نہیں سننا مجھے...... اس بیڈ پر روز میرے ساتھ وہ عورت سوتی ہے جو مجھے نامکمل مرد سمجھتی ہے۔ خود پر ترس کھاتی ہے۔ مظلوم سمجھتی ہے خود کو۔'' ثمر نے جہازی سائز بیڈ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے غضب ناک انداز میں کہا۔

''آپ ایک عام بات کو کیوں Issue بنا رہے ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں۔ میڈیکل......'' بات ادھوری رہ گئی۔ ثمر کی مردانگی فیصلے میں پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔

''اپنے پاس رکھو اپنا میڈیکل...... مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا، ابھی اسی وقت اپنے باپ کے گھر چلی جاؤ۔''

گھر یوں ہلا جیسے پانی کے تختے پر دھرا تھا۔

روٹی تو ایک ہی جلی تھی۔ پرات بھر آٹا رکھا ہوا تھا۔ ایک روٹی جلتی ہے دس روٹیاں تو صحیح بنتی ہیں۔ گوری دم بخود اس توے کی طرف دیکھ رہی تھی جو سانوریا نے چولہے سے ہٹا کر دُور پھینک دیا تھا۔

ثمر کوٹ ٹائی پھینک کر ڈریسنگ میں جا چکا تھا۔

''ایسے کیسے چلی جائے......؟ کوئی مذاق ہے؟'' اس نے ڈریسنگ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

گوری نے چمٹے سے توا اُٹھا کر دوبارہ چولہے پر رکھا۔ سلگتی لکڑیاں جھٹک جھٹک کر دوبارہ ترتیب سے رکھیں اور پھونکیں مار مار کر آنسو بہانے لگی۔ دھواں اس کا بھرم رکھ رہا تھا۔

وہ رو تھوڑا ہی رہی تھی۔ وہ تو پھونکیں مار کر بھاڑ روشن کر رہی تھی۔ روٹی جو پکانا تھی۔

☆......☆......☆

بانو آپا کو حسب خواہش رزلٹ مل گیا تھا۔ دروازے سے ہٹ کر بیٹی کو خوشخبری سنانے دوڑیں۔ مارے خوشی کے آڑی بانکی ہو گئیں۔ قدم رکھیں کہیں تو پڑیں کہیں۔ جلدی اس لیے بھی تھی کہ افشاں کہیں سو نہ جائے۔ اور اس لیے بھی کہ ثمر نہا دھو کر پھر کوئی معرکہ شروع نہ کر دے۔ اور انہیں بیٹی کو فون کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

ایسی بے قرار رات کی صبح بھی تو بہت دیر سے ہوتی ہے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر انہوں نے اپنا سیل اٹھا کر افشاں کا نمبر تلاش کیا۔

لینڈ لائن نمبر سے فون کرنے کا 'رسک' نہیں لے سکتی تھیں۔ کہ کہیں لاؤنج میں رکھے سیٹ پر چمن نہ سن لے۔

آج ہی تین سو روپے کا بیلنس لوڈ کیا تھا۔ جو ابھی کے ابھی میں خرچ ہو جانا تھا۔ افشاں نے پہلی Ring پر ہی کال ریسیو کر لی تھی جیسے کہ انتظار ہی میں بیٹھی تھی۔

''اسلام علیکم امی جان!'' بیٹی کی سریلی آواز سُن کر روح میں تراوٹ سی اُتر گئی۔

''جیتی رہو چندا...... دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔'' آواز میں بلا کی چہک تھی۔

''خیریت تو ہے امی! ماشاء اللہ بہت خوش ہیں۔'' ماں کے مزاج کے تمام موسموں سے باخبر افشاں نے بانو آپا کی سرخوشی کی کیفیت آن واحد میں محسوس کر لی تھی۔

''بیٹا! اللہ نے ہماری سن لی۔ ہمیں کچھ بھی نہیں کرنا پڑا، اس نے خود ہی ہمارا کام آسان بنا دیا۔ ہر رکاوٹ ایک ٹھوکر سے دور ہو گئی۔'' بانو آپا نے اپنے کلمات سے افشاں کی آتشِ شوق مزید بھڑکا دی۔

''ہائے اللہ امی جان! جلدی سے بتائیں کیا ہوا؟''

''بس بیٹا...... کہاوت ہے کہ دن پھرتے دیر نہیں لگتی۔ ہمارے بھی دن پھر گئے۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے بارہ مسالے لگا کر آج کی ساری روداد بیٹی کے گوش گزار کر دی۔ جو افشاں نے سانس روک کر سنی۔

''پھر امی؟'' افشاں ساری کتھا سن کر بڑی بے تابی سے بولی۔

''پھر کیا...... بس پھر ہو گیا۔ ثمر نے صاف صاف کہہ دیا ابھی اپنے باپ کے گھر چلی جاؤ۔''

''پھر...... بھابی چلی گئیں؟ بھائی کیا کر رہے ہیں؟'' افشاں کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ارے ڈھیٹ ہڈی اب اتنے آرام سے بھی نہیں جائے گی۔ ہم تو اپنا سمجھ کر سمجھا رہے تھے کہ ثمر کو دوسری شادی کی اجازت دے دو۔ مرد چار چار بیویاں بھی تو سمالتے (سنبھالتے) ہیں کہ نہیں؟ ایک کمرے میں تم بھی پڑی رہو گی۔ مرتے دم تک سہاگن کہلاؤ گی۔ طلاق یافتہ بے اولاد کو کون گھاس ڈالے گا۔ سب بیٹے والے اپنا آنگن ہرا کرنے کے لیے بیٹے بیاہتے ہیں۔''

بانو آپا نے بیٹی پر اپنی انسانیت کی دھاک بٹھانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

''چلو...... شکر میں کل ہی وجیہہ کے ہاں پچویشن دیکھنے جاتی ہوں پھر آپ کو بتاتی ہوں۔'' افشاں کے لہجے میں بلا کا سکون اترا ہوا تھا جیسے مدت بعد زخم ٹھیک ہوا ہو۔

بانو آپا اثبات میں سر ہلا رہی تھیں گویا افشاں نادیدہ نگاہ سے انہیں دیکھ بھی رہی ہو۔

☆......☆......☆

رات بالآخر کٹ گئی تھی۔ گزری رات کے قدموں کی ایک ایک آہٹ اس نے گنی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشوں نے مطلع کیا کہ سورج سلام کہتا ہے۔ وہ رات سے اب تک گیسٹ روم میں تھی۔ ہر پل اس بے مہر کی آہٹ کا اندیشہ رہا۔ جیسے وہ کسی بھی لمحے آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لے گا اور کہے گا، یہاں کیوں لیٹی ہو۔ اپنے کمرے میں چلو۔ اور وہ بلا چون و چرا اس کے ساتھ کھنچتی چلی جائے گی۔

معاً اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ دروازے کا ہینڈل متحرک ہوا تھا۔ وہ جلدی سے لیٹ گئی۔ دروازہ کھلا چمن نے زور سے آنکھیں بند کر لیں۔

''ارے تم ابھی تک یہیں ہو...... باپ کے گھر نہیں گئیں؟'' بانو آپا کی بے مروت آواز سماعت سے ٹکرائی۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفا کی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

افسانہ

رضیہ مہدی

اندر کا انسان

لوگ انہیں دیکھ کر اکثر سوچتے تھے کہ انہوں نے شادی کیوں نہیں کی۔ انتہائی ہینڈسم، لمبے قد اور متناسب جسم کے مالک جو باہر کی ڈگریاں اور یہاں کی اچھی پوسٹ رکھتا ہو۔ اُس پر اچھا بیگ گراؤنڈ۔ والدان کے جانی مانی سیاسی شخصیت ہی نہیں ایک......

اُس کے اندر بھی ایک اچھا انسان تھا، جو اچانک ہی بہت برا ثابت ہوا تھا......

نوید کو آج ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی ۔سو وہ بہت جلدی آفس کے لیے نکل آئے۔ گھر میں سب سو رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ ویسے بھی ان کے گھر میں خاموشی ہی راج کرتی تھی۔ لوگ ہی کتنے تھے گھر میں۔ وہ تو آج بڑے بھیا اپنے بچوں سمیت آئے ہوئے تھے تو گھر میں رونق رہتی تھی۔ ورنہ اماں بیچاری تو اپنے کمرے سے کم ہی باہر آتی تھیں۔ دراصل ان کی صحت ہی انہیں اجازت نہیں دیتی تھی اور نوید کی باہر کی مصروفیات رات گئے ہی گھر کا راستہ دکھاتی تھیں۔ گھر میں اور تھا کون اماں بیچاری کافی سالوں تک اصرار کرتی رہیں۔

بیٹا اب تم بھی گھر بسالو۔'' کبھی کہتیں۔

''بھائی ضمیر کی بیٹی تم نے دیکھی ہے۔ مجھے ہمیشہ سے تمہارے لیے پسند تھی اس لیے۔''

''اس لیے کیا اماں آپ نے کہیں بات تو نہیں کی کچھ۔'' وہ یکدم گھبرا جاتے۔

''نہیں مگر دل نہیں چاہتا ہے تم شادی کرلو تمہارے بھی بال بچے ہوں تو اتنا بڑا گھر آباد ہو۔''

''بھیا کے بچے ہیں نہ اماں۔'' وہ بس جلدی ادھر اُدھر ہو جاتے۔

اب تو اماں نے بھی اصرار چھوڑ دیا تھا۔ کبھی کوئی ذکر نکل آتا تو بس ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔

وہ عمر کی پینتالیس بہاریں دیکھ چکے تھے۔ ویسے وہ بہاریں ہی تھیں؟ یہ انہیں خود کو بھی بڑی مشکل سے یقین دلانا پڑتا کیونکہ زندگی بس گزر رہی تھی کہ زندگی تو گزر ہی جاتی ہے۔ وہ اماں بہت محبت کرتے تھے۔ اگرچہ اس کے اظہار کے مواقع انہیں کم ملتے تھے۔ کچھ بھی تھا۔ وہ زبانی اظہار کے قائل بھی نہیں تھے۔ بڑے بھیا کی طرح نہ محبت کے مظاہرے انہیں آتے تھے۔ نہ بھاتے تھے۔ سال چھ مہینے پر چکر لگاتے تھے وہ۔ پر اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر آتے اور جاتے ہوئے آنسو بہانا ضروری تھا۔

''اماں آپ کے بغیر میرا دل نہیں لگتا۔'' وہ

انہیں پیار کرتے ہوئے ہمیشہ اعلان کرتے پھر ناز سے ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتے۔ لاڈ سے اپنی فرمائشی چیزیں پکواتے۔ اماں کے چہرے پر بکھرے حسرت کے رنگ نوید کو حیران کرتے حالانکہ وہ اماں کو اتنی قیمتی چیزیں لا کر دیتے تھے۔ ان کی ہر پسندیدہ چیز ان کے پاس سجا دی جاتی۔ ان کے آرام کا خیال، ان کی دوائیں ان کی خوشی کے لیے لوگوں سے ملنا بات چیت کرنا، وہ کیا نہیں کرتے تھے۔ اماں کے لیے مگر انہیں اماں کا چہرہ پژمردہ سا لگتا تھا کیوں؟ یہ سوالیہ نشان ان کے ذہن میں کلبلاتا رہتا تھا۔

لوگ انہیں دیکھ کر اکثر سوچتے تھے کہ انہوں نے شادی کیوں نہیں کی۔ انتہائی ہینڈسم، لمبے قد اور متناسب جسم کے مالک جو باہر کی ڈگریاں اور یہاں کی اچھی پوسٹ رکھتا ہو۔ اُس پر اچھا بیک گراؤنڈ۔ والد ان کے جانی مانی سیاسی شخصیت ہی نہیں ایک بڑے جاگیردار بھی تھے۔ پھر ایسا کیا تھا انہوں نے شادی ہی نہیں کی۔ یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ عورت سے دور بھاگتے ہوں۔ کتنی ہی عورتیں ان کے دوستوں کے سرکل میں شامل تھیں۔ کھانا کھلانا، ملنا ملانا سب چلتا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ جو لوگ عموماً سوچ بیٹھتے ہیں کوئی چوٹ دل پر کھائی ہو۔

انہوں نے عین جوانی میں بھی ایسی کوئی بھول نہیں کی جو پچھتاوا بن کر انہیں اب ستاتی ہو۔ بس ہوا یہ تھا کہ ان کی پیدائش کے فوراً بعد اماں بہت بیمار رہنے لگی تھیں۔ وہ بڑی مشکل سے آیاؤں کی گود میں اتنے بڑے ہوئے کہ اسکول جانے لگیں۔ پھر جلد ہی ہوسٹل پہنچا دیے گئے۔ گھر کی اکائی‘ چھوٹے بچے اور ماں باپ کا پیار نا وہ ان چیزوں کے عادی ہوئے نا ان کی روح کو سمجھ پائے۔ پھر کچھ بڑے ہوئے تو ملک ہی چھڑا دیا گیا۔ والد
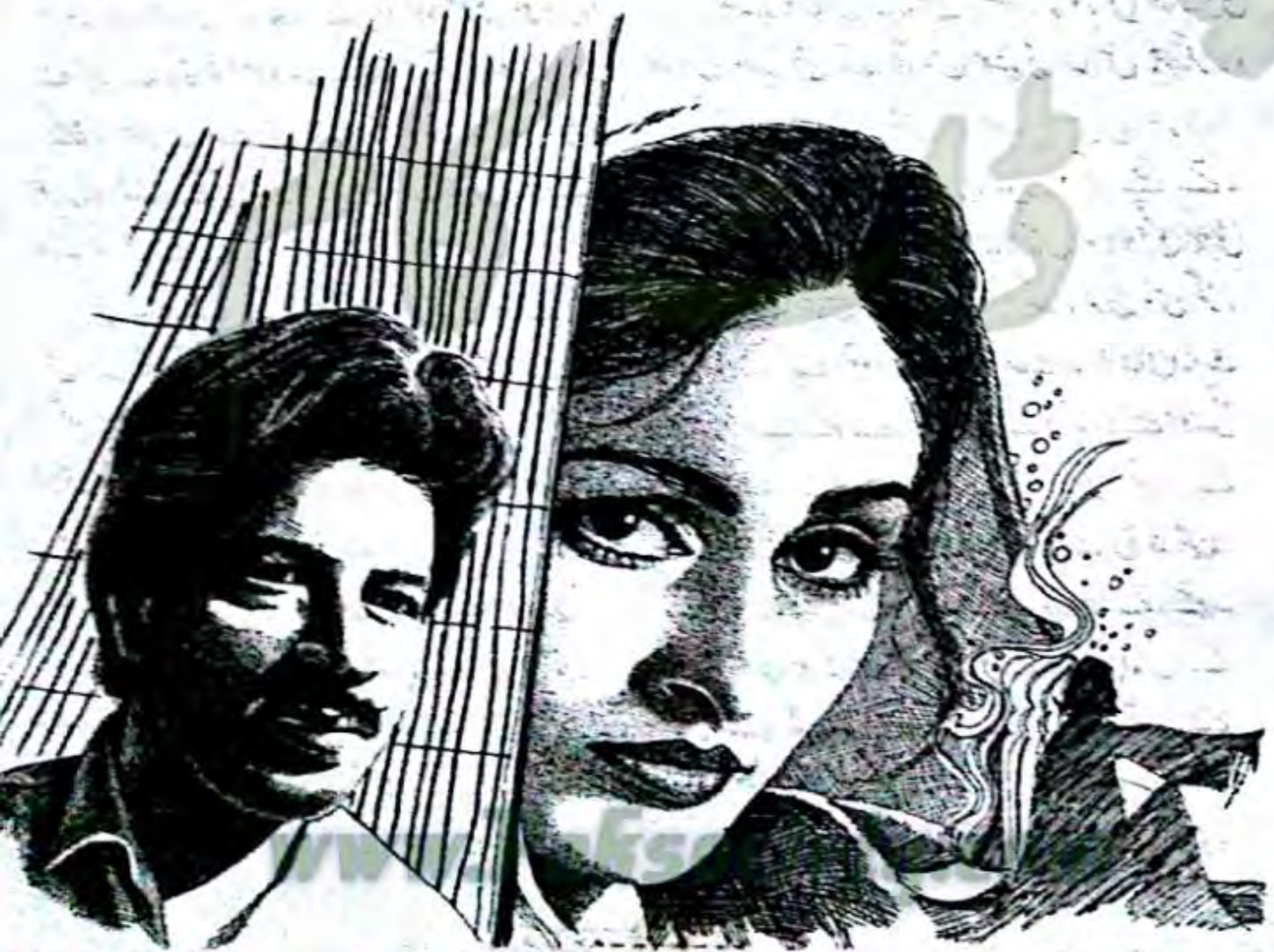
صاحب کی دلی خواہش کہ اعلیٰ تعلیم کا خواب بھی انہیں ہی پورا کرنا تھا کہ بڑے بھیا تعلیم کے معاملے میں بس چل چلاؤ ہی نکلے یہی وجہ تھی کہ اب وہ ٹھاٹ سے زمینیں سنبھالتے تھے۔ اماں کی صحت کے معاملات متقاضی تھے اچھے ڈاکٹروں کے جو شہر میں ہی مل سکتے تھے اور گاؤں سے شہر تواتر کے ساتھ آنا جانا ان کو تھکا کر اور بیمار کر دیتا۔ سو وہ شہر میں رہنے پر مجبور تھیں۔ وہ باہر کی دنیا کے عادی تھے۔ مگر وہ باہر کی گہما گہمی سے اکتا جاتے تو گھر کی جامع خاموشی میں گم ہو جاتے۔ جو موڈ ایسا ہوتا تو جلدی آتے اور اپنے کمرے میں بند ہو جاتے۔

یہ موڈ بھی کیا ہوتا ہے۔ انسان اس پر حاوی ہوتے تو کم از کم دنیا والے مطمئن رہتے۔ مگر جب موڈ حاوی ہونا شروع ہو جائے تو اُس کا عکس ارد گرد والوں پر گہرا پڑتا ہے۔ یہی تو وجہ تھی کہ اُن کے آفس میں ان کی لوگوں سے ہمدردیاں، ضرورت مندوں کی مدد کے باوجود انہیں لوگوں کے چہرے کچھ خوفزدہ سے لگتے مگر اپسے اپنا وہم سمجھتے۔ بھلا ان سے کس بات کا خوف۔ وہ اچھی طرح واقف تھے کہ اندر کا انسان ایک اچھا مہذب اور باکردار ہے۔

اس سے پہلے کہ بات اور کھنچتی چلی جائے تو اُس دن کا تذکرہ ہو جائے۔ جب انہیں اپنے آفس ٹائم سے پہلے آنا پڑا۔ ان کے موڈ کے بالکل خلاف تھا۔ صبح جلدی اٹھ کر جانا۔ دراصل برسوں پرانی عادت تھی۔ لیٹ نائٹ سونا اور دیر سے اٹھنا۔ صبح جلدی آفس آنا ان کے لیے ضروری کہاں تھا۔ وہ جس پوسٹ پر تھے، وہاں اپنی مرضی سے آنا اور اپنی مرضی سے دیر تک بیٹھنے کا رواج تھا۔ موڈ خراب پھر میٹنگ کی ٹینشن۔ ابھی تک نئے C.E.O سے ان کی کوئی خاص بات نہیں بنی تھی۔

پھر جب پہنچے تو اپنا کمرہ بند دیکھ کر پارہ آپ ہی آپ چڑھ گیا۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ جس کے پاس چابیاں ہوتی ہیں وہ کچھ لیٹ ہو گیا۔ بڑی مشکل سے ڈپلیکیٹ چابیاں لائی گئیں اور کمرہ کھلا۔ یہ ساری بھاگ دوڑ جس نے کی وہ ڈیپارٹمنٹ ہی کا ایک آدمی وسیم احمد تھا۔ وسیم کو انہوں نے اس کے باس منصور کی سفارش پر جاب پر برقرار رکھا تھا۔ اگرچہ کینسر جیسا موذی مرض پالے ہوئے تھا اور کیموتھراپی کے عمل سے گذر رہا تھا۔ مدقوق و مجہول سا آدمی اکثر انہیں سر کھجاتے اپنی میز پر بیٹھا نظر آتا تھا۔ وہ شاید پہلے کچھ بہتر لگتا تھا مگر یہ بیماری بھی تو بس......

تو ہوائیوں کے اُسے سوا آٹھ بجے اپنی سیٹ پر بیٹھا دیکھ کر نوید کو حیرت ہوئی۔ وہ بھی ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور انہیں سلام کیا۔ پھر جب کمرہ کھل گیا تو انہوں نے لیپ ٹاپ پر میٹنگ سے متعلقہ مواد نکالا اور اسے پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ انہیں وسیم کی صورت نظر آئی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آ رہا تھا۔

انہیں اس ڈسٹربنس پر غصہ سا آ گیا اور ذرا درشت لہجے میں بولے۔

NO.No i can`t talk you`I an extremely Busy وہ ایکدم نروس ہو کر پلٹا تو لڑکھڑا گیا۔ انہوں نے سر اٹھایا اور I Don`t care سوچتے ہوئے سر جھٹک کر دوبارہ مصروف ہو گئے۔

میٹنگ کافی طویل ہو گئی اور جب وہ واپس آئے تو بہت ذہن الجھا ہوا تھا۔ یونہی بلا ارادہ ان کی نظر وسیم کی سیٹ پر چلی گئی۔ سیٹ خالی تھی۔

میٹنگ میں C.E.O کے کروفر اور چبھتے ہوئے جملوں نے انہیں بہت پریشان کیا تھا۔ وہ سنجیدگی سے سوچ رہے تھے کہ یہ جاب چھوڑ

دیں۔ پرانا C.E.O ان کا دوست تھا۔ گولف کا ساتھی تھا۔ اور یہ پتا نہیں خود کو کیا سمجھ رہا تھا۔ وہ کون سا پاکستان خصوصاً کراچی میں رہنے پر خوش تھے۔ لا اینڈ آرڈر کی سچویشن جو تھی سو تھی انتظامی مسائل بھی بڑے صبر آزما تھے یہاں۔ ٹریفک کا نظام، سڑکوں کا حال، ٹریفک جام کی مشکل، بجلی کے طویل بریک ڈاؤن، یونہی بھٹکتے ہوئے ان کا ذہن وسیم جیسے لوگوں پر چلا گیا۔ جو شہر کے دور دراز علاقوں سے پبلک ٹرانسپورٹ پر آتے جاتے تھے تو بہ بسوں کی چھتوں پر ایک دوسرے سے گرمی میں چپکے ہوئے۔ توبہ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ انہوں نے اکتاہٹ سے سوچا۔

سب سے پہلے انہوں نے عزیز کو بلایا جو ان کو Assist کرتا تھا اور یہاں کے سارے یونٹ انچارج اسی کو رپورٹ کرتے تھے۔ اس پر اپنا غصہ نکالنے کے بعد ان پر جیسے جنون سا طاری ہو گیا اور یکے بعد دیگرے سب ہی کی کلاس لینی شروع کر دی یعنی حد ہو گئی۔ وہ تو صبح ڈیپارٹمنٹ کی کارکردگی پر لن ترانیاں سن رہے تھے اور یہاں سب کے سب موج میلے میں مصروف تھے اور آج کی کارکردگی صفر تھی۔

"کیا کر رہے تھے۔ آپ لوگ وقت دیکھا ہے آپ لوگوں نے۔"

"وہ سر یہ بات تھی کہ عزیز......" نے ہی کچھ کہنا چاہا۔

"کوئی بات وات نہیں۔ بلاوجہ میرا اور اپنا وقت مت ضائع کریں۔ آخر میں بھی انسان ہوں آپ سب بھی کوئی میٹنگ بھگتیں تو پتا چلے۔"

"جی سر!" وہ ہمیشہ یونہی مؤدب سا ہو جاتا تھا۔

پندرہ منٹ میں مجھے یہ سارے کیس آپ کے اور یونٹ انچارج کے نوٹس کے ساتھ چاہئیں۔

> **قبل از وقت**
>
> بیوی اپنے شوہر سے: "تم تو کہتے تھے کہ شادی کے بعد بھی مجھ سے پیار کرو گے۔"
>
> شوہر: "تو مجھے کیا پتا تھا کہ تمہاری شادی مجھ ہی سے ہو جائے گی۔"
>
> **حفظ ماتقدم**
>
> بیوی شوہر سے: "کیا میں کبھی تمہارے خواب میں آئی ہوں۔
>
> شوہر: "کبھی نہیں۔"
>
> بیوی: "کیوں؟"
>
> شوہر: "اس لیے کہ میں آیۃ الکرسی پڑھ کر سوتا ہوں۔"
>
> مرسلہ: راز عدن۔ بحرین

"انہوں نے فائلیں زور سے پٹخیں۔

"سر وہ یہ کہ......"

"کیا بات ہے۔ عزیز کیا یہ وہ لگا رکھی ہے تم نے۔"

"وہ سر یہ سب کیس منصور کے پاس ہیں۔ ساری بیک فائلیں بھی اس کے پاس ہیں۔" تو وہ غصے سے بولے۔

"سر وہ آفس میں نہیں ہے۔" عزیز نے جھکتے ہوئے کہا۔

"مطلب چاہے آندھی آئے یا طوفان ڈیپارٹمنٹ میں کتنا ہی کام ہو۔ آپ ہاف ڈے دے دیتے ہیں۔ کیونکہ ذاتی مصروفیات اہم ہیں۔ ٹھیک ہے تو پھر ذاتی کام کریں ہماری جان چھوڑیں۔"

"نہیں سر! وہ چھٹی لے کر نہیں گیا ہے۔"

"تو پھر؟"

"وہ سر وہ وسیم صاحب۔"

''کیا وسیم صاحب اور کیا کیا جائے ان کے لیے۔اب آپ نے ایک آدمی اُن کی خدمت کے لیے بھی وقف کردیا۔ارے بیمار ہیں۔مررہے ہیں تو پھر گھر پر آرام کریں۔مائنڈ یو! یہ کوئی چیرٹی ادارہ نہیں۔یہاں سب جواب دہ ہیں۔''

شاہد بڑی عجلت میں کمرے میں داخل ہوا۔

''وہ سر۔''

''آج تم سب کو ہوکیا گیا ہے۔'' وہ اپنے پی اے(P.A) پر بھی برس پڑے۔

''وہ سر وسیم صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ابھی فون آیا ہے اسپتال سے منصور صاحب کا......''

ساری بات یکدم اُن کی سمجھ میں آ گئی۔وہ اپنی سیٹ سے کھڑے ہوگئے۔اُن کی نظر میں صبح کا منظر گھوم گیا۔سارے منظر یکے بعد دیگرے اُن کی نظروں میں گھومنے لگے۔وہ ان کا گھبرا کر کھڑے ہونا، پھر اُن کا سلام کرنا، پھر جھجکتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولنا اور اُن کے سخت لہجے پر لڑکھڑا جانا۔شاید اُن کی آنکھ بھی کچھ نم ہوگئی تھی۔وہ اب سوچ رہے تھے۔پر بڑی پست آواز میں پوچھا۔

''کیا ہوا تھا انہیں۔''

''وہ سر پتا نہیں۔صبح ہی سے ان کا رنگ زرد ہورہا تھا۔میں نے پوچھا۔تو کوئی جواب ہی نہیں دیا۔آپ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی اپنی سیٹ سے زمین پر گر گئے۔ہم لوگوں نے فوراً ایمبولینس بلوائی اور منصور انہیں لے کر اسپتال چلا گیا۔''

''وہ تو اب ٹھیک ہو رہے تھے۔عزیز صاحب!'' شاید بہت دلگرفتہ ہورہا تھا۔

''ہاں بتایا تو تھا کہ اب رپورٹس ٹھیک آئی ہیں۔بڑا باہمت شخص تھا۔عزیز بھی اُداس تھا۔پتا نہیں اچانک آج کیا ہوگیا۔اب تو بیچارے کی ریٹائرمنٹ میں بمشکل ایک سال تھا۔اپنی بیماری اتنی ہمت سے جھیل رہے تھے۔پانچ بیٹیاں ہیں بیٹا کوئی نہیں ہے۔کہتے تھے آپ لوگوں سے مل کر سب کچھ بھول جاتا ہوں۔'' شاہد کے آنسو اب رخسار پر بہہ رہے تھے۔

''ہم لوگوں کے لیے تو سر وہ عزم وہمت کی مثال تھے اور اپنی محدود آمدنی میں بھی کسی نا کسی کی مدد کرتے رہتے تھے۔سب کے حال سے باخبر رہتے تھے۔بہترین ورکر پھر خاموش ،نا کوئی ڈیمانڈ نا شکایت......سب کے دوست،سب کے ہمدرد۔''

اب دفتر کے اور لوگ بھی آرہے تھے۔

نوید خاموش سوچ رہے تھے۔پتا نہیں وہ صبح کیا کہنا چاہتے تھے۔

ان کی تدفین میں سب کے ساتھ نوید بھی شریک تھے۔اگرچہ وہ بہت خاموش تھے مگر لوگ تو باتیں کررہے تھے۔لوگوں کا بہت ہجوم تھا۔سب ہی تعریفیں کررہے تھے۔ان کی خوش خلقی لوگوں کے ہمدردی اور صبر وقناعت سب کا تذکرہ تھا۔انہوں نے سوچا کہ مجھے تو کبھی وہ بہت امپریسو نہیں لگے۔پھر لوگ یہ سب کیوں کہہ رہے ہیں۔پھر انہیں یاد آیا کہ اُن کی پروموشن پر وہ یونہی جھجکتے ہوئے مبارکباد دینے آئے تھے اور انہوں نے مبارکباد کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ سر! آپ کے اندر ایک اچھا انسان ہے۔آپ حکم پروردگار سے ترقی کی بہت سی سیڑھیاں چڑھیں مگر اپنے اندر کے اس انسان کو زندہ رکھیے گا۔'' انہوں نے سنا تو تھا مگر توجہ نہیں دی تھی۔

دفتر تو دفتر ہے چاہے کوئی رہے، چاہے جائے کام تو ہوتا ہے۔دفتر تو چلتا ہے۔سب چل رہا تھا مگر پتا نہیں کیا ہوا۔نوید کو اب اکثر احساس ہوتا ہے شاید ان کے اندر کا انسان اچھا انسان نہیں۔

☆☆......☆☆

افسانہ

روزینہ حنیف

محبت بجھتی نہیں کبھی

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کو بہت سارو پیا، گہنے اور سہولتیں چاہیے ہوتی ہیں۔ انھیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ عورت کو اس کے علاوہ جو چاہیے وہ ان سب چیزوں سے زیادہ اہم ہے اور وہ ہے اپنے شوہر، اپنے ساتھی کا پیار جس سے شرمین کا دامن بھر...

محبت کی شدتوں سے گندھا، ایک باکمال افسانہ

"مجھے معلوم ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے پر یہ کون سی انوکھی بات ہے۔ نوجوانوں کا تو یہ پرانا مرض ہے بلکہ میں تو کہتی ہوں اب یہ مرض بھی ایک طرح کے مشغلے میں بدل چکا ہے۔ پیار محبت سب پرانے قصے بن چکے ہیں۔"

کہتے کہتے وہ رکی اور پھر بولی۔

"سمیرا بیگم آپ چاہتی ہیں میں بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے دوں، عشق کے راستوں میں اسے آگے بڑھنے کی شہ دوں۔ اگر میں اپنے ہر چاہنے والے اور طلب گار کو ایسے ہی شہ دیتی رہی تو جانتی ہو اس کے بعد کیا ہوگا۔"

"کیا....." سمیرا کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"میرے ایسے دیوانوں کی تعداد بھی یاد نہیں رہے گی مجھے۔" "سمیرا بیگم مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔"

"تم جو بھی کہو، میں تو بس یہ جانتی ہوں میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے سچے پیار کے رنگ دیکھے ہیں اور سچا پیار میں بھی مانتی ہوں کہ اس عہد میں یہی ایک چیز ہے جو نایاب ہو چکی ہے۔"

"آخر تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ اس کا پیار سچا ہے؟"

"سمیرا کافی دیر سے شرمین کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ رامس حقیقت میں اس سے محبت کرتا ہے اور اسے دیوی سمجھ کر اس کی سمجھو تو پوجا کرتا ہے۔ ایسے پیار کو اس طرح نظر انداز کرنا یا ٹھکرانا نہیں چاہیے کم سے کم اسے ایک موقع تو ضرور دینا ہی چاہیے۔ لیکن اس کی ساری دلیلوں اور لیکچرز کے جواب میں شرمین نے اس سے ثبوت مانگ لیا تو اسے لگا وہ ثبوت تو نہیں دے سکتی اور بھلا کون دے سکتا ہے۔

"سچ کو ناپنے اور پہچاننے کا اگر قدرت نے کوئی آلہ بنایا ہے تو اس کا نام ہے "دل" اگر سن سکو تو اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنو کہ رامس تمہیں کس قدر سچے من سے چاہتا ہے۔ مگر تم تو بہری بن جانا چاہتی ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ اپنی نام نہاد حقیقت پسندی کے چکر میں کہیں تم اس گوہر نایاب کو گنوا نہ بیٹھو۔ تم ایک ایڈوانس اور پڑھے لکھے امیر گھر میں پیدا ہوئی ہو۔ تمہارے ڈیڈی تمہاری بات سن کر انکار نہیں کریں گے۔ انھیں تمہاری خواہش کے سامنے رامس کی اگر کچھ حیثیت کم بھی لگی تو وہ اسے نظر انداز کر دیں گے۔" سمیرا نے اسے سمجھانے کی آخری کوشش کی۔

"تم تو سچ مچ پاگل ہو چکی ہو سمیرا۔ میں نے اسے ایکسیپٹ کیا نہیں ہے اور تم میرے ڈیڈی کی بات کرتی ہو۔ تم چاہتی ہو میں اس احمق عاشق سے شادی کر لوں۔ کیا مجھے زندگی میں اور کچھ نہیں سوچنا۔ میری زندگی کا بس یہی ایک مقصد ہے کہ میں بت بنی تمہارے اس رامس مجنوں کے سامنے بیٹھی رہوں اور وہ مجھے دیکھا کرے۔ مجھے تو یہ سوچ کر ہی جھرجھری آتی ہے۔ نا بابا نا مجھ سے نہیں ہوگا یہ سب اور نہ ہی مجھے عشق وشق کرنے میں کوئی دلچسپی ہے۔ بس تم اسے صاف لفظوں میں منع کر دو۔ شکر ہے اس نے مجھ سے براہِ راست کچھ نہیں کہا ورنہ میں اس کی طبیعت صاف کر دیتی۔ بڑے آئے مجنوں کے خالو....."

شرمین نے بیزاری اور جھنجلاہٹ کے تاثرات سے کہا اور سمیرا سمجھ گئی کہ شرمین کو وہ کسی بھی صورت قائل نہیں کر سکے گی اور سچ تو یہ ہے محبت کوئی قائل کرنے کا نام تھوڑی ہے۔ یہ تو خودرو پودا ہے جو نہ موسم دیکھتا ہے نہ وقت جس زمین پر اسے اگنا ہوتا ہے بس اگ جاتا ہے۔ اور شرمین کا دل تو پتھر ہے اس کے دل کی زمین شاید بنجر ہے وہاں وہ کیسے نمو پا سکتا ہے۔

شرمین ایک امیر اور ویل اسٹیبلش خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ سمیرا کے خاندان کی حیثیت بھی کچھ کم نہیں تھی لیکن شرمین کی حیثیت بہر حال اس سے زیادہ ہی تھی۔ ان دونوں کی دوستی بچپن میں اسکول

کے زمانوں میں ہی ہوگئی تھی۔ تب وہ بہت چھوٹی تھیں دونوں کے خیالات میں بڑے ہونے پر جو فرق تھا وہ نمایاں ہونے لگا سمیرا کو محبت اور سچ سے گہری دلچسپی تھی اسے لگتا تھا محبت کرنے والے انسان کو ہمیشہ ایک موقع ضرور دینا چاہیے۔ کم سے کم اس کے سچ کی آزمائش ہی کر لینی چاہیے۔ پر شرمین کسی بھی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کیونکہ سمیرا کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ حقیقت پسند تھی اور محبت و عشق کے چکروں میں پڑ کر اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اب پتا نہیں زندگی کے ان دونوں نظریوں میں سے کون سا صحیح تھا۔ اس حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ کوئی کتنا بھی حقیقت پسند کیوں نہ ہو بنا محبت کے بھی زندگی بوجھ بن جاتی ہے۔ رامس سائنس کا اسٹوڈنٹ تھا وہ ایم ایس کر رہا تھا۔ اس کا تعلق بھی کھاتے پیتے گھرانے سے تھا مگر حیثیت میں وہ شرمین سے کچھ نہیں بہت کم تھا۔ شاید اسی لیے چاہتے ہوئے بھی اس کی شرمین سے براہ راست بات کرنے کی ہمت نہیں پڑی اور پھر محبت میں ایک فطری جھجک بھی تو ہوتی ہی ہے۔ کتنے ہی ہفتے اور مہینے وہ دور دور سے شرمین کو آتے جاتے دیکھتا رہا تھا۔ البتہ ایک سایا ہمیشہ شرمین کے ساتھ ہوتا تھا اور وہ تھی شرمین کی دوست سمیرا۔

سمیرا یہ بات نوٹ کر چکی تھی کہ رامس یونیورسٹی کے سب ہی راستوں پر ان کے انتظار میں کھڑا ہوتا ہے۔ ایک بار اس نے شرمین کی توجہ بھی اس جانب دلائی تھی جس کے جواب میں شرمین بولی۔

''یونیورسٹی کے تو ہر دوسرے لڑکے کا یہی مشغلہ ہے اگر ایسے لڑکوں کے مشغلوں پر ہم نے توجہ دینا شروع کر دی تو ساری زندگی ایم اے کی ڈگری ہاتھ میں نہیں آئے گی۔''

مگر پتا نہیں کیوں سمیرا کو اس لڑکے کے چہرے سے لگتا تھا جیسے وہ اپنے جذبوں میں سچا ہے۔ ایک بار اس نے چھپ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ جب وہ شرمین تنہا ہو تو وہ اس کا تعاقب کرتا ہے یا نہیں۔ اس شک کے پیچھے یہ ہلکا ہلکا سا احساس بھی کہیں موجود تھا کہ رامس صرف شرمین کے پیچھے ہے یا سمیرا بھی اس کی لسٹ پر ہے اور جب سمیرا کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ صرف شرمین کے چکر میں ہے تو وہ اس کی حرکتوں کا اور بھی مزا لینے لگی۔

وہ اکثر سوچتی کہ یہ بے وقوف کوئی پیریڈ اٹینڈ بھی کرتا ہے یا سارا وقت بس تعاقب کرتے ہوئے گزار دیتا ہے۔ کیونکہ جب وہ سیمینار میں ہوتیں اور دیر تک پڑھنے کے بعد سیمینار سے باہر آتیں تو اسے سامنے موجود پاتیں۔ کلاس روم سے پیریڈ اٹینڈ کر کے نکلتی تب بھی وہ سامنے کھڑا ہوا ملتا تھا۔ ایک روز اسے آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ پیریڈ شروع ہو چکا تھا اور شرمین یقیناً کلاس روم میں تھی۔ وہ کلاس کے قریب پہنچی تو تھوڑے ہی فاصلے پر وہ کھڑا ہوا تھا۔ ہاتھ میں ایک کتاب اور ایک ڈائری تھی شاید۔ کالے رنگ کی پینٹ اور کالے سفید رنگ کی شرٹ میں ملبوس وہ بے حد خوبصورت اور ہینڈسم دکھ رہا تھا۔ اس کا کھڑے ہونے کا انداز ایسا تھا جیسے اسے اپنے آس پاس سے کوئی دلچسپی نہ ہو، کتابوں کو اوپر نیچے کرتا ہوا وہ یقیناً شرمین کا منتظر تھا۔ اس روز سمیرا نے فیصلہ کیا کہ آج اس سے پوچھا جائے کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ اس طرح تعاقب کرنے کا مطلب کیا ہے؟ یہی سوچ کر وہ پورے اعتماد سے اس کے قریب پہنچی۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے کچھ پوچھ سکتی ہوں؟'' وہ ایک دم جیسے چونک سا گیا پھر فوراً ہی سنبھلا اور بولا۔

''جی جی... ہاں ضرور! کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ؟''

''آپ یونیورسٹی میں پڑھنے آتے ہیں یا اِدھر اُدھر ٹہلنے؟'' اس نے بے دھڑک ایک چبھتا ہوا

سوال اس کی طرف اچھال دیا۔
''جی میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں'' وہ زبردستی ہنستے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے سمیرا کا سوال پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر ایسے احساسات سے دوچار تھا جیسے رنگے ہاتھوں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔
''میرا سوال اتنا تو پیچیدہ نہیں ہے جو آپ کی سمجھ میں نہ آیا ہو اور نہ ہی کسی ایسی زبان میں پوچھا ہے جو آپ کو نہ آتی ہو'' سمیرا نے پھر اعتماد کا مظاہرہ کیا۔
اس نے بھی بھانپ لیا تھا کہ وہ اس کی بے عزتی کرنے یا اس کا جو طرزِ عمل ہے اس پر اسے ذلیل کرنے کے ارادے سے آئی ہے۔ اس لیے وہ کافی سنجیدگی سے بولا۔
''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے اور اس میں آپ کو...'' اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔
''ٹھیک ہے معاملہ تو آپ کا ذاتی ہے پر ایسا بھی نہیں کہ اس سے صرف آپ کی ذات کا تعلق ہو'' سمیرا نے اس بار ذومعنی انداز اختیار کیا۔ سن کر وہ پھر سے انجان بننے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔
''کیوں ٹھیک کہا ہے نا میں نے؟'' جواب میں وہ شرمندگی کو ہنسی میں چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔
''آپ کی بات ٹھیک ہے پر میں یہ سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ ناصح بن کر آئی ہیں یا دوست بن کر؟'' سمیرا کو اس کی بات نے مشکل میں ڈال دیا ایک تو اسے اس پر رحم آنے لگا تھا دوسرے وہ اس کے لفظوں کی سچائی سے متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ کیا کرے دوست بنے یا ناصح۔ دوست کا استعمال اس نے کچھ اس طرح کیا تھا کہ اسے لگا اسے اس کی مدد کی ضرورت ہے پھر بھی وہ واضح طور سے اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی کہ اس کا مقصد کیا ہے۔
''میں سمجھی نہیں آپ کی اس بات سے کیا مراد ہے؟''
''اگر میں یہ کہوں کہ آپ اچھی طرح سمجھ چکی ہیں۔ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں تو آپ کیا کہیں گی؟'' یہ سن کر سمیرا جھینپ سی گئی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا سمیرا یہ کہتی ہوئی اس کے پاس سے ہٹ گئی۔
''میرے پیریڈ کا ٹائم ہو رہا ہے مجھے جانا ہوگا۔''
وہ اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا اور اس کے ہونٹوں پر ایک ذومعنی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے پہلا معرکہ سر کر لیا ہو۔ اب آگے بڑھنا آسان ہو گیا تھا۔
اس واقعے کے بعد وہ اس تلاش میں رہنے لگا کہ سمیرا اسے کہیں اکیلی مل جائے۔ دوسری طرف سمیرا کی کوشش تھی کہ وہ اسے اب کبھی اکیلے نہ ملے لیکن قسمت کو یہی منظور تھا اور ایک دن اس نے سمیرا کو اکیلے پکڑ ہی لیا۔ ''آپ نے اس روز میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔''
''میں بھلا کیا جواب دے سکتی ہوں، آپ کو معلوم ہونا چاہیے جن راستوں پر آپ چل رہے ہیں وہ اتنے دشوار ہیں کہ آپ کا انھیں سر کرنا اور منزل تک پہنچنا ممکن نہیں ہوگا۔''
''لیکن میں تو فیصلہ کر چکا ہوں'' وہ اعتماد سے بولا۔
''یہ تو یکطرفہ فیصلہ ہے اس میں دوسرے فریق کی مرضی کا شامل ہونا کتنا ضروری ہے یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔''
''مجھے معلوم ہے اور میں یہ بھی میں جانتا ہوں اگر آپ میری مدد کریں تو میرا یہ فیصلہ حاصل منزل بن سکتا ہے!'' اس کی بات سن کر سمیرا پریشان ہو گئی پتا نہیں اس کے دماغ میں کیا چل رہا تھا۔
''میں بھلا آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔'' سمیرا ایک بار پھر مشکل میں پڑ گئی۔
''آپ اتنا تو کر سکتی ہیں کہ میرے راستے کی کچھ مشکلات کم کر سکیں'' وہ پھر سے پُرامید لہجے میں بولا۔

اس کے بعد دونوں دیر تک بحث کرتے رہے اور جب ثمیرا اس کے پاس سے واپس آئی تو اس کا ذہن یہ تسلیم کر چکا تھا کہ یہ لڑکا اپنی محبت میں اتنا ہی سچا اور ایماندار ہے جتنا کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سوچتی رہی کہ میں اس کی کیسے مدد کر سکتی ہوں۔

شرمین ایک بااختیار اور اپنی مرضی کی مالک لڑکی ہے اس کے گھر والے بھی اس کے فیصلوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ ثمیرا چاہے بھی تو اس سے کوئی ایسی بات نہیں منوا سکتی جسے وہ ماننا نہ چاہے۔ رامس سے ملنے کے بعد جیسے وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ کاش شرمین اس کے دل کی آواز کو سن سکے اور رامس کا محبت سے لبالب بھرا ہوا دل ٹوٹنے سے بچ جائے۔

ایک روز وہ اسے پھر تنہا مل گئی اور اس نے خیریت پوچھنے سے بھی پہلے پوچھا۔

''آپ نے کیا سوچا؟''

''کس سلسلے میں؟'' وہ دانستہ انجان بن گئی۔

''میری مدد کرنے سلسلے میں'' اسے تو جیسے بات کو دہرانے سے فرق ہی نہیں پڑتا تھا۔ ثمیرا جو شروع میں اس کی محبت یا اس کے اس طرح لڑکیوں کے پیچھے پیچھے آنے کو ایک احمقانہ سی بات ہی سمجھتی تھی جو لڑکوں کی ازلی پہچان ہے۔ پر جب سے وہ اس سے ملی تھی اور اس نے اس کی باتیں سنی تھیں تو کہتے ہیں الفاظ اور آواز میں بھی جادو ہوتا ہے اور وہ اس کے سحر میں آتی جا رہی تھی جیسے کوئی اسے ہپناٹائز کر رہا ہو۔ شاید ہر سچائی ہپناٹائز ہی ہوتی ہے۔ آپ ہی آپ اس کا دل چاہنے لگا کہ اسے رامس کی مدد کرنا چاہیے۔ کیا پتا اس کی کوشش سے اس دیوانے کا کوئی کام بن جائے۔ سچ کے لیے تو یوں بھی منصور سولی کو اور سقراط زہر کے پیالے کو چوم چکے ہیں۔ اسے لگا نہ وہ منصور ہے اور نہ سقراط پر رامس میں کچھ تو ہے جو وہ خود کو اس کی مدد کرنے پر تیار پاتی ہے۔

''آپ نے جواب نہیں دیا؟'' اس نے ثمیرا کو سوچتے ہوئے دیکھ کر درخت کی ٹہنی کو پکڑ کر زور سے چھوڑتے ہوئے کہا۔

''جی...'' ایک لمحے کو وہ خاموش ہوئی پھر ٹھہر کر بولی ''اچھا ٹھیک ہے میں تیار ہوں، پر یہ آپ کو طے کرنا ہوگا کہ آپ کو کس قسم کی مدد چاہیے۔ اور وہ کس طرح کی جا سکتی ہے یعنی طریقہ کار بھی آپ کو ہی طے کرنا ہے۔''

''ہوں ں ں'' اس نے ایک لمبی سی ہوں بھری اور بولا ''میرا یہ خط شرمین تک پہنچا دیں اور اگر وہ کوئی جواب دیں تو وہ مجھے لا کر دے دیں۔''

''اچھا تو اس کا مطلب ہے مجھے آپ کی پیغام رسانی کرنی ہے۔ شاید اردو میں اسے ڈاکیا کہتے ہیں۔''

''نہیں قاصد... اردو میں محبت کے پیام لانے لے جانے والے کو قاصد کہتے ہیں۔''

''بڑے ڈھیٹ ہیں آپ۔'' اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ''مجبوری ہے اور محبت میں تو پتا نہیں کیا کیا بننا پڑتا ہے۔'' اس نے زخمی سے تبسم سے کہا ایک بار پھر ثمیرا کو اس پر ڈھیروں ترس آنے لگا۔

''چلیے ٹھیک ہے اب تو کہہ دیا ہے کہ کروں گی آپ کی مدد... سو یہ ہی سہی'' کچھ لمحے کے توقف کے بعد ابھی اس نے ثمیرا کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا تھا وہ اچانک بولی۔ ''ویسے بائی دا وے آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں گے کہ میں آپ کا وہ محبت بھرا پیام پڑھ سکوں؟''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو مجھ پر اب بھی پورا اعتبار نہیں ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل شرمین میری دوست ہے اور میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر آپ نے خط میں کوئی ایسی ویسی بات لکھ دی تو میں آپ کو بہتر مشورہ دے سکتی ہوں کہ آپ کو کیا لکھنا نہیں چاہیے۔'' ثمیرا نے بات بنائی حالانکہ حقیقت یہی تھی کہ وہ وہ اندر سے کہیں ڈر بھی

رہی تھی۔ اس نے سوچا اگر اس دیوانے نے خط میں کوئی ایسی ویسی بات لکھ دی تو وہ اپنی دوست کے سامنے کھڑے ذلیل ہو کر رہ جائے گی۔

''ٹھیک ہے آپ ضرور پڑھیں۔ اب سے آپ شرمین کی ہی نہیں میری بھی دوست ہیں، اس لیے میرے تمام معاملات میں آپ کو اختیار ہے۔'' اس نے اعتماد کا ایک اور بھاری بوجھ اس پر بڑھا دیا اور شرمین کو لگا وہ شاید یہ بوجھ سہار نہ سکے گی۔

☆......☆......☆

''تم آخر اس کی سفارشی بن ہی گئیں اور یہ قاصد بھی'' شرمین نے خط پڑھنے کے بعد اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے سمیرا کی طرف غور سے دیکھا تو اسے لگا سمیرا بہت بے وقوف ہے اور شاید نا سمجھ بھی۔

''میں تمہیں کیسے سمجھاؤں سمیرا، میں اس طرح کی محبتوں کی قائل نہیں ہوں۔ اسے سمجھاؤ وہ ایسی حماقتوں میں اپنا وقت برباد کرنے کے بجائے اپنی ایجوکیشن مکمل کرے جس کے لیے اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا۔'' شرمین نے پوری کوشش کی تھی کہ اس کے لہجے سے کوئی دوسرا تاثر سمیرا کو نہ مل سکے اس لیے وہ کافی نرم خوئی سے سنبھل کر بولی تھی۔ ''اچھا تو اب تم نے نصیحت کلینک کھولنے کا ارادہ بنایا ہے'' سمیرا جل ہی تو گئی اس کی بڑھیاؤں جیسی سوچ پر۔

''اس کا مطلب ہے تم بھرپور انداز میں اس کی وکیل بن کر آئی ہو۔'' شرمین کو سمیرا کا خلوص دیکھ کر ہنسی آگئی۔

''دیکھو شرمین بات وکیل ہونے یا دلیل دینے کی نہیں ہے، بات ہے محبت کی اور محبت کسی دلیل کسی نصیحت کو نہیں مانتی، وہ ایک سچا انسان ہے اور سچا پیار کسی کو بھی زندگی میں بار بار نہیں ملتا، وہ تم سے حقیقت میں سچی محبت کرتا ہے۔ تمہیں سمجھانا میرا کام تھا آگے جو بھی تمہاری مرضی۔'' وہ رکی تو شرمین کو اس کے خلوص سے ایک انسیت سی ہوئی ابھی اس کی بات ختم نہیں ہوئی تھی۔

''شرمین میری بات غور سے سنو شاید میں آخری بار تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ دنیا میں سب ہی کچھ پیسوں سے خریدا جاسکتا ہے حتیٰ کہ انسان بھی لیکن کسی انسان کی محبت وہ نایاب گوہر ہے جو ملتا مشکل سے ہے اور اگر مل جائے تو اسے خریدا نہیں جاسکتا۔'' سمیرا کے ترکش میں جتنے بھی دلائل کے تیر تھے۔ اس نے سارے پے در پے چھوڑ دیے۔

''مجھے معاف کرنا سمیرا میں اس قسم کی محبت کو نہیں مانتی۔ یہ دور ایسا نہیں ہے کبھی ہوا کرتی تھیں ایسی محبتیں پر اب ایسا نہیں ہوتا۔ لوگوں کے پاس اپنے بچوں کے لیے وقت نہیں ہوتا اور یہ موصوف چلے ہیں لیلیٰ مجنوں کے دور کی محبت کو زندہ کرنے'' اس نے نخوت سے کہا پھر قدرے ٹھہر کر نرمی سے بولی۔

''مجھے فکر ہے تو بس تمہاری دوستی کی۔ کیا تم مجھ سے اس بات کو لے کر ناراض ہو سکتی ہو؟''

''نہیں.... ایسا نہیں ہے میں کیوں ناراض ہوں گی تمہاری اپنی زندگی ہے اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار بھی تم ہی کو ہے۔ میرا فرض تھا تمہیں بتانا۔ میرا خیال ہے جو سچائی میں دیکھ رہی ہوں وہ شاید تمہیں نظر نہیں آرہی تو میں تمہیں دکھانا چاہتی تھی۔ لیکن تم اگر دیکھنا ہی نہیں چاہتیں تو میں کیا کرسکتی ہوں۔ فیصلہ تمہارا اپنا ہے اور مجھے اس فیصلے سے کوئی شکایت نہیں ہے'' سمیرا نے لاکھ وضاحت دی پر لمحے بھر کو شرمین کو یہ لگا کہ یہ اس کی وہ پہلی والی دوست سمیرا نہیں ہے۔

☆......☆......☆

اس بحث و تمحیص کے بعد سمیرا نے شرمین کے سارے جذبات و خیالات رامس کے گوش گزار کردیے۔ جیسے جیسے سمیرا بولتی جارہی تھی رامس کو یوں لگ رہا تھا اس کا دل دھیرے دھیرے بجھ رہا ہے اور اس کی سانسیں اتھل پتھل ہوتی جارہی ہیں۔

بات ختم ہوئی تو رامس کو لگا دل کی جگہ ایک گہرا اور عمیق گڑھا سا بن گیا تھا۔ جس میں گرنے کے بعد واپس باہر نکل آنا ممکن نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ہوا... ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سسکیاں بھر رہی ہو، تھوڑی دیر پہلے آس پاس کا ماحول رنگا رنگ اور چمکتا ہوا دکھائی دیتا تھا اب وہ ایک گمبھیر اداسی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ سچ ہے دل اداس ہو تو سارا شہر سائیں سائیں کرنے لگتا ہے۔ ایک ٹیس سی تھی جو رامس کے دل سے اٹھی اور سارا وجود دکھتا ہوا پھوڑا بن گیا۔ اسے لگا محبت کے میدان میں پہلے ہی مرحلے پر اسے شکست فاش ہو چکی تھی۔

سمیرا کے تعاون کرنے کے بعد تو اس کے دل نے گنگنانا سیکھ لیا تھا ہزاروں سپنوں کی بارات اس کے دل میں اور آنکھوں میں اترنے لگی تھی۔ زندگی اور اس کے ست رنگوں سے سجی ہوئی بارات..... جوان دلوں میں مچلنے والی آرزوؤں کے سپنے۔ ابھی تو سفر شروع بھی نہیں ہوا تھا اور اس کا زادہ سفر لٹ چکا تھا۔

سمیرا احساس دل و دماغ کی مالک لڑکی تھی۔ وہ رامس کا دکھ سمجھ سکتی تھی اسی لیے وہ زیادہ دیر اس کے پاس نہیں ٹھہری کیونکہ وہ اس کی ناکامی کا دکھ دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی تھی۔ شرمین کے ٹکا سا جواب دینے سے اس کا دل بھی کٹ کر رہ گیا تھا۔ پر وہ جانتی تھی محبت زبردستی کا سودا نہیں ہوتا جب شرمین کا دل ہی راضی نہیں تو اسے کیسے محبت کے ساگر میں چھلانگ لگانے کو کہا جا سکتا ہے۔ کیسی بے چارگی تھی وہ کتنی بے بس تھی اسے رامس کے دکھ نے آبدیدہ کر دیا۔ اور اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن نہیں کر سکی۔ کیا وہ اتنی زود رنج ہے کہ دوسروں کے دکھوں پر رونے لگتی ہے اس نے اپنے آپ سے پوچھا.. لیکن اس کے بہتے ہوئے آنسو ہی اس کے سوال کا جواب تھے۔ خاموشی اور ماحول میں بڑھتے ہوئے حبس کو محسوس کر کے اس نے ایک اچٹتی سی نظر لٹے ہوئے رامس پر ڈالی اور تیز تیز چلتی ہوئی پختہ راہداری عبور کر گئی۔ اب وہ یونیورسٹی میں ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے لگا بے حسی نے انسانوں کو سالم نگل لیا ہے اور اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔

☆......☆......☆

اس کے بعد رامس کبھی یونیورسٹی میں دکھائی نہیں دیا۔ اس نے مارے تجسس کے معلوم کیا تو اسے پتا چلا کہ وہ اب ٹھیک وقت پر آتا ہے اور آتے ہی کلاس میں چلا جاتا ہے اس کے بعد کہیں اِدھر اُدھر نہیں جاتا اور ٹائم ختم ہوتے ہی واپس چلا جاتا ہے۔ اسے اب یونیورسٹی کی بھرپور زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی... جیسے وہ زندگی کو نہیں زندگی اسے گزار رہی ہو۔

دن گزرے ہفتے مہینوں میں بدلے اور مہینے سال بن گئے۔ اس کے بعد سمیرا کی کبھی شرمین سے اس ٹاپک پر بات نہیں ہوئی شرمین کو تو یوں بھی یہ احساس تک نہیں تھا کہ اس کے انکار کی بجلی نے کسی کے خرمن دل کو کیسے خاکستر کر دیا تھا۔ وہ تو اب بھی ویسے ہی جی رہی تھی جیسے اس واقعے سے پہلے جیا کرتی تھی۔ چاہتے ہوئے بھی سمیرا اسے کوئی الزام نہیں دے سکتی تھی کہ یہ اسے تسلیم کرنا ہی پڑتا تھا کہ شرمین کا اس سارے معاملے میں کوئی قصور نہیں تھا یہ تو رامس کا ہی نصیب خراب نکلا جو اتنی ڈھیروں ڈھیر محبت کے بعد بھی ایک لڑکی اس کی نہ بن سکی۔

☆......☆......☆

تعلیمی سلسلہ تمام ہوا تو اس کی شادی ہو گئی۔ علی اس کے خاندان کا پہلا امیدوار تھا جو اسے بھی پسند تھا۔ ماں باپ نے رائے پوچھی تو اس نے اقرار ایسے کیا جیسے انکار کر رہی ہو اور پھر ایک دن چپکے سے وہ سمیرا علی بن گئی۔

شرمین اس کی شادی میں پوری بھرپوریت سے شریک ہوئی۔ قدم قدم پر وہ اس کے ساتھ رہی۔ ساری

شاپنگ اور دیگر رسومات سب میں اور آخری دن دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں۔ اس کی شادی کو ابھی تین مہینے بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ شرمین کا رشتہ بھی ایک مل اونر کے بیٹے سے طے پا گیا۔ سیٹھ خاکوانی کا بیٹا شہزاد بظاہر ایک شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ شرمین کی جوڑی اس کے ساتھ بہت جچ رہی تھی اور یوں شرمین بھی ایک روز بیاہ کر شرمین شہزاد ہو گئی۔

☆......☆......☆

وہ خوبصورت رات جو ہر انسان کی زندگی میں ہزاروں خوشیاں اور آرزوؤں کی تکمیل کی رات ہوتی ہے اور کچھ اَن دیکھے انجانے سپنے حقیقت بن جاتے ہیں شاید شرمین کو بھی ایسا کچھ محسوس ہوا ہو۔ ابتدائی دن کچھ ایسے گزرے کہ وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا لیکن جب شہزاد اپنے والد کے کاروبار میں مگن ہوا تو جیسے شرمین کسی مختصر خواب سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ گئی۔ شہزاد راتوں کو دیر سے گھر آتا تو شرمین باوجود کوشش کے بھی اس سے گلہ نہ کر پاتی کہ اس کا خیال کیوں نہیں آتا دن بھر میں ایک فون تک کرنا بھول جاتا ہے۔ کاروباری انسان اس قسم کی باتوں کو چونچلوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ شہزاد کی اپنے دوستوں کے بارے میں کی گئی گفتگو سے شرمین محتاط ہو گئی تھی کہ وہ ایسا ہی ہے۔

ایک دو دن تک تو اس نے کھانا اسی کے ساتھ کھایا پھر یوں ہونے لگا کہ وہ اپنی کاروباری پارٹیوں کے ساتھ ارینج لنچ اور ڈنر کرنے لگا۔ شرمین کی زندگی میں جو ایک مصروفیت تھی وہ بھی تنہائی میں بدل گئی۔ صبح سے شام تک وہ گھر میں پڑی رہتی۔ زیادہ دل گھبراتا تو بالکونی میں آ جاتی۔ مگر باہر کے اجنبی ماحول سے جلد ہی اکتا جاتی۔ اسے لگتا جیسے لوگ اسی کو دیکھ رہے ہیں۔ ٹی وی دیکھنا اور رسالے کتابیں پڑھنا اس کا کبھی مشغلہ نہیں رہا تھا لیکن اب یہی اس کے وقت گزاری کا سہارا بن چکے تھے۔ دل پھر بھی اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہیں چلی کیوں نہیں جاتی۔ امی کے گھر چلی جائے، دوستوں میں نکل جائے، کہیں بھی وقت کا کیا ہے گزر ہی جاتا ہے۔ لیکن جب کہیں جانے کو دل نہ چاہے اور کہیں کسی ماحول میں دلچسپی نہ محسوس ہو تو وقت کاٹے نہیں کٹتا اس لیے وہ کہیں جاتی بھی نہیں تھی کیونکہ سب ہی اس سے یہ سوال کرنے کو بے چین ہوتے تھے کہ وہ اکیلی کیوں ہے۔ ابھی شادی کو وقت ہی کتنا ہوا ہے اس کا شوہر اس کے ساتھ کیوں نہیں ہے۔ گھر کے کام تو اس نے اپنے گھر میں بھی کبھی نہیں کیے تھے اور یہاں تو گھر کے کاموں کے لیے نوکروں کی فوج اس کے گھر سے بھی زیادہ تھی۔ سیٹھ خاکوانی اس کے شوہر سے بھی پہلے گھر سے چلے جاتے تھے اور اس کی ساس...... انھیں تو سوشل ورکر بننے کا بھوت سوار تھا۔ ان کی اتنی جگہوں پر اپوائنٹ منٹس اور پارٹیاں ہوتیں کہ انھیں یہ سوچنے کا موقع نہیں ملتا تھا کہ اتنے بڑے گھر میں شرمین کتنی اکیلی رہ جاتی ہے جیسے سب اپنی اپنی دنیاؤں میں مگن تھے اور اس کی دنیا... وہ تو شہزاد کے دم سے آباد ہوئی تھی جسے اپنے کاروبار سے زیادہ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کو بہت سا روپیا، گہنے اور سہولتیں چاہیے ہوتی ہیں۔ انھیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ عورت کو اس کے علاوہ جو چاہیے وہ ان سب چیزوں سے زیادہ اہم ہے اور وہ ہے اپنے شوہر، اپنے ساتھی کا پیار جس سے شرمین کا دامن یکسر خالی تھا۔ تنہائی اور وحشت زدہ ماحول سے گھبرا کر اس نے شہزاد کے کہنے پر ہی کچھ دنوں تک اپنی ساس کے ساتھ ان کی تقریبات میں جانا شروع کر دیا لیکن اس کا دل ان مصنوعی اور دکھاوے کی پارٹیوں سے بھی جلد ہی بھر گیا اور وہ پھر سے اکیلی رہنے لگی۔

☆......☆......☆

شہزاد بس ایک شوہر تھا۔ ایسا شوہر جس کی بس ایک ہی ذمہ داری تھی جسے وہ فرض سمجھتا تھا اور وہ یہ شرمین کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ اسے پوری کر دیتا۔ لہٰذا شرمین کو دنیا کے عیش و آرام کی کوئی کمی نہیں تھی۔ کپڑا زیور، ہر فیشن کے جوتے اور سینڈلز، میک اپ کا وافر سامان سب کچھ اس سے زیادہ تھا جو اس کی شادی سے پہلے اس کے پاس ہوا کرتا تھا۔ پر سب کچھ ہونے کے باوجود شرمین کو لگتا تھا جیسے وہ دنیا کی سب سے غریب عورت ہے۔ جس کا شوہر اس کا ہوتے ہوئے بھی اس کا نہیں ہے۔ وہ بس کاروبار سے محبت کرتا ہے۔ انسانوں کی اس کی نظر میں ایسی ہی وقعت تھی جیسے کسی بے جان چیز کی ہوا کرتی ہے۔ چیز جتنی مہنگی ہو اس کی اتنی ہی قدر کرنی پڑتی ہے اور بیوی وہ تو ہمیشہ سے سستی ہی ہوتی ہے گھر میں پڑی جو مل جاتی ہے اور وہ بھی ضرورت اور بلا ضرورت دونوں صورتوں میں...تو بیوی کی قدر کوئی شہزاد جیسا شوہر کیسے کر سکتا ہے۔ وہ اکیلی تھی، تنہا تھی اور اس کی زندگی بے رنگ تھی۔ اسے یوں لگتا تھا پہلے زندگی میں جو رنگ تھے وہ بھی پھیکے پڑ گئے ہوں۔

ان سارے خیالات اور اندر کے بڑھتے ہوئے حبس نے آخر ایک دن شکوہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس نے شہزاد سے پوچھا۔

''کیا آپ کو کبھی فرصت ملے گی؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں'' وہ جلدی جلدی کوٹ پہنتے ہوئے بولا۔

''میرا مطلب ہے کتنے ہی دن ہو گئے ہیں جب آپ نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا میں کیسی ہوں، کیا کرتی ہوں سارا دن۔ نہ ہی کبھی آپ کو مجھے کہیں ساتھ لے جانے کا خیال آیا؟'' اس نے شہزاد کی بے اعتنائی کا اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

''ہاں یہ تو ہے'' ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے اس نے کہا ''ہاں تو کل چلیں گے نا'' ایک ہلکی سی امید نے سر ابھارا اور ایک نئی خوشی کا موسم اس کے دل کے دروازے پر دستک دینے لگا۔

''کل چلیں گے میں ذرا اپنا شیڈول دیکھ لوں۔ کل کہیں کسی کے ساتھ میٹنگ تو نہیں ہے'' اتنا کہہ کر وہ اپنا فون چیک کرنے لگا اور ان لمحوں میں اس کا دل زور زور سے دھڑکتا رہا...

''سوری یار کل تو مجھے ایک بہت ضروری ڈسکشن میں جانا ہے۔ ایک پارٹی ہے اس سے کچھ معاملات فائنل کرنا ہیں۔ بہت ضروری ہیں'' اس نے شرمین کی طرف دیکھا جس کا چہرہ بجھ چکا تھا وہ پھر بولا۔

''تم یوں کیوں نہیں کرتیں کسی کے ساتھ چلی جاؤ۔''

''مثلاً کس کے ساتھ؟'' وہ جل کر بولی۔

''ہوں....ہم...مما کے ساتھ...نہیں وہ تو یقیناً بزی ہوں گی...کیا تمہاری کوئی دوست نہیں ہے اس کے ساتھ چلی جاؤ۔''

''اگر دوست کے ساتھ ہی اب بھی جانا ہے تو پھر تم سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی'' اس نے دل میں سوچا پر پتا نہیں کیوں وہ کہہ نہیں سکی چپ رہی۔ وہ بڑ بونگ میں جلدی جلدی ناشتہ کر کے بائی کرتا ہوا چلا گیا اور اسے یوں لگا جیسے تنہائی کا جنگل اس کے آس پاس تیزی سے اگا اور اس کے سارے وجود کو نگل گیا۔

انسان تنہا ہو تو سوچیں خود بخود دماغ میں گھسی چلی آتی ہیں۔ وہ کسی مصروفیت کے بارے میں سوچنے لگی بہت سوچنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کرے۔ ظاہر ہے ملازمت وہ کر نہیں سکتی تھی۔ ساس کی مصروفیات سے اسے چڑ تھی اور شہزاد کی بزنس میٹنگوں میں وہ شدت سے بور ہوتی تھی تو پھر کیا کروں؟ اس نے دکھ سے سوچا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا

گئیں۔ اسی وقت بجلی کی سرعت سے ایک خیال نے اس کے ذہن کے دروازے پر دستک دی۔

''کیوں نہ ثمیرا سے مشورہ کرلیا جائے آخر وہ میرے بچپن کی دوست ہے اور ہمیشہ سے مشورے دینے کی تو ماہر ہے۔تو کیوں نا اب بھی اسی سے پوچھوں کہ ایسی مار دینے والی تنہائی کا اس کے پاس کیا علاج ہے؟'' اس نے سوچا اور آنسو پلکوں پر رک سے گئے۔ٹمٹماتی ہوئی امید کا ایک سرا اس کے ہاتھ آیا اور وہ گاڑی نکال کر ثمیرا کے گھر کی طرف چل دی۔ سارے راستے وہ ثمیرا سے ملنے کی خوشی کے احساس کو دل میں محسوس کرتی رہی۔ایک ہی شہر میں ہوتے ہوئے بھی ہم کس قدر اجنبی ایک دوسرے کے لیے ہو چکے ہیں،اس نے سوچا۔ثمیرا پتا نہیں کیسی ہوگی۔ ملے گی تو کہوں گی۔ بڑی بے مروت ہو،شادی کے بعد خبر تک نہیں لی۔ پھر وہ سوچنے لگی...لڑکیوں کی بھی کیا زندگی ہے جیسے شادی کے بعد ان کا سب کچھ ہی بدل جاتا ہے رشتے اور ذمہ داریاں اور سب سے زیادہ اپنا گھر...وہ سوچتی رہی''میں نے بھی تو اس کی خیریت کے بارے میں کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی!'' اسے اپنی کوتاہی یاد آئی تو اس نے سارے شکوے اور گلے کرنے سے خود کو روکنے کا فیصلہ کیا اور دل میں کہا اتنے عرصے بعد ملاقات ہوگی تو بس خوب اچھی طرح ملوں گی کچھ اس کی سنوں گی اور کچھ اپنی سناؤں گی...

☆......☆......☆

گاڑی پارک کر کے ثمیرا کے گھر تک پہنچنے تک میں اسے یوں لگنے لگا جیسے اداسی اور تنہائی نے اس کا اس سے بھی زیادہ اسپیڈ سے پیچھا کیا ہے، جتنی تیز اس نے گاڑی چلائی تھی۔

ثمیرا کی ساس نے اسے بتایا کہ ثمیرا بیٹے کی پیدائش کے بعد کافی کمزور ہوگئی تھی۔تو علی اسے اٹلی لے گیا ہے۔ ثمیرا کو ہمیشہ سے رومیو اور جیولٹ کے شہر وینس جانے کا ارمان تھا۔علی نے اس کی خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کرلیا اور دونوں تین دن پہلے ہی گئے ہیں۔''

اوہ خدا ثمیرا کا نصیب کتنا اچھا نکلا ہے۔اس کا اپنا شوہر تو اسے شہر میں کہیں اس کی مرضی سے لے کر نہیں جاتا اور ثمیرا کا شوہر اسے وینس تک لے گیا۔واقعی ثمیرا تم بہت لکی ہو۔

سارے راستے وہ ایک عجیب فرسٹریشن کا شکار رہی اس کا دل چاہ رہا تھا گاڑی کو کہیں دے مارے اور مر جائے۔اس کی بھی کوئی زندگی ہے۔اسے ثمیرا کی خود غرضی پر بھی غصہ آرہا تھا جس نے جانے سے پہلے بتانا تک ضروری نہیں سمجھا...پتا نہیں کہیں وہ اس سے ناراض تو نہیں تھی اور وہ کیوں بتاتی ایسا بھی تو حق نہیں بنتا اس کا ثمیرا پر...پھر شادی کی مصروفیات نے اور دوسری زندگی نے اسے بھی تو بدل دیا ہوگا۔وہ بیٹے کی ماں بن گئی اور مجھے خبر تک نہیں ہوئی لیکن میں نے بھی تو بے اعتنائی دکھائی ہے اپنی سب سے اچھی دوست کو یوں بھول کر۔واقعی انسان کو اپنے دکھ کے سامنے کسی اور کا دکھ...کچھ نہیں لگتا۔مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ دنیا میں میرے غم کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔عجیب سی کیفیت میں وہ شہر کی لمبی اور سنسان سڑکوں پر ایسے ہی بے مقصد گاڑی دوڑاتی رہی اور جب تھک گئی تو اسٹیئرنگ کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا۔کتنی بے کیف اور بے مزا زندگی ہے اس کی...یہ سوچتے ہوئے اس نے خاکوانی پیلس میں گاڑی داخل کی۔ پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی تو اسے ٹیبل پر ایک لفافہ رکھا ہوا ملا پہلے تو وہ حیران ہوئی اور حیرانی اس وقت دو چند ہوگئی جب اس نے دیکھا کہ لفافہ کوریئر سے آیا تھا۔انجانے احساس کے ساتھ اس نے لفافہ چاک کیا تو اندر سے ثمیرا کا خط برآمد ہوا۔

پیاری شرمین!

ملک چھوڑتے وقت کچھ ایسی عجلت اور بیزاری میں رہی کہ تمہیں فون بھی نہیں کر سکی اور جو کچھ مجھے تمہیں بتانا تھا۔ اسے میسج سے بتانا مشکل لگ رہا تھا اس لیے یہ خط لکھ رہی ہوں جو تمہیں میرے جانے کے بعد ہی ملے گا... میں ایک بیٹے کی ماں بن چکی ہوں۔ تمہیں یہ اطلاع بھی اسی خط سے دے رہی ہوں۔ شاید یہ سن کر تمہیں اچھا نہ لگے کہ میں نے اپنے بیٹے کا نام رامس رکھا ہے۔ یقیناً اس نام سے تمہیں کچھ یاد آگیا ہوگا۔ بالکل صحیح... میں تمہیں اسی فضول سے اور پیٹ بھر کے احمق عاشق کی یاد دلا رہی ہوں۔ جس کی محبت کو تم نے قابل اعتنا نہ سمجھتے ہوئے بڑی بے نیازی سے ٹھکرا دیا تھا۔ تمہیں یہ سن کر شاید افسوس ہو کہ وہ احمق گزشتہ دنوں سرحدی جھڑپوں میں جام شہادت نوش کر گیا۔ یونیورسٹی کے ختم ہونے کے بعد اس کی زندگی میں کوئی رنگینی اور کوئی ایسا احساس اور امید باقی نہیں رہی تھی۔ جس کے سہارے وہ زندگی میں کچھ کرنے کا فیصلہ کرتا۔ اسے لگا کہ ایسی مایوس اور بے رنگ زندگی کو کچھ نہیں تو کم سے کم اپنے وطن پر ہی قربان کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کی زندگی اور اس کے جینے کا مقصد صرف تم تھیں اور جب تم ہی نہیں رہیں تو وہ کیا کرتا۔ تم شاید مجھ سے بھی ناراض ہوگی کہ میں اس سے رابطے میں تھی بلکہ یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ وہ مجھ سے رابطے میں تھا اور جب بھی رابطہ کرتا تھا تو تمہارے بارے میں ضرور پوچھتا تھا۔ صرف یہ کہ تم خوش تو ہو کیسی ہو.. وغیرہ۔ محبت کی جو جنگ اس نے تمہارے محاذ پر ہار دی تھی اسے وطن کا دفاع کرتے ہوئے جیت گیا۔ پاکستان سے جاتے ہوئے میں نے اسے بھی فون کیا تو فون اس کے کسی رشتے دار نے اٹھایا اور جب انہوں نے اس کی شہادت کی خبر سنائی تو میں اس سے زیادہ کچھ اور نہیں سن سکی... خوش ہو کر وئیں جانا چاہتی تھی پر اب دل پر ایک بوجھ سا لے کر جا رہی ہوں۔ کس سے شیئر کروں... کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا تم واحد ہو جو اسے جانتی ہو اس لیے تمہیں بتا کر اپنا دل ہلکا کر رہی ہوں اور اندر کہیں یہ احساس بھی ہے کہ تمہیں بتانے سے فرق بھی کچھ نہیں پڑے گا کیونکہ تم تو ایک پریکٹیکل لڑکی ہو۔ جسے ایسے حادثوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے میں مجبور تھی تمہیں بتانے کے لیے پتا نہیں کیوں؟ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا!

خدا کرے تم ہمیشہ خوش رہو

تمہاری کیسر اعلیٰ

خط ختم ہوا تو درد کی ایک تیز لہر اس کے سارے وجود میں دوڑنے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی طوفان اس کے اندر ہی اندر ہلچل مچا رہا ہو...اسے اپنا وجود چٹختا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ درد کی ٹیسیں دل کے اندر تک اتر گئیں اور اسے لگنے لگا اس کا جسم بھربھری دیوار کی طرح جھڑنے لگا ہو۔ آنسوؤں کا سیلاب آنکھوں کے ساحل تک آپہنچا اور اس کی چیخیں آہستہ آہستہ آنسوؤں میں بہنے لگیں۔ بے یار و مددگار ایک معصوم اور جانا پہچانا سا سایہ اسے اپنی لپیٹ میں لینے لگا، اس پر چھانے سا لگا۔ اسے ایسا دکھائی دیا جیسے رامس اسے دیکھ کر مسکرا رہا ہو...اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کتنی دیر وہ ان خیالوں میں ہوش و خرد سے بیگانہ رہی....وقت کب اور کہاں سے رستا رہا...اسے خبر تک نہیں ہوئی اور کوئی بارہ سال بعد جب شہزاد نے اس سے یہ کہا کہ تم نے مجھ سے گلہ کرنا کیوں چھوڑ دیا۔ کوئی شکایت کوئی شکوہ کیوں نہیں کرتیں اب...تو اس نے زخمی سی مسکراہٹ سے شہزاد کو دیکھا اور ہمیشہ کی طرح صرف سوچا کہا کچھ نہیں....!

"وہ کوئی تھا جو مجھے جینا سکھا گیا۔"

☆☆......☆☆

''اماں۔ صحیح تو کہتی ہیں۔ تمہیں جادو آتا ہے۔ جب ہی تو مجھ جیسے ہینڈسم پر قبضہ جمایا ہوا ہے۔ شان اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوا'' پھوپی۔ اماں کی تو رہنے ہی دو۔ انہیں ''اپنی چیزیں لاکھ کی اور دوسرے کی خاک کی دکھائی دیتی ہیں''۔ اس نے بھی......

رشتوں کی خوب صورتی لیے، ایک خوب صورت افسانہ

''شان...... سنو تمہیں اس بار پورے روزے رکھنے ہیں اور تراویح بھی مکمل پڑھنی ہے۔'' زیتون بانو نے چھڑی کی نوک نواسے کو چبھو کر کہا۔

''جی نانی ٹھیک ہے۔'' شان نے دانت کچکچا کر عمرہ کو دیکھا جو منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔

رمضان شروع ہونے میں ایک مہینہ رہ گیا ہے۔ اپنے سارے بہانوں کا سد باب خود ہی کرلو۔'' وہ چشمے کی کمانی درست کرتے ہوئے دوبارہ بولیں۔ ''نانی کیسا سد باب؟'' عمرہ نے مزید آگ لگائی۔

''ارے آج کل کے لڑکے، توبہ، توبہ، پنڈلیوں سے چپکی پتلون پہنیں رہیں گے تاکہ نماز اور تراویح کے لیے بہانے بناسکیں کہ گھٹنے موڑے نہیں جاتے، زمین پر بیٹھا نہیں جاتا۔'' انہوں نے ہاتھ نچا نچا کر ایسی اداکاری کی کہ عمرہ پیٹ پکڑ کر ہنستی چلی گئی۔

''نانی کو اگر ایکٹنگ کا موقع ملتا تو، شاید 'پرائڈ آف پرفارمنس' ان کو سب سے پہلے مل جاتا''۔ شان نے اپنی جینز پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔

''ماں سے کہہ دو رمضان کے لیے سارے کرتے شلوار دھلوا کر رکھ دیں۔'' زیتون بانو دوبارہ شروع ہوئیں تو شان کو وہاں سے اٹھنے میں ہی عافیت محسوس ہوئی۔ عمرہ اس کو جاتا دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی۔

☆......☆......☆

''شڑاپ۔ شڑاپ'' عمرہ سر جھکائے رگڑ رگڑ کر فرش دھونے میں مگن تھی، اچانک اس کا وائپر چمکتے کالے جوتوں سے جا ٹکرایا۔ گلابی نرم و نازک ہاتھ وہیں ٹھہر گئے، سر اٹھا کر دیکھا تو شان کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ عمرہ نے اس کی نئی جینز جو بھگو دی تھی، جوتوں پر الگ مٹی کے نقش و نگار چھپ گئے۔

پاگل تو نہیں ہو۔ جواندھوں کی طرح کام کر رہی ہو'' وہ جلبلایا، آج ہی نئی جینز پہنی تھی۔

''مجھ سے کچھ کہا؟'۔ عمرہ کے ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ ابھری، جانتی تھی کہ اندر ہی اندر کھول رہا ہوگا۔

''میں، تم جیسی لڑکیوں سے بات کرنا بھی پسند

نہیں کرتا'' شان نے جھک کر پائنچے موڑتے ہوئے اسے ایک لمحہ دیکھا اور سنجیدگی سے بدلہ اتارا۔
اچھا۔ تو جاؤ۔ گرمی میں سوئمنگ پول کے مزے لو' عمرہ نے جل کر پانی کی بھری بالٹی اٹھا کر اس کے پیروں کے قریب خالی کر دی۔ ایک ریلا سا آیا اور وہ بوکھلا کر سیدھا ہوا۔ جوتے موزے سب بھیگ گئے،
تم۔ کیسی لڑکی ہو؟'' شان نے سر پر ہاتھ مار

وجود سے اٹھنے والی پیاری سی مہک۔ اس کی موجودگی کا فوراً پتا دیتی تھی۔ ''سدھر جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں۔ گن گن کر بدلے لوں'' شان نے چہرے پر ویلن اسٹائل میں تاؤ دیا۔ وہ ہنس دی۔
''ارے۔ جاؤ۔ بہت دیکھے تمہارے جیسے''۔ عمرہ نے اس کے سامنے ہلکا سا جھک کر سلام پیش کیا اور بالٹی اٹھا کر اندر کی جانب قدم

کر دانت پیسے۔ ''ایسی ہی ہوں میں۔ بہت خاص'' عمرہ نے صراحی دار گردن اونچی کی تو شان کے دل نے بھی اس کے غرور کی تائید کی۔
دودھ سی رنگت، مکھن سے نرم و نازک ہاتھ پاؤں۔ سرمئی آنکھیں۔ اس پر کالے گھٹاؤں جیسے بال۔ متناسب سراپا۔ سرخ قمیض اور سیاہ چوڑی دار پائجامے میں ملبوس۔ وہ واقعی بہت خاص تھی۔ ہوشربا

بڑھا دیے۔ شان کا سحر ٹوٹا۔ اس سے قبل کے وہ کچھ اور کہتا، عمرہ یہ جا وہ جا ہو گئی۔

☆......☆......☆

''عمی۔ بیٹا۔ زرا یہ ساگ چڑھا دو گی۔؟ آج نگوڑی مائی بنا بتائے چھٹی کر بیٹھی ہے۔'' زیبا نے پالک کاٹنے کے بعد عمرہ کو ٹوکری پکڑاتے ہوئے کہا۔ وہ ایسے موقعوں پر بڑے پیار سے بات کرنے کی عادی تھیں۔

"توبہ۔ ایسے پھیلاوے میں کیسے کام شروع کروں؟" عمرہ جیسے ہی کچن میں داخل ہوئی، وہاں کی گندگی دیکھ کر سر چکرا گیا۔

"مائی چھٹی کیا کر لیتی ہے، اس گھر کا تو حال ہی برا ہو جاتا ہے۔" اس نے وحشت کے عالم میں سر گھما گھما کر دیکھا۔ پہلے دوپٹہ کمر کے گرد کس کر باندھا، پھر سارے گندے برتن دھوئے۔ عمرہ نے اوون رگڑ رگڑ کر چمکایا، اس کے بعد سارا کچن دھو ڈالا۔

"سگھڑ لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ پہلے سے سسرال میں کام سنبھال کر نمبر بڑھانے لگتی ہیں" عمرہ ساگ گوشت چڑھانے کے بعد ہاتھ دھو کر پلٹی تو دروازے پر شان کو ایستادہ پایا، جو اسے چھیڑنے میں خاص لذت محسوس کرتا۔

"بس کر دو۔ "سسرال"۔ جناب یہ میرا پھوپو کا گھر ہے۔ آئی سمجھ۔"۔ عمرہ نے فوراً دوپٹہ کھولا اور پھیلا کر اوڑھا پھر منہ چڑا کر کہا۔

"اچھا۔ یار اپنے حسین ہاتھوں سے ایک کپ چائے تو بنا دو" شان نے اس کا خراب موڈ دیکھ کر مسکہ لگایا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو۔"؟۔" زیبا کی انٹری ہمیشہ بروقت ہوتی تھی۔ عمرہ سراسیمہ سی ہو گئی۔

"کچھ نہیں۔ عمرہ سے۔ ایک کپ چائے کا کہنے آیا تھا" شان نے آرام سے جواب دیا۔

"عمرہ۔ کو اس کی ماں مریم آواز دے رہی ہے۔ اسے جانے دو۔ میں ریما سے چائے بنواتی ہوں" زیبا نے بہانہ گھڑا۔

"مجھے نہیں پینی چائے" شان کو ماں کی خود غرضی بری لگی۔ منہ بنا کر منع کر دیا۔

"کام پڑا تو بھائی، بھیا۔ ورنہ۔ تو کون۔ میں کون"۔ عمرہ کو پھوپی اماں کی جاسوسی کرنے کا انداز بہت برا لگتا تھا، اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔

"جی۔ مجھے ویسے بھی کافی دیر ہو گئی ہے" عمرہ نے جواب دیا اور سائیڈ سے نکلتی ہوئی اپنے گھر روانہ ہو گئی، شان عمرہ کو منانے کے لیے اس کے پیچھے بھاگا۔

"بیٹا۔ تمہارا انتظام بھی۔ کرتی ہوں۔ سر سے۔ عشق کا بھوت نہیں اتارا تو نام بدل دینا"۔ زیبا نے آنکھیں سکیڑ کر سوچا۔

"شبنم کی رشتے لگانے والی نے جس امیر لڑکی کا بتایا ہے، وہیں رشتے کی بات چلاتی ہوں، ورنہ۔ نانی۔ نواسا ملی بھگت سے عمرہ کو میری بہو بنا کر ہی دم لیں گے" زیبا نے کچھ سوچا اور بہن کو فون کرنے چل دیں۔

☆......☆......☆

زیتون بانو کی شبنم اور زیبا دو بیٹیاں اور ایک بیٹا وحید مراد تھا، زیبا کو فلموں کا جنون، ماں سے وراثت میں ملا، پہلے وہ ہر پاکستانی فلم کا فرسٹ شو دیکھنے سینما پہنچ جاتی، مگر آج کل کیبل نے ان کی مشکل آسان کر دی۔ انہوں نے ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے بچوں کے نام بھی فلمی اداکاروں پر رکھے۔ بیٹیوں۔ ریما اور میرا کی شادی ہو چکی تھی۔ اب گھر میں ریشم اور شان بچے تھے۔۔ بھائی ندیم کی رہائش ان کے برابر والے گھر میں ہی تھی، اسی لیے عمرہ دن میں ایک بار پھوپو زیبا کے گھر کا چکر ضرور لگاتی،، وجہ اس کا خوبرو کزن "شان" تھا۔

وہ دونوں دل ہی دل میں ایک دوسرے کو چاہتے تھے، مگر کبھی زبان سے اظہار کی نوبت نہیں آئی۔ دونوں میں خوب بنتی تھی، مگر اختلاف بھی خوب ہوتا۔ اسی وجہ سے۔ اکثر وہ ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو دوڑتے۔

وحید مراد کی بڑی بیٹی ناعمہ چھوٹی بہن عمرہ کو بہت سمجھاتی کہ پھوپو کبھی بھی تمہیں بہو نہیں بنائیں گی۔ وہ تو اونچے گھر کی بہو لانے کی خواہش مند ہیں اس لیے، شان کا خیال دل سے نکال دو مگر وہ اس

معاملے میں مجبور تھی۔ ویسے بھی اسے اپنی دادو ماں زیتون بانو کی خواہش کا علم تھا، وہ ہمیشہ سے ان دونوں کی شادی کا خواب دیکھتی آئی تھیں،۔ عمرہ اسی وجہ سے بہت پر امید تھی کہ وہ شان کی ڈولی میں بیٹھ کر ہی رخصت ہوگی۔ زیتون بانو کی خواہش کا علم ہونے کے باوجود زیبا، آج کل بہو ڈھونڈنے کی مہم میں مصروف تھیں۔ جس پر ماں بیٹی میں ٹھنی رہتی۔

☆......☆......☆

''زیبا۔ آپ نے جوس کو تو ہاتھ ہی نہیں لگایا''۔ مسز خان نے نزاکت سے ٹشو سے وائن گلاس تھام کر پیش کیا۔ ان کی انگلیوں میں سجی ہیرے کی انگوٹھیوں کی جھلملاہٹ سے آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔

''نہیں۔ میں لیچی کا جوس نہیں پیتی۔ البتہ ایک کیک کا پیس اور لے لیتی ہوں'' زیبا نے اپنی لبالب بھری پلیٹ میں چاکلیٹ کیک کے لیے جگہ بنائی۔

''ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں آپ لوگ بھی کچھ اور لیں نا۔ سرکل میں تو ہمارے کک کے بنائے ہوئے کبابوں کی دھوم ہے''۔ مسز خان نے کے ہر انداز میں اتراہٹ۔ دکھاوا۔ نمایاں تھا

''واقعی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہر چیز بہت ذائقہ دار ہے''شبنم نے مسکرا کہا اور کانٹے سے کباب پھنسا کر اپنی پلیٹ میں رکھا،

''آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ہم پھر بات طے کرنے کب آئیں'' کباب کھاتے ہوئے، زیبا نے مشکل سے پوچھا، وہ یہاں کی چکا چوند سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوگئی تھیں۔

''سو بار آئیں جی، لیکن ابھی تو آپ نے ہماری لڑکی دیکھی کہاں ہیں؟''مسز خان نے نازک نقشین پیالی لبوں سے لگا کر گرین ٹی کا ایک سپ لیا اور حیران ہو کر پوچھا۔ مسز خان نے اب تک ایک چیز بھی منہ میں نہ رکھی تھی شاید، ان کی اسمارٹنس کا یہ ہی راز تھا۔

''بہن۔ بڑے بوڑھے۔ کہتے ہیں کہ'' جس گھر بٹی لینی ہو، بس اس کی ماں کو دیکھ لو''۔ سچ جانئے۔ ہمیں آپ سے مل کر اتنی خوشی ہوئی۔ بتا نہیں سکتے،۔ ہمیں یقین ہے۔ پنکی بھی آپ کے جیسی ہی ہوگی''۔ زیبا نے خوشامد کی انتہا کر دی۔

مسز خان کی نگاہوں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ دونوں بہنیں اپنی جگہ پر سکڑ کر رہ گئیں۔

☆......☆......☆

''ہائے۔ مما۔ اوہ۔ سوری۔ اسلام علیکم'' پنکی کمرے میں داخل ہوئی۔ عادتاً۔ ہائے کیا۔ مگر ماں کی غصہ ور نگاہوں سے سہم کر جلدی سے سلام کیا۔ ان دونوں نے لڑکی کا بغور جائزہ لیا۔ اپنے نام کی طرح گلابی رنگت۔ سنہری آنکھیں۔ چھوٹا سا دہانہ۔ نازک سے سراپے پر۔ جینز۔ اس پر اونچا کرتا، گلے میں اسکارف نما دوپٹہ۔ بے تکلفی سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔ زیبا نے مسکرا کر خوش آمدید کیا۔ اگر وہ لالچ کی پٹی اتار کر دیکھتی تو ان کے گھر کے روایتی رہن سہن اور پنکی ایک دوسرے کے متضاد دکھائی دیتے۔ مگر انہیں تو پیسے والی بہو لانے کا بھوت سوار تھا، اسی لیے بہن شبنم کے ساتھ سب سے چھپ کر لڑکی دیکھنے اس بڑے سے بنگلے میں چلی آئیں۔

''۔ صاحبزادے۔ آفس کیسے جاتے ہیں؟''مسز خان ان لوگوں کے مالی حالات کا اندازہ لگانا چاہتی تھیں، حلیہ اور بات چیت کے انداز سے تو پسماندہ سی دکھائی دیں۔

''ہاں۔ ہاں۔ موٹر سائیکل پر دفتر آتا جاتا ہے'' زیبا نے فخریہ بتایا۔ مسز خان کا منہ بن گیا۔ یہ لوگ ان کے معیار سے۔ بہت پست نکلے۔

''مما۔ مجھے اپنی فرینڈز کے ساتھ شاپنگ پر جانا ہے۔ جاؤں؟'' پنکی نے بیزار ہو کر پوچھا

''جی۔ سویٹ ہارٹ۔''مسز خان کی اجازت پر وہ

سب کو گڈ بائے کرتی باہر نکل گئی۔ان خواتین کے دیکھنے کا انداز اسے شدید کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔

ہم۔بات طے کرنے کب آئیں؟"۔زیبا کا حال کنویں کے مینڈک کا سا تھا۔وہ اسی کو دنیا سمجھتی۔اب سمندر کی وسعت جانے بنا، اپنی بولے جارہی تھی۔

"ہم اس وقت تک کچھ کہہ نہیں سکتے جب تک لڑکے کو پنکی کے پاپا نہ دیکھ لیں۔اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جائے گا" مسز خان کا ان دونوں بہنوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو رہا تھا، اسی لیے بات بنائی۔

☆......☆......☆

"بھئی آپا نے شان کے لیے۔اتنی خوبصورت لڑکی ڈھونڈی ہے کہ کچھ کہنے کی حد نہیں" شبنم جو پیٹ کی ہلکی تھی، بہن کے منع کرنے کے باوجود ماں کو ساری بات بتادی۔

"کیا۔مطلب۔کون سی لڑکی؟" زیتون بانو نے تمباکو کی چٹکی بھری اور بیٹی سے حیران ہو کر پوچھا۔عمرہ جو دادی کے پاس پلنگ پر بیٹھی تھی ایک دم گھبرا اٹھی۔

"میری رشتے والی نے دکھائی ہے۔پنکی نام ہے۔بہت امیر کبیر گھرانا ہے۔آپا تو عید پر منگنی کرنا چاہتی ہیں" شبنم نے مزے سے بتایا۔

"ہم نے۔زیبا کو۔منع بھی کیا تھا۔انسان کو بہو ہمیشہ اپنے گھر کے رہن سہن کے مطابق لانی چاہیے۔مگر لگتا ہے انہیں ٹھوکر کھانے کا بہت شوق ہو رہا ہے" زیتون بانو نے۔پوتی کے کے چہرے کے اڑتے رنگ دیکھ کر غصے سے کہا۔

"اماں۔آپ بھی۔خوامخواہ ہی پرانی باتوں میں الجھی ہوئی ہیں۔آج کل ہر انسان اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ویسے بھی ان کا بیٹا ہے وہ جو چاہے کریں۔ہم بولنے والے کون ہوتے ہیں؟" شبنم نے برقعے کے بٹن بند کرتے ہوئے ماں کو صلاح دی۔

"تم کو بہن سے ہمدردی ہو یا نہ ہو۔مگر ہم تو بولیں گے۔اپنی بیٹی کے مزاج کو جانتے ہیں۔پنکی۔ہو۔یا۔بلی ان کا گزارا ایسی لڑکیوں کے ساتھ نہیں ہونے والا" زیتون بانو نے باچھوں کو صاف کرتے ہوئے پاندان پر ہاتھ مار کر کہا۔

"آپا سے ان باتوں کا ذکر نہیں کریئے گا" ماں کا پارہ ہائی دیکھ کر شبنم کو اپنی فکر ہوئی۔التجائیہ انداز میں کہا اور سر ہلاتی گھر چل دی۔زیتون بانو سوچ میں گھر گئیں۔عمرہ اداس سی چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔

☆......☆......☆

"سنو۔یہ۔مجھے چھت پر بلا کر تم کس چیز کی تلاش میں مصروف ہو"۔عمرہ تیز تیز سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی اور بولی۔شان آسمان پر کچھ ڈھونڈتا دکھائی دیا۔

"بولو۔نا" عمرہ کی آواز پر۔وہ مسکراتا ہوا مڑا۔فر فر چلتی ہواؤں نے اس کے خوشبودار بالوں کو بکھیر دیا۔

عمرہ انہیں کھول کر دوبارہ جوڑے کی شکل دینے میں ہلکان ہوئی جارہی تھی،

"شکر ہے انہیں باندھ لیا۔قسم سے کھلے بالوں میں ایک دم چڑیل لگتی ہو۔" شان نے اس کی لٹ کھینچی، عمرہ نے ابرو چڑھا کر غصہ دکھایا۔وہ اس کے انداز پر گھائل ہو گیا۔جب سے اسے شان کے رشتے والی بات پتا چلی تھی وہ اس سے ناراض ہو گئی تھی۔

"اماں۔صحیح تو کہتی ہیں۔تمہیں جادو آتا ہے۔جب ہی تو مجھ جیسے ہینڈسم پر قبضہ جمایا ہوا ہے۔شان اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوا" پھوپی۔اماں کی تو رہنے ہی دو۔انہیں "اپنی چیزیں لاکھ کی اور دوسرے کی خاک کی دکھائی دیتی ہیں"۔اس نے بھی آئینہ دکھانے میں دیر نہ لگائی۔وہ ہنسا۔

"شی۔آہستہ۔بابا۔کہیں۔تمہاری پہرہ چوکی کے چکر میں زیبا پھوپو گھٹنے پکڑتی اوپر۔چلی آئیں، پھر اس ہینڈسم کی خیر نہیں ہوگی، عمرہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔اس کی بات صحیح تھی شان جھٹلا نہیں پایا۔

''اف۔کہاں گئی؟'' شان نے سر کو جھٹکا اور دوبارہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کچھ تلاش کرنے لگا۔

''۔کیا مصیبت ہے۔۔ پلیز کچھ بتاؤ گے؟۔یا نہیں۔ورنہ میں نیچے جارہی ہوں'' عمرہ نے اس کے بولنے کا انتظار کیا۔مگر جب کافی دیر تک وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔تو دھمکی دی اور اس کی پشت پر ایک مکا جڑ دیا۔چوٹ خود کو ہی لگی۔اپنا ہاتھ سہلانے لگی۔

''ارے۔نہیں ہے۔۔ بالکل بھی نہیں۔اِدھر بھی نہیں ہے۔'' شان بڑبڑایا۔عمرہ نے پاؤں پٹخے۔

''مل جاؤ نہ۔کہاں چھپی ہو؟'' اس نے خود کلامی کی۔کلف والے سفید کرتا شلوار میں اپنے دراز قد اور براؤن آنکھوں کے ساتھ، وہ سچ مچ اچھا لگ رہا تھا۔عمرہ نے اس پر سے نگاہ ہٹائی۔

''۔سنو آج اماوس کی رات ہے۔چاند کہاں سے دکھائی دے گا۔ویسے بھی اِس میں پرابلم کیا ہے؟۔مجھے دیکھ لیا نا کافی ہے۔'' اب وہ چھیڑ چھاڑ پر آمادہ ہوئی۔

''اے لڑکی۔تھوڑی دیر خاموش نہیں رہ سکتی ۔رہی چاند کی بات۔غلط اندازے مت لگاؤ۔' شان نے نئی چمک دار کالی دوربین فضا میں لہرا کر کہا۔

''میں جان سکتی ہوں۔وہ کیا چیز ہے؟'' اب عمرہ کی اندر کی لڑکی ٹھٹکی۔شکی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

چھوڑو۔تم نہیں سمجھو گی۔کہاں ہے؟۔میں نے ستاروں میں دیکھا۔سیاروں میں ڈھونڈا۔لیکن کہیں دکھائی نہیں دی'' ۔وہ ایک دم پریشان ہوئی۔شان کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

''آخر کیا نہیں مِلا ۔؟ مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔وہ۔کون ہے؟ جس کی تلاش میں تم پاگل ہو رہے ہو۔دوسروں کی چھتوں پر دوربین لگا کر تا کا جھانکی کر رہے ہو۔'' عمرہ نے آگے بڑھ کر دوربین چھینتے ہوئے غصے سے کہا۔

''آں۔آں۔صبر لڑکی صبر۔اف اللہ جی۔میں نے اسے زہرا میں تلاشا۔نہیں ملی۔'' وہ ایک دم آنکھ بند کر کے بولا۔عمرہ کی تو جان ہی نکل گئی۔اندھیری رات تھی پر اس کا غصہ سوا نیزے تک پہنچ گیا۔

شان۔تمہیں۔شرم نہیں آتی یوں پرائی لڑکیوں کو ڈھونڈتے ہوئے۔یہ زہرا کون ہے؟ جس کا نام یوں۔میرے سامنے بے دھڑک لے رہے ہو''۔وہ ایک دم چیخی۔اس کے ہاتھ پر اپنے لمبے ناخنوں سے ایک کھرونچ بھی ماردی۔

''اف۔ہائے۔بلی ۔اسے مشتری میں دیکھا ۔لیکن بے سود۔'' وہ ایک دم ہاتھ سہلاتے ہوئے قہقہہ مار کر ہنسا۔

مجھے تو لگ رہا ہے۔آج تمہارا دِماغ چل گیا ہے۔یہ جو تم راتوں کو تنہا چھت پر ٹہلتے ہو نا۔کوئی بلا پیچھے پڑگئی ہے۔اللہ خیر کرے۔'' عمرہ نے آگے بڑھ کر اس کو غور سے دیکھتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

''اس دنیا میں تم سے بڑی بھی کوئی بلا ہو سکتی ہے۔؟ شان نے شرارت سے سر کو ادھر ادھر پٹخنا شروع کر دیا۔

''کہیں بھی نہیں۔ہا۔ہا۔ عمرہ۔کہیں بھی نہیں۔پایا''۔ہاتھ لہرانے شروع کر دیا۔وہ ایک دم خوف زدہ ہوگئی۔

''شان۔تمہیں کیا ہوگیا ہے۔؟۔میں نیچے سے سب کو اوپر بلا کر لاتی ہوں''۔شان کی حرکتوں پر عمرہ کے چہرے سے پریشانی ہویدا ہوگئی۔اپنی جگہ سے اٹھی، شان نے اسے دوبارہ گھسیٹا۔وہ اس پر گرتے گرتے بچی۔شرم کی لالی نے چہرے کو وہ نکھار بخشا کے ارد گرد روشنیوں کا میلا سا لگ گیا۔عمرہ کا منہ رونے والا ہو گیا تو شان کو اس پر ترس آگیا۔

'' میں اِس دوربین سے آپ کی محبت

۔ پیار۔ مجھ پر قائم۔ اعتبار۔ اور وہ بے لوث جذبے تلاش کر رہا ہوں۔ جو آج کل ہم دونوں کے بیچ سے غائب ہوتا جا رہا ہے۔ زمین پر تو نہیں مل رہے۔ میرا خیال تھا شاید آسمانوں میں ہی مل جائیں!!!'' شایان نے اس کے سامنے جھک کر عاجزی سے کہا۔ وہ اتنی پیاری شرارت پر کھلکھلا کر ہنس دی۔ ایک دم برابر والی چھت پر کھٹ پھٹ شروع ہوئی تو عمرہ سٹ پٹا گئی جلدی سے، اپنا مرمریں ہاتھ چھڑایا۔ جو وہ بڑی محبت سے تھامے ہوئے تھا۔

''اس کے ذمہ دار بھی تم ہو شان۔ اگر شادی نہیں کرنی، تو کیوں میرا راستہ روکا، محبت کے دعوی کرنا تو مشکل نہیں، اصل بات اسے نبھانا ہے'' وہ جلبلائی۔

''سنو۔ میں کب محبت سے مکرتا ہوں،'' شان نے پیار سے اس کا منہ اپنی طرف موڑا۔

''تم خود کو عقلمند اور مجھے بے وقوف سمجھتے ہو، زیبا پھوپو۔ کسی پنکی ڈھنکی سے منگنی کرنے پر تلی بیٹھی ہیں اور تم معصوم بنے ہوئے ہو۔ ایک بات یاد رکھنا ،شان۔ اگر تم نے مجھ سے بے وفائی کی تو میں پرانی پاکستانی فلموں کی طرح آہیں بھر کر اور سیڈ سانگ گا کر خاموش نہیں ہو جاؤں گی، میں تمہارا جینا مشکل کر دوں گی۔ اور اس لڑکی کا بھی جو تمہاری بیوی بن کر آئے گی'' عمرہ محبت میں دھمکیوں پر اتر آئی، اس کی دلکشی عروج پر تھی۔

''اے لڑکی۔ میری ہونے والی بیوی کو کچھ نہ کہنا'' شان نے اس کا جوڑا کھول دیا، سارے بال بکھر گئے۔

''کہوں۔ گی ایک بار نہیں سو بار۔ دیکھتی ہوں۔ تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو'' عمرہ نے ضد میں پیر پٹخے۔

''واہ۔ دنیا کی۔ یہ پہلی لڑکی ہے جو اپنا برا خود چاہتی ہے۔'' شان اسے کے نزدیک ہو کر دھیرے سے بولا۔

''کیا۔ کیا۔ مطلب'' شان کی بات سمجھ کر عمرہ کا۔ دل زور سے دھڑک اٹھا۔ وہ شرما کر۔ نیچے کی طرف بھاگ گی۔ اس کی ناراضی کہیں اوپر ہی رہ گئی۔

☆......☆......☆

''شبنم۔ پنکی والے تو ایک دم خاموش ہی ہو گئے ہیں۔ اپنی رشتے والی کو کہو میں اسے الگ سے دو ہزار دوں گی کسی طرح یہ رشتہ کروا دے'' زیبا نے بہن کا ہاتھ دبا کر کہا۔ شان جو وہیں صوفے پر بیٹھا تھا، ان دونوں کی باتیں غور سے سننے لگا۔

''آپا۔ بڑے لوگوں کے بڑے نخرے۔ پھر بھی۔ میں زینت باجی کو دوبارہ کہہ کر ان لوگوں سے شان کو ملواتی ہوں۔ ایسا کڑیل ہیرو جیسا لڑکا دیکھ کر وہ خود ہی پھسل جائیں گی'' شبنم نے دانت نکال کر کہا۔

''بس۔ کسی طرح مسز خان مان جائیں۔ تو۔ میں عید میں ہی ان دونوں کی منگنی کر دوں اور دس دن بعد پنکی کو اپنی بہو بنا کر لے آؤں'' زیبا کے لہجے میں بڑے ارمان تھے۔

''ریسپیکٹڈ۔ لیڈیز۔ ایک اہم اعلان سنیں'' شان نے ہاتھوں کا بھونپو بنا کر کہا۔

''ایں۔ اب تمہیں کیا تکلیف ہوئی'' دونوں بہنوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

''۔ آپ دونوں بلاوجہ اتنی محنت کر رہی ہیں۔ مجھے۔ کسی پنکی۔ ڈنکی۔ سے شادی نہیں کرنی۔'' شان نے پاؤں پھیلا کر بڑے آرام سے کہا۔

''کیوں نہیں کرنی۔ ارے زندگی سنور جائے گی۔ ہمارے پورے گھر جتنا بڑا تو ان کا ڈرائینگ روم ہے'' زیبا نے کچھ زیادہ ہی لفاظی کے جوہر دکھائے۔

''تو اور کیا۔ آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ان کے پاس۔ گاڑی بنگلہ۔ سب کچھ تو ہے'' شبنم نے بہن کے اشارے پر بھانجے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا۔

''ان کے پاس بھلے قارون کا خزانہ ہو۔ مجھے

اس سے کیا مطلب؟۔ میں تو اپنے چھوٹے سے گھر میں خوش ہوں۔ شادی بھی۔ ایسی ہی لڑکی سے کروں گا۔ جو۔ میرے ساتھ یہاں گزارا کرلے'' شان نے ماں کو دوٹوک فیصلہ سنایا۔

''جانتی ہوں۔ عمرہ کا خناس سوار ہے۔ میرے بھائی کی بچی ہے۔ مجھے بری نہیں لگتی۔ مگر اپنی اولاد کے مستقبل سے بڑھ کر کچھ نہیں بھیا'' زیبا ترخ کر بولیں۔

''ویسے۔ آپا۔ عمرہ ہے بڑی اچھی بچی'' شبنم کا دل بھی پسیجا۔ ''تو اپنے فواد سے کرلیتی نا۔ اس کے لیے تو امیر کبیر نند کی بیٹی بیاہ کر لے آئی'' زیبا ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئی۔

''اماں۔ پلیز۔ عمرہ۔ کا نام یوں نہ لیں'' شان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ ''بہن۔ اپنے تجربے سے ہی سیکھا۔ پھر اماں کی بھی یہی خواہش ہے'' شبنم نے دھیرے دھیرے کچھ سمجھانا چاہا۔

''نہیں بھئی۔ مجھے تو پنکی کو ہی اپنی بہو بنانا ہے'' زیبا تو یوں اپنی بات پر جمی ہوئی تھی جیسے وہاں سے اقرار ہوگیا ہو۔ ماں کے رویے پر۔ شان غصے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

''یہ پھوپو اماں آخر مان کیوں نہیں جاتی۔ ان کا تو وہ ہی حال ہے جو میری خالہ ساس ناظمہ آنٹی کا ہے'' ناعمہ میکے آئی ہوئی تھی کارپٹ پر سیدھے لیٹتے ہوئے کہا۔ عمرہ کے کان کھڑے ہوگئے

''کیا مطلب؟'' عمرہ نے تربوز کا پیالہ بیچ میں رکھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

''ایک دن میری ساس نے آنٹی کی بہو کا حال پوچھا تو وہ منہ بنا کر بولیں ''کیا بتاؤں۔ قسمت پھوٹ گئی جو ایسی لڑکی ہمارے سر منڈھ دی گئی۔ دن بھر پڑی سوتی رہتی ہے، شوہر کے آتے ہی ناس پیٹی کنگھی چوٹی کرکے شوہر کی پھٹپھٹی پر بیٹھ کر سیر سپاٹے کو نکل جاتی ہے۔ مجھ سے چھپاتی ہے۔ پھر دونوں باہر ہی کھا پی کر رات گئے واپس لوٹتے ہیں'۔ مجھے بتائے بغیر ہر دوسرے دن میکے کے چکر لگاتی ہوگی۔ بس باجی۔ اب تو دعا ہے کہ اللہ میرے زن مرید بیٹے کو اس چڑیل کے چنگل سے باہر نکال دے'' ناعمہ نے تربوز کے چوکور پیس کو کانٹے سے اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے بتایا۔

اچھا۔ پھر تمہاری ساس نے کیا کہا؟'' عمرہ نے ہنستے ہوئے، اسے دیکھا۔ ''شی۔ آہستہ دادی اماں۔ بیڈ پر سو رہی ہیں۔ شور سے آنکھ کھل جائے گی'' ناعمہ نے انگلی سے اشارہ کرکے بتایا، جہاں زیتون بی بی چادر میں منہ چھپائے سو رہی تھیں۔

''اوہ۔ سوری۔ ویسے۔ کیا جواب دیا؟'' عمرہ کو بے چینی ہونے لگی۔ ''۔صحیح بات ہے آج کل کے لڑکے تو ہیں ہی زن مرید'' میری ساس نے مجھے دیکھ کر ان سے اظہار افسوس کیا۔

''مگر۔ ان باتوں کا پھوپی اماں سے کیا کنکشن؟'' عمرہ کو بڑی بہن کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

''ابھی۔ پوری کہانی تو سنو۔ میری ساس نے تھوڑی دیر بعد ہی ان کی بیٹی کے بارے میں پوچھا، ناعمہ نے بتایا۔

''اچھا پھر؟'' عمرہ نے پاؤں پھیلائے۔

''ان کا جواب سن کر میری ہنسی چھوٹ گئی'' ناعمہ نے بہن کو دیکھا جو واقعہ سننے میں محو تھی۔

''ایسا کیا کہہ دیا۔ خالہ ساس نے جو تم حیرت زدہ رہ گئی'' عمرہ نے اس مرحلے پر سسپنس ختم کرنا چاہا۔

''وہ ناک پر انگلی رکھ کر بولیں۔ اے۔ نسیمہ بہن۔ اس کے بارے میں کیا پوچھتی ہو؟۔ داماد تو سمجھو فرشتہ صفت ہے، میری بیٹی کا بہت خیال رکھتا ہے، صبح اپنے ہاتھ سے اسے چائے بنا کر دیتا ہے، وہ اپنی مرضی سے اٹھتی ہے، ہر دوسرے دن ہم سے ملوانے لے کر آتا ہے، خوب شاپنگ کراتا ہے پکن

میں تو بہت کم جانے دیتا ہے۔ اکثر باہر کھانے پر لے جاتا ہے۔ بس اللہ نظر بد سے بچائے'' ناعمہ کی بات ختم ہوتے ہی دونوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''۔ویسے ان میں مماثلت کیا ہے؟'' عمرہ نے ایک دم کچھ سوچ کر پوچھا۔'' زیبا پھوپو بھی یوں ہی سوچتی ہیں، اپنے لیے کچھ۔ دوسروں کے لیے کچھ '' ناعمہ کے کہنے پر وہ ایک دم افسردہ ہوگئی۔

''نہیں۔ بچیوں۔نہیں۔ میں اپنی بڑی بیٹی کی برائی بالکل نہیں سن سکتی'' زیتون بانو نے ایک دم ڈرامائی انداز میں منہ سے چادر ہٹائی اور بولیں ان کے جھریوں بھرے چہرے سے پھوٹتی شرارت پر دونوں ہنس دیں۔'' دادی اماں چپکے چپکے ہماری ساری باتیں سن رہی تھیں'' عمرہ نے مسکرا کر کہا۔

''میری بچی فکر مت کرو۔ بہو بن کر تو تجھے۔زیبا کے گھر ہی جانا ہے۔اب دیکھ تیری دادی کیا کرتی ہیں'' انہوں نے عمرہ کو اپنے شفیق سینے میں گھساتے ہوئے تسلی دی تو۔ناعمہ کے دل میں سکون جا اترا۔

☆......☆......☆

''عمی۔ بیٹا۔ایک ضروری بات کرنی تھی۔'' مریم نے بیٹی کے پاس بیٹھ کر پیار سے پکارا۔

''جی۔امی۔کیا ہوا؟'' عمرہ ماں کے اس انداز پر چونکی۔

''وہ۔تمہارے بڑے ماموں نے مبین کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے'' عمرہ نے ایک دم جھرجھری لی۔شان کے علاوہ کسی اور کا تصور ہی مشکل تھا۔مبین اس کے ماموں کا منجھلا بیٹا تھا۔وہ ایک سلجھا ہوا تعلیم یافتہ لڑکا ہے، مگر ہر اچھے لڑکے سے شادی کر لینا یہ کوئی ضروری تو نہیں۔

''وہ لوگ دو مہینے بعد منگنی اور ایک سال بعد شادی کرنا چاہتے ہیں، تم سوچ سمجھ کر جواب دینا'' مریم نے بیٹی کے کاندھے پر پیار بھرا باؤ ڈالا۔

''امی۔میں ابھی شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔ مجھے نہیں کرنی شادی وادی'' وہ ایک دم بھڑک کر کھڑی ہوگئی۔

''تمہارا تو دماغ خراب ہے۔میں جانتی ہوں کہ تمہاری دادی کی کیا خواہش ہے۔مگر میں زیبا آپا کو اچھی طرح سے جانتی ہوں، وہ خونی رشتوں پر دولت اور پیسے کو فوقیت دینے والی ہیں۔'' انہوں نے خفگی سے بیٹی کو جھاڑا، تو عمرہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''عمی۔ایک بات یاد رکھنا۔میں نے سسرال میں ایک مشکل زندگی گزاری ہے۔برابر میں رہائش پزیر تمہاری پھوپو۔نے ہمیشہ مجھ پر حکومت کی، وہ تو تمہاری دادی اور ابو اچھے تھے تو گزارہ ہوگیا، ورنہ جینا حرام ہوجاتا۔'' مریم نے دل کے زخم بیٹی کے سامنے کھولے۔

''امی۔اس میں میرا اور شان کا کیا قصور؟'' عمرہ کی نگاہیں بول رہی تھیں، مریم کو بیٹی کے دل کی خبر تھی۔انہوں نے جھرجھری لی اور اپنی کیفیت سے باہر نکل آئیں۔

''تمہارے ماموں کے گھر کا ماحول اچھا ہے۔مجھے ''ہاں'' میں جواب چاہیے'' مریم نے سمجھانے کے بعد اسے کمرے میں اکیلا چھوڑ دیا۔وہ سر پر ہاتھ رکھ کر سوچوں میں گم ہوگئی۔

☆......☆......☆

عمرہ کے رشتے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح دونوں گھروں میں پھیل گئی، زیبا نے سکھ کا سانس لیا ۔مگر شان رات بھر سو نہ سکا۔دوسرے دن منہ لٹکائے اس کے پاس چلا آیا۔مریم اور وحید مراد کسی فوتگی میں گئے ہوئے تھے۔شان نے رشتے کے بارے میں سوال کیا تو عمرہ نے پوری بات بتادی۔

''صاف ۔انکار کردو۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ویسے بھی تمہارے ماموں کے دس بچے ہیں، تم کہاں ۔اتنے بکھیڑے میں پڑوگی'' شان کے طنزیہ انداز پر وہ چڑ گئی۔

''اچھا۔کیوں منع کردوں۔ویسے بھی وہ سب تو

میرے کزن ہیں۔ کچھ تو میرا خیال کریں گے، تمہاری پنکی کے گھر والوں کی طرح نہیں جو انسانوں کو پیسوں میں تولتے ہیں'' عمرہ نے فوراً بدلہ لینے کے لیے طعنہ مارا۔ اور مڑ کر پودے کی پتیاں توڑنے لگی۔ وہ دونوں کیاری کے پاس کھڑے ہو کر باتیں کر رہے تھے۔

''میری پنکی۔ جملہ غلط ہے۔ صحیح کرو۔ صحیح اس طرح ہے ہے۔ میری عمرہ۔ صرف میری عمرہ'' شان نے اس کی آنکھوں میں پیار سے دیکھتے ہوئے کہا تو عمرہ کی جان نکل گئی۔ اس نے بڑے آرام سے عمرہ کی مٹھی کھولی ہاتھ سے کچی پتیاں نکال کر پھینکیں اور پلٹ گیا۔

☆......☆......☆

''شان سے تو آپ مل چکی ہیں۔ ماشاءاللہ۔ میرا بھانجا۔ بہت ہی شریف اور ہینڈسم ہے'' شبنم نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔ مسز خان نے ان لوگوں کو گھر جانے سے پہلے لڑکا دیکھنے کی خواہش کی۔ شبنم نے شان کو بہانے سے بلا کر ملوا دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ خالہ کی جاننے والی پنکی کی والدہ ہیں۔ یہ شان کی پرکشش کا اثر تھا کہ وہ اس چھوٹے سے گھر کے ڈرائینگ روم میں بیٹھی تھیں۔

''وہ تو ٹھیک ہے آپ کے بیٹے کے بارے میں کچھ اور جاننا چاہ رہی ہوں۔ مثلاً تعلیم وغیرہ'' وہ اب سنجیدگی سے زیبا سے سوال جواب کے موڈ میں نظر آئیں۔

''جی۔ شان نے ماشاءاللہ۔ ایم بی اے کیا ہے۔ اب ایک پرائیوٹ فرم میں اچھی پوسٹ پر کام کر رہا ہے۔ مریم نے نند کی مشکل آسان کی۔

''پورے تیس ہزار تنخواہ لگی ہے۔ بہت محنتی ہے۔ آگے ترقی کرے گا'' شبنم نے بہن کو کمک پہنچاتے ہوئے تفصیلی جواب دیا۔

''اتنی کم تنخواہ۔ یہ بتائیں کہ کچھ بالائی وغیرہ؟'' ۔ مسز خان نے اشاروں کنایوں میں پوچھنا چاہا۔ ان کے میاں فیض خان ایک بڑے سرکاری عہدیدار تھے۔ پوسٹنگ بھی چن کر ایسے علاقوں میں لگواتے جہاں۔ اوپر کی آمدنی کی ریل پیل ہوتی۔ اسی لیے۔ بہتی گنگا سے ہاتھ دھونے کی جگہ نہانا شروع کر دیا۔ جب سے اسی گز کے مکان سے اٹھ کر ہزار گز کی کوٹھی میں آ بیٹھے، ان کے دماغ ہی نہیں ملتے۔ انہوں نے اس کے علاوہ۔ کئی پلاٹ اور دکانیں بھی خریدی ہوئی تھیں، اب داماد بھی ہم پلہ ڈھونڈ رہے تھے۔

''اے۔ لو۔ بالائی کو تو میں نہیں جانتی۔ البتہ وہ ملائی کا بہت زیادہ شوقین ہے۔ روز صبح پراٹھے سے کھانے کو مانگتا ہے۔ پھر۔ بہن ہم'' اچھا دیکھیے لڑکے کا اپنا ذاتی مکان بنگلہ یا پلاٹ وغیرہ ہے؟ ۔۔ انہوں نے موہوم سی امید سے پوچھا۔ شان کی شخصیت نے ان سے سو میں سے سو نمبر حاصل کر لیے تھے۔

''نہیں۔ نہیں بہن۔ شان کی ذاتی جائیداد تو نہیں ویسے ہمارا چھتا ایک سو گز پر دو منزلہ مکان ہے۔'' ۔ مسز خان کی صاف گوئی پر زیبا سب پریشان ہو گئیں۔

''معاف کیجیے گا۔ پنکی کو ڈربوں میں رہنے کی عادت نہیں۔ رشتے والی نے اس معاملے میں بہت غلط بیانی سے کام لیا۔'' مسز خان بے رخی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی تضحیک پر زیبا کے ساتھ ساتھ باقی سب کا بھی منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''دیکھیے ۔ رشتے والی نے تو ہمیں بھی بڑے جھانسے دے کر ایڈوانس فیس وصولی کے آپ لوگ لڑکے کو سیٹل کروا دیں گے خیر۔ شان بہت اچھا۔ لڑکا ہے۔ جلد ہی ترقی کر جائے گا۔'' شبنم سے بہن کا اترا چہرا نہ دیکھا گیا، مسز خان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ باقی سب ہکا بکا یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

''اچھا جی۔ کوشش جاری رکھیے گا۔ جب شان میاں کو ترقی نصیب ہو جائے تو پھر ادھر رشتے کے

لیے چلی آئے گا" مسز خان نے طنز کیا۔

"اگر۔ خان صاحب تھوڑی سی سفارش کر کے۔ کوئی اچھی۔ سرکاری نوکری دلوادیں تو وہ جلد ہی اعلیٰ مقام تک پہنچ جائے گا" زیبا نے آخر مدعا بیان کیا۔

"معاف کیجیے گا۔ اگر۔ سرکاری نوکریاں۔ اتنی آسانی سے مل جاتی تو ہم اپنے بیٹے کو نہ دلوادیتے" مسز خان ان لوگوں کی لالچی طبیعت کو سمجھ گئیں۔ اسی لیے شائستگی سے پیچھا چھڑانے میں ہی عافیت جانی۔

☆......☆......☆

"اماں۔ بڑے ہی خراب لوگ تھے۔ نو دولتیے کہیں کے۔ چار پیسے کیا آگئے۔ اپنی اوقات ہی بھول گئے" زیبا ٹہل ٹہل کر مسز خان کی پوری فیملی کو برا بھلا کہنے میں مصروف تھیں۔

"یہ تو ہے۔ پیسے کی لالچ ہی ایسی ہے۔ انسان اپنا آپ بھول جاتا ہے" زیتون بانو نے کس کر بیٹی کو لتاڑا تو وہ بلبلا اٹھی۔ "ہاں۔ ہاں۔ آپ بھی مجھے ہی بھگو کر جوتے ماریں۔" زیبا نے منہ بنا کر کہا۔

"بیٹی۔ "کوا چلے ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا" تمہاری حالت بھی کچھ ایسی ہی ہو رہی ہے۔ ابھی بھی وقت ہے۔ مریم کے بھانجے کا رشتہ آیا ہوا ہے۔ مگر وحید مراد کا جھکاؤ۔ اپنے بھانجے کی طرف ہے۔ عمرہ کے لیے حامی بھرلو۔ یہ نہ ہو کہ بچی دولت سے ہاتھ دھو بیٹھو" زیتون بانو نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" زیبا نے نا سمجھ میں آنے والے انداز میں ماں کو دیکھا۔

"میں۔ شان کی بات کر رہی ہوں۔ جوان اولاد ہاتھ سے نکل گئی تو بڑی سے بڑی دولت اس نقصان کا ازالہ نہیں کر سکے گی" زیتون بانو کے لہجہ میں کچھ ایسا تھا کہ زیبا اندر تک ٹھٹھر کر رہ گئی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ بھائی سے بات کر لیں۔ اس عید پر دونوں کی شادی ہی کر دیتے ہیں۔ خاندان کی بات ہے۔ کوئی مشکل بھی پیش نہیں آئے گی" زیبا ہار کر ماں کے قدموں میں جا بیٹھی۔

"اے چلو۔ وحید مراد سے بات کرتے ہیں۔ ایک منٹ۔ یہ تھام لو" انہوں نے مسکرا کر کہا پھر ڈرامائی انداز میں پلنگ کے نیچے سے ایک ڈھکا ہوا تھال نکالا۔ "یہ ۔یہ۔ کیا ہے؟" زیبا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "اے۔ عیدی کا جوڑا، مہندی چوڑی۔ وغیرہ ہے۔ شگون کے بغیر جاتی اچھی نہیں لگو گی" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی تو زیبا بھی ماں کی پھرتیوں پر ہنس دی۔

☆......☆......☆

چلو۔ عمرہ۔ اوپر آؤ۔ چاند دیکھتے ہیں" شان آسمانی کرتا شلوار میں بہت اچھا لگ رہا تھا، اسے دھیرے سے اشارہ کیا۔

"نہ۔ اگلے ہفتے ہماری شادی ہے۔ امی نے آپ سے بات کرنے کو منع کیا ہے" عمرہ نے اٹھلا کر کہا۔

"اچھا۔ بات کرنا منع ہے۔ میرے ساتھ۔ چاند دیکھنے کی ممانعت تو نہیں نا" شان زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر چھت پر لے آیا۔

"اوہ۔ شان وہ دیکھیں۔ عید کا۔ چاند" عمرہ نے باریک سے ہلال کو دیکھ کر پرجوش انداز میں کہا اور سر پر دوپٹہ لے کر دعا مانگی۔ "کیا دیکھ رہے ہیں۔" شان کو مسلسل اپنی جانب تکتا پا کر وہ پزل ہوئی۔

"چاند تک پہنچنے کا راستہ اتنا آسان بھی نہیں تھا" شان نے اسے دل میں اتارتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ "جناب۔ چاند وہ رہا" عمرہ نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں۔ اس چاند سے اس چاند تک۔ میری زندگی میں خوشیاں بکھر گئی ہیں" شان نے پیار سے آسمان پر چمکتے چاند کو دیکھا پھر اس کے چہرے کی جانب اشارہ کیا، وہ ہاتھ چھڑاتی شرما کر نیچے بھاگ گئی۔

☆......☆......☆

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں

”یہیں رُک جائیں قدر صاحبہ! اس الزام کے متعلق دوبارہ سوچیے گا بھی مت۔ ورنہ ہرگز لحاظ نہیں رکھوں گا۔ سن لیں آپ۔“ وہ ایکدم سے بھڑک اٹھا تھا۔ قدر سہم کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس قدر طیش میں تھا کہ چہرے کے حساس حصوں میں سرخی ہی نہیں اتری۔ باقاعدہ......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا سترھواں حصہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے دریچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پچھتاوا، ملال، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ جو رب کو ناراض کر کے وحشتوں میں مبتلا ہے۔ گندگی اور پلیدگی کا احساس اتنا شدید ہے کہ وہ رب کے حضور سجدہ ریز ہونے میں مانع رکھتا ہے۔ مایوسی اس کی اتنی گہری ہے کہ رب جو رحمٰن و رحیم ہے، جس کا پہلا تعارف ہی یہی ہے۔ اسے یہی بنیادی بات بھلائے ہوئے ہے۔ دیا جو درحقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مکین ہے۔ یوسف کرسچن نوجوان جو اپنی خوبروئی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جبھی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناجائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب نا چاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے جو خیالات کی چکی میں پس کر خود بھی سراپا تغیر کی زد میں ہے۔ علیزے کی واپسی کی خواہاں ہے اور علیزے کی مایوسی اور اس کی بے اعتباری کو اُمید میں بدلنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں۔

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ خاص کر علیزے...... جس پر علیزے کی بڑی بہن ہونے کے ناتے پوری اجارہ داری ہے۔ عبدالغنی ان کا بڑا بھائی ہے۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیزگار نہیں عاجزی و انکساری جس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ درپردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پرہیزگاری و نیکی میں خود سے آگے کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ہارون اسرار شوبز کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر
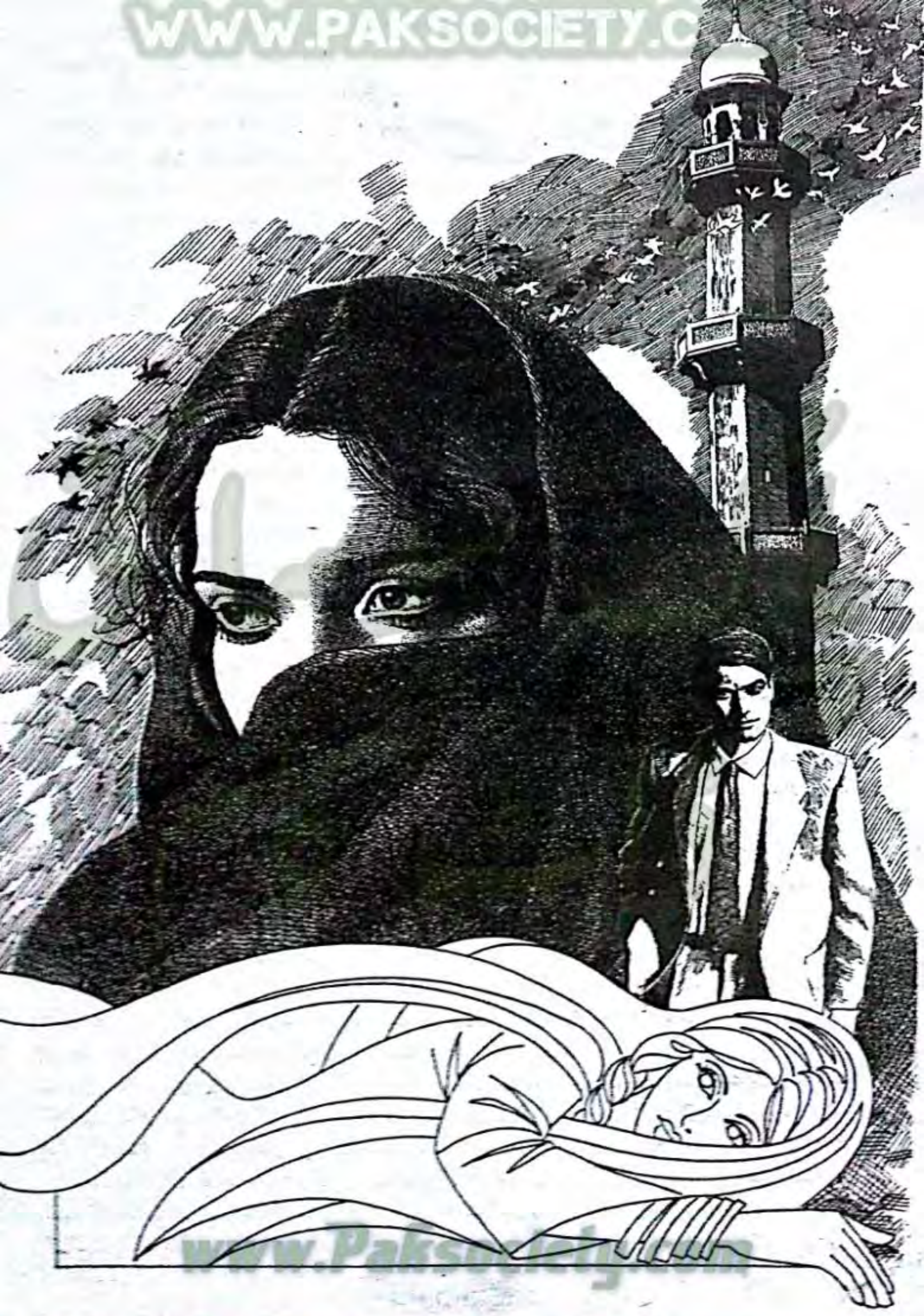
اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اس کے انکار پر اس سے بات کرنے خود ان کے ہاں آتا ہے اور شوبز تک چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضا مند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہیں اس موقع پر اس کی پہلی ملاقات عبدالغنی سے ہوتی ہے۔ ہارون اسرار کسی بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضا مندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھاتی ہے۔ محلے کا اوباش لڑکا علیزے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جس کا علم بریرہ کو ہونے پر بریرہ علیزے کی کردار کشی کرتی ہے۔ علیزے اس الزام پر سوائے دل برداشتہ ہونے کے اور کوئی صفائی پیش کرنے سے لاچار ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی ممی اپنی یتیم بھتیجی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کراتی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے اور بالآخر اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ لاریب ہارون کی چھوٹی بہن جو بہت لاابالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ لاریب کی دلچسپی عبدالغنی کی ذات میں بڑھتی ہے۔ جسے بریرہ اپنی منگنی کی تقریب میں خصوصاً محسوس کر جاتی ہے۔ لاریب محبت کی راہوں کی تنہا مسافر ہے۔ عبدالغنی انجان بھی ہے اور لاتعلق بھی۔ لاریب کے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث ہے کہ وہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے مگر وہ لاریب کی طرح ہرگز مایوس نہیں ہے۔

شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیا دیا اور سرد مہری ہی نہیں حاکمیت آمیز بھی ہے۔

اسے ہارون کے ہر اقدام پر اعتراض ہے۔ وہ اس پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہے اور اس کی ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ ممی کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جبھی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔ اس سے پہلے وہ لاریب کو بھی جتلا چکی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ لاریب کو عبدالغنی سے روا رکھا جانے والا ممی کا رویہ بغاوت پر ابھارتا ہے۔ وہ تمام لحاظ بھلائے جواب تک اس کے قدموں کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکے تھے۔ اپنا گھر چھوڑ کر عبدالغنی کے پاس آکر عبدالغنی سے خود کو اپنانے کی گزارش کرتی ہے۔ عبدالغنی اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے بہلا، سمجھا کر واپس بھیجتا ہے۔ مگر لاریب اس مصالحانہ عمل کو سمجھے بغیر اسے اپنی ریجیکشن اور تذلیل سمجھتے ہوئے شدید ہیجان میں مبتلا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھتی ہے۔ ممی اس کی حالت پر حراساں جبکہ لاریب اسی ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا عبدالغنی کے حوالے سے اپنی ہر شدت اور شدت پسندانہ بے بسی ان کے سامنے عیاں کر جاتی ہے۔ ممی جو بریرہ کے حاکمانہ رویے اور ناشکرانہ انداز کی بدولت سخت دل برداشتہ ہیں اور اپنی بیٹی کو اس کے بھائی کے حوالے کرنے میں شامل ہیں۔ لاریب کی خوشی کی خاطر اس شادی پر بالآخر آمادہ ہونے پر ایک بار پھر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لاریب کی دائمی مسکراہٹ کی چاہ انہیں عبدالغنی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتی ہے۔

بریرہ لاریب کو ناپسند کرتی ہے۔ جبھی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو روکنے سے قاصر ہے۔ لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنور لی ہے۔ ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر رازیتوں کا شکار ہے۔ لیکن اس وقت تنہا ہوتی ہے۔ جب وہ علیزے کے حوالے سے اس پر الزام عائد کرتی ہے۔ صرف ہارون نہیں...... اس سطحی حرکت کے بعد علیزے بھی بریرہ سے نفرت پہ مجبور ہو جاتی ہے۔ وقت کچھ اور آگے سرکتا ہے۔ بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔ مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساسِ جرم میں مبتلا رب کو منانے ہر صورت علیزے کی واپسی کی ملتمس ہے۔ ہارون کے ہر احساس سے گویا بے نیاز ہو چکی ہے۔ ہارون اس بے نیازی کو لاتعلقی اور بے گانگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی انتہا۔ وہ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوبز کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آکر بریرہ کو جھنجوڑنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔

علیزے کی واپسی کے بعد عبدالغنی سمیت اس کے والدین بھی علیزے کے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ علیزے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود بھی یہ علم بانٹ رہی ہے۔ عبدالہادی اپنے روحانی استاد کے زیرِ تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔

جبیر ایک بدفطرت عورت کے بطن سے جنم لینے والی باکردار اور باحیا لڑکی ہے۔ جسے اپنی ماں بہن کا طرزِ زندگی بالکل پسند نہیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ مگر حالات کے تار عنکبوت نے اسے اپنے منحوس پنجوں میں جکڑ لیا ہے۔ کامیاب علاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے پیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسامہ چونکہ فطرتاً کاملیت پسند ہے۔ کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وہ ہرگز اس کی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ جبیر کو حالات اس نہج پر پہنچا دیتے ہیں کہ وہ ایک مسجد میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اُس کی شرافت دیکھ کر مؤذن صاحب اُسے اپنی پُرشفقت پناہ میں لے کر اس کی ذمے داری قبول کر لیتے ہیں۔ اُم جان اور بابا جان حج کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی سے مؤذن صاحب بہت متاثر تھے۔ وہ اُس سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتے ہیں اور اُسے قابلِ بھروسہ جان کر جبیر کو عقد میں لینے پر زور دیتے ہیں۔ عبدالغنی انتہائی مجبوری کی حالت میں اُن کا یہ فیصلہ قبول کر کے جبیر سے نکاح کر لیتا ہے۔ یہ سب کچھ اتنی اچانک ہوتا ہے کہ وہ لاریب سے اس بارے میں کوئی ذکر تو کجا مشورہ بھی نہیں کر پاتا۔ جبیر کو لے کر عبدالغنی گھر آ جاتا ہے۔ لاریب کے لیے یہ سب کچھ سہنا آسان نہیں ہوتا، وہ اسی وقت گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ چونکہ گھر میں کوئی بڑا نہیں ہوتا، اس لیے لاریب کو سمجھانا عبدالغنی کے بس سے باہر تھا۔ علیزے، عبدالہادی کے ساتھ اُس کی مام سے ملنے اُن کے آبائی گھر چلی جاتی ہے۔ جب عبدالہادی علیزے کو اپنی ماں سے ملوانے کے لیے کہتا ہے تو وہ ایک غیر مسلم عورت سے ملنے کے لیے فوری طور پر انکار کر دیتی ہے۔ عبدالہادی کے لیے یہ ایک بہت بڑا جھٹکا تھا۔ کیونکہ اُس کی ماں بیٹے کی محبت میں اسلام قبول کر چکی تھیں۔ علیزے بدگمان تھی مختلف مواقع پر عبدالہادی کو پرکھنے کے بعد بالآخر اپنا دل صاف کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ ہارون اسرار کا رویہ بریرہ سے بہت برا ہو جاتا ہے اور وہ اُسے اپنے ساتھ اسلام آباد اپنی دوسری بیوی کے ساتھ چلنے کے لیے کہتا ہے۔ بریرہ اسے بھی اپنا امتحان مان کر راضی ہو جاتی ہے۔ ہارون اسرار کی دوسری بیوی، پہلی بیوی کو برداشت نہیں کر پاتی اور اُس سے اپنے نام لکھی گئی جائیداد اور روپے پیسے لے کر طلاق لے لیتی ہے۔ بریرہ اور ہارون پھر سے محبت کے بندھن کو جوڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ لاریب اور جبیر میں اس حادثے کے بعد دوستی ہو جاتی ہے۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

''آپ کی منطق مجھے بالکل سمجھ نہیں آئی ہے بابا! یہ بھلا کیا بات ہوئی......؟'' آپ نے دونوں فیملیز میں سے کسی کو بھی نہیں بتایا اور اُٹھ کر چل پڑیں۔ اور کچھ نہیں تو کوئی ایئرپورٹ پر لینے ہی آ جاتا۔''

قدر جتنا بھی خوش تھی کراچی آنے پر مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ اس خیال سے بدمزہ ہو چکی تھی۔ علیزے جواباً کچھ کہے بغیر بس مسکرائے گئی تھیں۔ وہ اتنا ہی چڑی۔

''کہیں آپ سرپرائز کے چکر میں تو نہیں ہیں؟'' اس نے پھر ٹوکا۔ پھر مداخلت کی۔

''بیٹے نہ بتانے کی کیا بات...... بجو مجھے باقاعدہ انوائٹ کر چکی ہیں۔ تمہارے بابا کا تو اگر ہم انتظار کرتے اگلے پتا نہیں کتنے دن ٹائم نہ نکل پاتا۔ جبھی ہم اکیلے آ گئے۔ وہ بعد میں جب فرصت ہو گی آتے رہیں گے۔''

علیزے کی نرمی و رسان سے دی گئی وضاحت بھی اس کی تشفی کے لیے ناکافی ثابت ہوئی۔

''خالہ جانی نے بلایا ہے آپ کو۔ ماموں نے بھی تو بلایا ہی ہے۔ پھر آپ خالہ کے گھر کیوں جا رہی ہیں؟''

اس کی تشویش اور تحقیق و بحث کا باعث ہی یہی اصل بات تھی۔ دلچسپی کا سارا سامان تو عبدالغنی کے ہاں تھا۔ علیزے کو جانے کیا سوجھی کہ ایئرپورٹ سے ٹیکسی کراتے ہوئے انہوں نے ایڈریس ہارون اسرار کے گھر کا ڈرائیور کو سمجھایا تو قدر کی بے چینی سوا ہونے لگی تھی۔

''کیا حرج ہے اگر اس بار ان کے ہاں جایا جائے بیٹے! بجو ہر بار شکوہ کرتی ہیں۔ میں چند گھڑی کو بھی ان کے پاس نہیں جا پاتی۔ وہی ہر

بار بھائی کے ہاں آ کر مجھ سے ملتی رہی ہیں۔ پھر تقریب بھی تو بجو کے ہاں ہے ناں۔''

علیزے کے اطمینان میں فرق آیا تھا نہ رسان میں۔ جبکہ وہ اس حد تک جھنجھلائی جا رہی تھی۔

''کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں آپ کا جتنے دن کا بھی قیام ہے وہ سارا خالہ کے گھر ہی ہوگا۔'' اس نے منہ بسورا تھا۔ چہرے پر عجیب سی بے زاری اور بے بسی ٹپک رہی تھی۔

''نہیں قدر...... کیا ہوگیا بیٹے!'' علیزے اب کے قدرے ٹھٹھکی اور حیران ہوکر بیٹی کی صورت دیکھی۔ یہی حیرانی یہی ٹھٹکنا قدر کو سنبھل جانے پر اکسا گیا تھا۔

''کیا ہوگا؟'' اس نے کاندھے اچکائے اور خوامخواہ مسکرانے کی کوشش کی۔

''اب اس بات سے یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں آپ کے بدتمیز، نک چڑھے بھتیجے پہ عاشق ہوگئی ہوں اور اس کی وجہ سے یہ سب کہہ رہی ہوں۔ آپ کو پتا ہے میری شروع سے ہی امن سے نہیں اتباع سے دوستی رہی ہے۔'' نظریں چرا کر وضاحت پیش کرتی ہوئی قدر علیزے کو بے حد پیاری لگی۔ کچھ کہے بغیر انہوں نے اسے ساتھ لگا کر نرمی سے تھپکا تھا۔

''اتباع کے ساتھ تمہاری محبت میرے لیے اگر اطمینان کا باعث ہے بیٹے تو امن اور عبدالعلی کے متعلق ایسے خیالات ہرگز خوشی سے ہمکنار نہیں کرتے۔ ویسے بھی بیٹے...... جو دل میں ہو...... اسے بے دھڑک زبان پہ نہیں لاتے۔ ضبط برداشت اور تحمل اگر انسان میں نہ ہو تو بہت مشکل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔'' علیزے کے سمجھانے پر اس نے محض گردن ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

بریرہ کو اس کی آمد کی اطلاع نہیں تھی۔ مگر انہیں روبرو پا کے وہ اتنی خوش ہوئی تھیں کہ صحیح معنوں میں پیر زمین پہ نہیں ٹکتے تھے۔

''آج تو واقعی عید ہوگئی ہے میری! بتا نہیں سکتی علیزے میری جان آج کتنی خوش ہوں۔''

باری باری دونوں کو گلے لگاتے وہ مسرور و سرشار کہہ رہی تھیں۔ امن بھی خاصے تپاک سے ملی تھی۔ عبداللہ اور ہارون البتہ گھر پر نہیں تھے۔ امن کا انداز البتہ جانے کیوں قدر کو کسی قدر بجھا ہوا اور بے دھیان سا لگا تھا۔ جیسے محسوس کرنے کے باوجود اس نے پرواہ نہیں کی۔

''بس شاپنگ کے لیے نکلنے ہی والی تھی مگر اب ارادہ کینسل......'' بریرہ نے مسکرا کر اعلان کیا۔

''شاپنگ اتباع کو ساتھ لے کر کر رہی ہیں بجو!'' علیزے کے سوال پر قدر نے بھی توجہ مبذول کی تھی۔ بریرہ آہستگی سے ہنس دیں۔

''ہاں آج نکاح کا جوڑا لانا تھا جبھی بڑی مشکلوں سے قائل کیا تھا اتباع کو...... ورنہ وہ کہاں مانتی ہے۔ کہہ رہی تھی بجو آپ جو لائیں گی مجھے ناپسند ہوسکتا ہے بھلا؟ مگر میں جانتی ہوں وہ درحقیقت عبداللہ کی موجودگی سے کتراتی ہے۔ میں نے تسلی دے دی تھی کہ عبداللہ ساتھ نہیں ہوگا۔ تم پریشان نہ ہو۔''

''پھر تو مان گئی ہوں گی محترمہ!'' قدر نے مسکراہٹ دبائی۔

''بڑی مشکلوں سے...... وہ تو عبدالعلی نے کہا تھا مجھے کہ بجو آپ پریشان نہ ہوں۔ میں خود چھوڑ دوں گا اسے آپ کی طرف۔ ظاہر ہے پھر کوئی فرار نہیں بچا تھا اُس کے پاس۔'' بریرہ کی وضاحت پر قدر کے اندر ایک عجیب سا احساس

پھیل گیا۔

"مجھے باتھ لینا ہے خالہ جانی!" وہ ایکدم سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بریرہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں بیٹے ضرور...... مگر چائے لے لو پہلے۔" اُن کے لہجے میں محبت بھی تھی اصرار بھی۔

"بعد میں پی لوں گی خالہ جان پلیز! بی کوز سفر کی تھکان اتنی دیر تک نہیں اُترتی میری جب تک فریش نہ ہو جاؤں۔" اس نے بظاہر تحمل سے جواب دیا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کے اندر اس پل غضب کی حدتیں اُتر آئی تھیں۔

"ٹھیک ہے بیٹے! ہم انتظار کر لیتے ہیں۔ امن آپ جاؤ چندا! بہن کو کمرے میں لے جاؤ۔ کپڑے وغیرہ بھی استری کر دینا۔"

بریرہ نے پہلے قدر پھر امن کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ دونوں اک ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ انداز میں فرمانبرداری تھی۔ امن قدر کے پیچھے تھی۔ جب اس نے رُک کر اسے ساتھ ملایا پھر اسے بغور تکنے لگی۔

"علی اکثر آتے ہیں یہاں؟" امن جو بے خیال سی ساتھ چل رہی تھی۔ اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ کچھ کھسیانی بھی ہوئی مگر خود کو سنبھال لیا۔

"جی اکثر آ جاتے ہیں۔" وہ سنجیدہ تھی۔ اس کا انداز سادگی کا مظہر تھا۔ مگر قدر کو عجیب سی جلن محسوس ہونے لگی۔

"دوستی تو ہو گی آپ کی...... ظاہر ہے۔ عبداللہ بھائی تو یہاں ہوتے ہی نہیں تھے۔ وہ ان کی خاطر تھوڑی آتے ہوں گے۔"

قدر کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ امن کو چونک جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ اپنے مسئلے کو لے کر اس قدر پریشان تھی کہ اس معمولی اہمیت کے مسئلے کی جانب دھیان نہیں دے سکی۔ بلکہ اس نے تو قدر کے لفظ دوستی کو بھی جیسے نہیں سنا تھا۔ ورنہ اس کی لازمی تردید کرتی۔

"جیسے وہ آپ کے کزن ہیں ویسا رشتہ ہی اِدھر بھی ہے قدر......! مگر فرق صرف اتنا ہے کہ ہم لوگ چونکہ قریب رہتے تھے۔ جبھی زیادہ میل جول ہمارے درمیان انڈراسٹینڈنگ پیدا کر چکا ہے۔ بھائی بیشک باہر تھے مگر عبدالعلی سے اُن کی دوستی واقعی مثال ہے۔ بہت محبت ہے شروع سے دونوں میں۔ سچی بات بتاؤں تو مجھے بھی کبھی ماما اور عجیر ممانی اور بھو کے درمیان فرق محسوس نہیں ہوا۔ وہ ہمیں ابتاج اور واحد سے کم نہیں سمجھتی ہیں۔ جبکہ اِدھر ماما کا ان کے بچوں کے لیے یہی حال ہے۔ آپ کی تو خیر ویلیو ہی الگ ہے۔ آپ کی اہمیت سب کے نزدیک بہت خصوصی اس وجہ سے بھی ہے کہ آپ سب سے چھوٹی بہن کی سب سے پیاری اور اکلوتی اولاد ہو۔"

امن نے اس کی بات کا تفصیلاً جواب دیا تھا۔ گویا تشفی کرانی چاہی مگر اس کا کیا ہو سکتا تھا کہ جو قدر سننا چاہتی تھی وہ الفاظ امن کی گفتگو میں ناپید تھے۔ اس پر ستم اس کی آخری وضاحت اسے لگا تھا صاف صاف امن نے اسے بہلایا ہے۔ وہ ہونٹ بھینچے امن کو کپڑے بیگ سے نکال کر استری کرتے دیکھتی رہی۔ بریرہ کی اچھی عادات میں ایک عادت یہ بھی تھی کہ سب کچھ موجود ہونے کے باوجود وہ ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی قائل تھیں۔ یہی تربیت انہوں نے امن کی بھی کی تھی۔ کُل وقتی ملازمہ جو ممی کے دور کی تھیں۔ اب بھی موجود تھیں مگر نحیف ہو جانے کے باعث صورتحال یہ تھی کہ ان کی خدمت کی جاتی تھیں۔

''یہ کپڑے پریس ہو گئے ہیں۔ تم شاور لو...... میں تب تک چائے بنالوں۔''

امن نے مسکرا کر اسے چونکایا۔ وہ خالی نظروں سے اسے دیکھتی اس کا بڑھایا لباس لے کر واش روم میں چلی گئی۔ اتنی دیر نہانے کے باوجود بھی اس کے اندر کی کھولن ہنوز قائم تھی۔ تراشیدہ شانوں سے نیچے تک لہراتے خوبصورت بال لمحوں میں سلجھ گئے۔ جنہیں ڈرائر سے خشک کرنے کا تکلف برتے بنا وہ سائیڈ پر پڑا دوپٹا دروازے پر جا کر یاد آنے پر پلٹ کر واپس آ کر ہاتھ میں اٹھا کر باہر نکل آئی تھی۔ بے خیالی کا یہ عالم تھا کہ ایک ہاتھ نم بالوں میں تھا دوسرے میں دوپٹا زمین پر جھاڑو دیتا ہوا ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ جب وہ واپس بریرہ اور علیزے کے پاس آئی جو ہنوز باتوں میں مگن تھیں۔ مگر اب اتباع اور عبدالعلی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ لائٹ پنک لباس میں سلیقے سے دوپٹا اوڑھے اتباع کانچ کی گڑیا جیسی نازک اور بلوریں...... جھینپی ہوئی کتراتی لجائی ساتھ میں عبدالعلی...... اعتماد، دلکشی، وجاہت اور بے نیازی کا بھرپور سنگم لیے چھا جانے والے سراپے کے ہمراہ...... وہ باری باری سب سے مل رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس وقت چائے لے کر آنے والی امن سے بھی حال احوال دریافت کرنے میں مصروف...... ایک نہیں دیکھا تو اسے۔ اس کا دل بے پایاں دکھ سے بھر گیا۔

''السلام علیکم! ہم تو سرپرائزڈ ہو گئے یہاں آ کے...... مگر بہت اچھا بھی لگا تمہیں اچانک دیکھنا۔ اتباع آ کر خود اس سے لپٹ گئی تھی۔ اس طرف جتنا تپاک اور گرمجوشی تھی۔ قدر اسی قدر بے دل رہی۔

''کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اتباع کو اس کا شکس انداز بالآخر محسوس ہو گیا تھا۔ وہ چونکی اور خود کو قدرے سنبھالا۔

''نو...... اٹس او کے۔'' اس کا انداز آہ بھرنے والا تھا۔

''آؤ قدر بیٹے! عبدالعلی...... بیٹے قدر ہے یہ اپنی۔ دیکھا تم نے اسے ماشاء اللہ کتنی پیاری ہو گئی ہے۔''

بریرہ نے اتباع اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دائیں بائیں بٹھا لیا۔ مگر توجہ فی الحال ساری قدر پر ہی تھی۔ قدر نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کا دل بے انتہا بوجھل ہو رہا تھا۔ جبکہ بریرہ کے تعارف پر عبدالعلی کا وجیہہ چہرہ یکدم سرخ پڑ گیا۔ وہ آہستہ سے کھنکھارا تھا۔ البتہ کچھ کہنے سے گریز برتا۔

ہم ترستے ہی ترستے ہی رہے
وہ فلانے سے فلانے سے ملا
خود سے مل جاتے تو چاہت کا بھرم رہ جاتا
کیا ملا آپ جو اوروں کے ملانے سے ملے

اس کے اندر کا شاکی پن تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔

''قدر...... چائے لو۔'' امن کے پکارنے پر وہ ہڑبڑا سی گئی۔ کچھ کہے بغیر نم پلکیں جھپکتے اس نے مگ تھام لیا تھا۔ سفید بریزے کے سوٹ جس کی شرٹ کے دامن اور آستینوں پر براؤن میرون اور ریڈ کلر کا ایپلک اور کٹ ورک کا بہت خوبصورت کام بنا ہوا تھا۔ وہ اپنی نزاکت دلکشی اور بے انتہا معصومیت کے ساتھ صحیح معنوں میں نگاہوں کو بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر عبدالعلی نے ایک بار بھی جو اسے دھیان سے دیکھا ہو۔

''بابا جان کو پتا چلے گا کہ آپ پہلے اِدھر آئی ہیں بو جانی تو انہیں یقین ہی نہیں آئے گا۔ ایسا کبھی ہوا جو نہیں پہلے۔'' اتباع نے مسکرا کر کہا تو

علیزے ہنسنے لگی تھی۔
''میں نے سوچا اس بار بجو کو خوش کر دوں۔ پہلے ان کی طرف چلی آؤں۔'' علیزے اتباع کا گال سہلا کر اسی نرمی و محبت سے جواب دے رہی تھی۔ جواب اس کے مزاج کا خاصہ بن چکی تھی۔
'' آپ ہماری جانب کب آئیں گی بتائیں؟'' اتباع کے سوال پر بریرہ کی مسکراہٹ اسے دیکھتے گہری ہونے لگی۔
''یہ جانب ہی اصل میں آپ کی جانب ہے بیٹے!'' ان کے انداز میں جو شرارات تھی۔ وہ لمحوں میں اتباع کو گلگلوں کر گئی تھی۔ لانبی پلکیں حیا بار انداز میں جھکیں تو پھر بوجھل ہو کر اٹھنے سے انکاری ہونے لگیں۔ یہ گڑ گڑاہٹ اور حیا آمیز انداز اس کی دلکشی کو مزید بڑھاوا دے گیا تھا۔ جبھی باقی سب ہنسنے لگے۔
''اتباع یہ سوچ کر ریلیکس ہوئی ہوگی ماما! کہ بھائی نہیں ہیں۔ مگر آپ نے تو ان کی کمی پوری کر دی ہے۔'' امن نے بھی اس شرارت میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔ اتباع کی رنگت کچھ اور بھی تمتما اٹھی۔ عبدالعلی دانستہ کھنکھارا تھا۔ قدر کی بہت سلگتی ہوئی نظروں کا مرکز وہی تھا۔
''میں چلتا ہوں۔ اتباع کو آپ چھوڑ دیں گی یا میں لینے آجاؤں؟'' وہ بریرہ کو دیکھ رہا تھا۔ جواب علیزے نے دیا۔
''آج ہم سب اِدھر ہی ہیں۔ صبح اتباع بھی ہمارے ساتھ ہی اِدھر آجائے گی۔ بلکہ تم بھی رُک جاؤ بیٹے!'' ان کے انداز میں محبت بھی تھی۔ اصرار بھی۔ عبدالعلی جز بز سا ہو گیا۔
''مجھے تو بہت ضروری کام تھا بو جانی...... سو معذرت اور اتباع......''
''اتباع کی فکر نہ کرو۔ اکیلی نہیں ہے یہ......

ہم سب ساتھ ہیں اس کے۔'' علیزے کے ٹوکنے پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اختلاف نہیں کر سکا۔ اتباع الگ بے چین لگ رہی تھی۔
''آپ بھی ابھی چلیے نا بو جانی...... سب بہت خوش ہوں گے آپ کو دیکھ کر۔'' اس کا انداز منت آمیز تھا۔ وہ نرمی سے ہنس دی تھیں۔
''بیٹے گھبرانے کی ضرورت نہیں کل چلیں گے۔'' اب کے بریرہ نے جواب دیا تھا۔ ان کے انداز میں انوکھا سا جوش و خروش در آیا تھا۔
''میں تو کہتی ہوں آج بھائی جان کو بھی فیملی سمیت انوائٹ کر لیتے ہیں۔'' انہوں نے تائید طلب نظروں سے سب کو دیکھا تو علیزے بے ساختہ ہنسنے لگی تھیں۔
''کیا کمال کا آئیڈیا ہے مگر وہ آئیں گے نہیں۔ میں جانتی ہوں۔''
''آئیں گے، ضرور آئیں گے۔ میں فون کرتی ہوں انہیں۔ کھانا تو ہمارے ساتھ کھالیں ناں۔'' انہوں نے مسرت بھرے انداز میں کہتے سیل فون اٹھایا۔ عبدالعلی گہرا سانس بھرتا وہاں سے پلٹ گیا تھا۔ اس بات سے یکسر بے نیاز رہ کر کہ قدر کے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا مگ یونہی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس کے ذائقے سے بھی ناآشنا۔

☆......☆......☆

''ماشاء اللہ! بہت خوبصورت تو پہلے ہی تھے۔ اب تو جیسے نظر لگ جانے کا خدشہ ہے تمہیں دیکھتے ہوئے۔'' علیزے عبداللہ کے لمبے تڑنگے شاندار سراپے توصیفی نگاہوں سے دیکھتیں بے حد محبت سے کہہ رہی تھیں۔ عبداللہ ہولے سے ہنس دیا۔ اس کے پُرکشش چہرے پر عجیب سی بے بسی کا تاثر بھی اُترا تھا۔
''مجھے تو لگتا ہے اس سب کا کچھ فائدہ نہیں۔

جب میں آپ کی نک چڑھی بھتیجی کو متاثر کرنے میں ناکام رہوں تو......'' اس نے منہ لٹکا لیا تھا۔ علیزے نے مسکراتے ہوئے اس کا خوبرو چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر پیار کیا۔

'' ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے بیٹے! اور وہ اپنے وقت پر ہی اچھا بھی لگتا ہے۔ ویسے بھی...... عورت اپنے جذبوں میں مخفی...... اور پوشیدہ ہی اچھی لگتی ہے۔ اظہار مرد پر ہی جچتا ہے۔'' عبداللہ کچھ دیر قبل ہی آیا تھا۔ آتے ہی یہی موضوع چھڑ گیا۔ جو اس کا من پسند بھی تھا۔ وہ بڑی فرصت میں علیزے کے پاس جم گیا۔

'' مگر خالہ جانی وہ میری محبت کی قدر تو کر سکتی ہے ناں۔ اس کا انداز تو ایسا لگتا ہے ہر وقت جیسے ناپسند کرتی ہو مجھے۔'' وہ نا چاہتے ہوئے بھی شاکی ہو گیا تھا۔

اتباع اور امن کچن میں تھیں۔ اتباع کو ہرگز اندازہ نہیں تھا۔ وہ یہاں علیزے کے پاس ہوگا اور اس کے متعلق گفتگو کر رہا ہوگا۔ دروازے کے باہر ہی وہ ٹپٹا کے رُک گئی تھی۔ اور بے ساختہ قسم کی گھبراہٹ سمیت امن کو دیکھا۔ جس کی شوخ نظروں کا مرکز بھی وہ پہلے سے تھی۔

'' دیکھا...... میرے بیچارے بھائی کو تم سے کتنی شکایتیں ہیں۔'' اس کا انداز سرگوشیانہ تھا۔ اتباع نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اور ہاتھ میں موجود ٹرے زبردستی امن کو تھما دی۔ جس میں گاجر کے حلوے کا ڈونگا موجود تھا۔

'' ارے...... کہاں جا رہی ہو؟'' امن بوکھلائی تھی اسے پلٹتے پا کر۔

'' کچن میں ہی ہوں۔'' اتباع نے ناچار جواب دیا تھا۔ امن نے گہرا سانس بھرا اور اندر چلی آئی۔

'' السلام علیکم بھائی! پاپا کیوں نہیں آئے آج آپ کے ساتھ؟''

'' پاپا کی آج بہت اہم میٹنگ تھی۔ تم مجھے پانی دو پلیز۔'' سلام کا جواب دیتا وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

'' ہوں آپ کو الہام ہوا تھا کہ گھر میں بہت خاص لوگ آئے ہوئے ہیں؟'' امن کا لہجہ شوخ ہوا۔ عبداللہ گہرا سانس بھرتا علیزے کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

'' خالہ جانی نے واقعی سرپرائز دیا۔ بہت اچھا بھی لگا۔ سن لیں اب اتنے دن آپ اِدھر ہی رہیں گی۔ اور یہ قدر کدھر ہے؟ اپنی پکچرز میں تو بڑی کیوٹ لگتی ہے۔ واقعی اتنی پیاری ہے وہ خالہ......'' اس کا شریر انداز رازدارانہ ہوا تو امن کے ساتھ علیزے بھی ہنسنے لگی تھی۔

'' آپ دیکھیے گا تو صحیح...... اتباع سے بھی زیادہ پیاری ہو شاید...... ریئلی بہت اٹریکٹڈ ہے وہ بھی۔ عبدالعلی کے ساتھ کپل بے حد پیارا ہے۔ ماموں اور بو کی جوانی کا ٹائم ہے۔'' وہ کہہ کر خود ہی ہنسنے لگی۔

'' لیکن عبدالعلی ماموں کی طرح سے تحمل اور کول ہرگز نہیں ہے۔ اگر سچ ہے تو وہ...... اور وہ قدر بھی کم نہیں۔ میرا خیال ہے دونوں کی خاص جنگ متوقع ہے۔ مستقبل قریب میں...... جبکہ سنا ہے بو تو کبھی ماموں سے نہیں جھگڑی تھیں۔ سوائے ایک بار کی خفگی کے جب عبیر مامی سے شادی کی تھی ماموں نے......؟ ہے نا خالہ جانی؟'' عبداللہ کو بچپن کی ساری باتیں یاد تھیں۔ علیزے بس مسکرائے گئی۔

'' ارے تم نے پانی کا نہیں سنا؟ کب سے کہا ہے میں نے؟'' عبداللہ نے امن کو گھورا تھا۔ جو

آرام سے بیٹھی تھی۔ اس کے باوجود کہ وہ دوبارہ کہہ چکا تھا۔

''صبح سے اِدھر اُدھر بھاگتی پھرتی تھک کے چور ہوگئی ہوں بھائی یقین کریں۔ کچن زیادہ دور تھوڑی ہے۔ اتنی سی زحمت خود کرلیں۔ فریج سے پانی کی بوتل نکال لائیں۔ مجھے بھی پلا دیجیے گا۔ سب صدقات میں بڑا صدقہ ہے پانی پلانا۔ جائیں شاباش۔''

وہ بے چارگی کی انتہا پر تھی جیسے۔ عبداللہ حیران رہ گیا۔ ایسا کبھی ہوا نہیں تھا کہ وہ اس کے کسی کام سے انکار کرے۔ علیزے کے سامنے وہ عجیب سی خفت کا شکار ہوا۔

''میں لاتی ہوں پانی بیٹے!'' امن کو ہنوز جمے پاکر اور عبداللہ کے خفگی آمیز تاثرات کو محسوس کرتیں علیزے فٹافٹ اٹھنے لگی تھیں کہ عبداللہ چونک کر بے ساختہ انہیں ٹوک گیا۔

''خالہ جانی! بیٹھیں آپ۔ میں لاتا ہوں ابھی۔'' بے حد سنجیدگی سے کہتا وہ اگلے لمحے تیزی سے اُٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ ارادہ کچن کی بجائے اپنے کمرے میں جانے کا تھا۔ مگر کچن کے دروازے پر گلابی آنچل کی جھلک دیکھ کر یکدم تھم گیا۔ پہلا خیال ہی قدر کا آیا تھا۔ وہ امن کے گریز کی وجہ سمجھ کر گہرا سانس بھرتا قدم بڑھا کر اندر آ گیا۔ اتباع اپنے دھیان میں تھی۔ کوکنگ رینج پر جھکی کسی سالن میں چمچ چلاتی ہوئی۔ عبداللہ اس سے کچھ قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ پھر اس کی جانب ہلکا سا جھک کر شرارتاً کھنکھارا تھا۔ اتباع بے حد مگن تھی۔ مگر بری طرح گھبرا کر پیچھے ہوئی تھی۔ جہاں وہ خائف...... عبداللہ تو جیسے حیرت کی زیادتی سے پلکیں بھی نہیں جھپک سکا۔ جبکہ اس کے برعکس اتباع کے چھکے چھوٹ گئے تھے اسے

سامنے پاکر۔ پہلے رنگ فق ہوا۔ پھر بے تحاشا زرد پھر سرخ۔

''اتباع...... آ آپ؟'' عبداللہ کی حیرانی کی جگہ اب خوشگواریت اور مسرت نے لے لی تھی۔ یک ٹک بے حد متبسم نظروں سے اسے دیکھتا۔ مسکراہٹ دبا رہا تھا۔ امن کی شرارت پوری طرح آشکار ہوچکی تھی۔ وہ جو چند منٹ قبل اس سے خفا تھا۔ اب اس پر پیار آنے لگا۔

''کیوں آئے ہیں یہاں آپ! پلیز جائیں۔'' ہلکا سا رخ پھیرتے چہرے پر دوپٹے کا کونا سرکاتے وہ بے حد خائف ہوچکی تھی۔ عبداللہ نے گہرا سانس کھینچا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''کیوں چلا جاؤں......؟ محترمہ اطلاعاً عرض ہے۔ یہ آپ کا نہیں میرا گھر ہے۔ یہاں سے نہیں نکال سکتی ہیں آپ مجھے۔'' اسے یکدم مگر بے تحاشا غصہ آ گیا تھا۔ حد تھی یعنی بدتمیزی اور بے حسی کی بھی۔ اتباع کے اعصاب کو دھچکا سا لگا۔ اس نے تحیر آمیز غیر یقینی میں مبتلا ہوتے پلٹ کر عبداللہ کو دیکھا تھا۔ جس کی سرخ وسفید رنگت ضبط اور قہر کی سرخی سے دہک رہی تھی۔ اتباع جتنا ہرٹ ہوئی۔ جس قدر دکھ کا شکار ہوئی اسے عبداللہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ آنکھوں میں اترتی نمی کے ساتھ کچھ کہے بغیر وہ خود کچن سے نکل کر بھاگ گئی تھی۔ عبداللہ کو احساس ہوا تو ایکدم سے ہونٹ باہم بھینچ لیے تھے۔ عجیب سا تاسف اور ملال اس کے اندر اتر آیا۔ وہ اپنے کمرے میں آیا تو بے حد مضمحل تھا۔ اندر یاسیت گہری ہوتی جارہی تھی۔ سب ٹھیک ہی کہتے تھے۔ وہ غصے میں حواس کھودیا کرتا تھا۔ اسے قطعی سمجھ نہیں آ سکی۔ اتباع کو اب کیسے منائے...... کیسے اپنی بات کی وضاحت کرے۔

''شرمیلی لڑکیوں کی طرح سسرالیوں کی آمد

پر اندر کیوں گھس کے بیٹھ گئے ہیں بھائی! کم از کم اب باہر نکل ہی آئیں۔ کھانے پر سب آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔"

وہ سگریٹ پھونک رہا تھا جب دستک دے کر بے حد خفگی سے کہتی امن اندر آئی تھی۔ عبداللہ نے سرخ ہوتی آنکھوں سے بے تحاشا چونک کر اسے دیکھا۔ ان نظروں کا انداز وضاحت طلب تھا۔

"کیا مطلب؟" اسے پوچھنا پڑا تھا کہ امن بھی کچھ کم خفا نہیں تھی جو محض نظریں پڑھ کر جواب دے دیتی۔

"مطلب ماموں جان ممانی جان اور ان کی ساری فیملی آج کھانے پر مدعو ہے۔" وہ منہ پھلا کر بولی۔ عبداللہ حیرت کی زیادتی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اور مجھے کسی نے بتایا بھی نہیں۔ کب آئے وہ لوگ۔" وہ واقعی شرمندہ ہو گیا تھا۔

"کسی کو الہام تھوڑی ہوا تھا کہ آپ کو نہیں معلوم۔" امن نے بغیر لحاظ کے کہا۔ عبداللہ سر جھٹکتا اٹھا۔

"تم چلو...... آ رہا ہوں میں۔" وہ آئینے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بکھرے بالوں میں برش چلایا۔ پھر واش روم میں آ کر ماؤتھ واش سے کچھ دیر کلیاں کی تھیں۔ تا کہ سگریٹ کی اسمیل ختم ہو سکے منہ سے ورنہ بریرہ کتنی تشویش کا شکار ہو جاتی تھیں کہ وہ اسموکنگ کیوں کرنے لگا ہے۔

وہ ڈائننگ ہال میں آیا تو وہاں واقعی سب اس کے منتظر تھے۔ وہ مزید خفت کا شکار ہوتا معذرت کرنے لگا اور سا بنجھا سلام کر کے کرسی سنبھال لینا چاہتا تھا مگر عبدالعلی اور عبدالغنی کے ساتھ عبدالاحد نے بھی بالخصوص اُٹھ کر اسے گلے لگایا تھا۔ وہ مزید شرمندہ نظر آنے لگا۔ لاریب اور عجیر کو اس نے خود سلام کیا۔ ان کے سر خم کر کے کھڑا ہو گیا۔

"مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ آپ مدعو ہیں ورنہ......"

"کوئی مسئلہ نہیں بیٹا! جب انسان باہر کسی کام سے نکلتا ہے تو دیر ہو جایا کرتی ہے۔ مینشن ناٹ۔" عبدالغنی کے لہجے کا رسان مخصوص تھا۔ وہ گہرا سانس بھرتا بے ساختہ ممنون و مشکور ہوتا بیٹھ گیا۔ دزدیدہ نگاہوں سے ٹیبل کا جائزہ لیا تھا۔ صد شکر وہ موجود تھی۔ بریرہ اور لاریب کی درمیانی کرسی پر لانبی جھکی پلکوں اور موی نقوش کچھ سرخی سمیٹے ہوئے تھے۔ اسے صاف لگا وہ رو کر آئی ہے۔ اس کا دل پھر سے بوجھل ہونے لگا۔

"سب یہیں موجود ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ توجہ کھانے پر رکھیں۔" قدر نے دانستہ کھنکھار کر سرگوشی کی۔ وہ چونکا ہی نہیں کھسیا بھی گیا تھا۔ مگر اس پر نگاہ پڑتے ہی بے ساختہ مسکرانے لگا۔

"قدر!" اس کی آنکھوں کا تاثر بے حد خوشگواریت لیے تھا۔ قدر نے سر تسلیم خم کیا تھا۔ اور ہولے سے ہنس دی۔

"شکر ہے پہچان لیا۔ ورنہ میں تو سمجھی تھی آپ کہیں گے کون ہو بی بی......!" وہ منہ بگاڑ کر بولی اور ترچھی نظر عبدالعلی پر ڈالی جو سر جھکائے کھانے میں مصروف تھا۔ اس کی روح تک پھر سے سلگ اٹھی۔ دماغ پھر دھوئیں سے بھرنے لگا۔ عبداللہ خفت محسوس کرتا ہنسنے لگا۔

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔" وہ خجالت مٹانے کو کہہ گیا۔ قدر نے گہرا سانس بھرا۔

"اچھی بات ہے، ورنہ مجھے مغرور لوگ بہت برے لگتے ہیں۔ ان سے زیادہ مصنوعی نہیں ہوتا اور کوئی۔" اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ عبداللہ نے بے ساختہ قسم کی حیرانی سمیت اسے بغور دیکھا۔

''کس کی بات کر رہی ہو...... عبدالعلی کی ......؟'' سوال کرتا کرتا وہ یکدم ہی نتیجے پر پہنچ کر شوخ ہوا۔ قدر اس قدر درست قیاس پر دھک سی رہ گئی۔

''ہرگز بھی نہیں۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں پڑی کسی کو اتنا سر پر سوار کرنے کی۔'' وہ پھپھک کر بولی اور خراب موڈ کے ساتھ چمچ زوردار آواز کے ساتھ پلیٹ میں چھوڑ دیا۔ سب جو اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے چونک کر انہیں تکنے لگے۔ عبدالعلی نے بھی دیکھا تھا۔ مگر محض ایک نظر اگلے لمحے وہ پھر کھانے کی جانب مشغول ہو گیا تھا۔

''آپ یہ کھیر لو قدر بیٹے! میں نے خود بنائی ہے۔'' قدر نے اسے ڈونگا پیش کیا تھا۔ قدر نے نرمی سے انکار کر دیا۔

''نہیں خالہ جانی پلیز! فی الحال کسی چیز کا دل نہیں۔ ہاں کوئی بنے تو مجھے بھجوا دیجیے گا۔'' اگلے لمحے وہ کرسی گھسیٹ کر اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

'' اتباع چائے تم بنالاؤ۔'' عبدالعلی نے نیپکن سے ہاتھ پونچھتے نارمل انداز میں کہا تھا۔ اتباع جو عبداللہ کی گاہے بگاہے خود پر اٹھتی نظروں سے سخت بے چین اور جز بز تھی۔ فرار کا راستہ ملتے ہی اُٹھ کر دوڑی۔ وہ سب وہیں بیٹھے تھے۔ البتہ امن نے اُٹھ کر برتن سمیٹنے شروع کر دیتے تھے۔

'' میں تمہاری ہیلپ کر دیتی ہوں۔'' علیزے نے اٹھنا چاہا تو عبداللہ نے بے اختیار امن کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔ وہ قدرے خشک اور سرد رویے پر بے حد ندامت محسوس کر رہی تھیں سب کے سامنے۔

''آپ رہنے دیں خالہ جانی! میں کرا دیتا ہوں ہیلپ۔'' اس نے امن کو دیکھا تھا۔ اور ڈش لینے کو ہاتھ بڑھایا۔

'' لاؤ...... میں چھوڑ آؤں کچن میں۔'' جواب میں امن نے اسے ملامتی نظروں سے دیکھا تھا۔

''ہرگز ضرورت نہیں، آپ جو پہلے کر چکے وہی بہت زیادہ ہے۔'' وہ بے حد غصے میں تھی۔ ایک جھٹکے سے مڑ کر چلی گئی۔ عبداللہ نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ گو کہ کسی نے بھی نہیں سنا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنا چہرہ جلتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر یونہی کھڑا سلگتا رہا پھر پلٹ کر لمبے ڈگ بھرتا ہوا کچن کی جانب آ گیا۔ مگر اندر نہیں جاسکا۔ اتباع کی سسکیاں اور امن کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔

''سارا قصور اور غلطی ہی میری ہے اتباع! انہیں تو پتا بھی نہیں تھا۔ آئی سوئیر میں نے بھیجا تھا بھائی کو...... مقصد صرف یہی تھا کہ وہ تمہیں دیکھیں گے، بات کریں گے تو خوش ہو جائیں گے۔ مگر اللہ گواہ ہے مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا۔ وہ تمہیں کسی بھی طرح سے ڈس ہارٹ کر سکتے ہیں۔'' عبداللہ کی خفت وخجالت مزید گہری ہو کر رہ گئی۔ اسے قطعی سمجھ نہیں آ سکی۔ رکا رہے یا واپس پلٹ جائے۔

''پلیز اتباع! رونا تو بند کرو۔ تب سے حشر کر لیا ہے تم نے آنکھوں کا۔ کسی نے پوچھ لیا تو کیا ہوگا؟'' امن کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اتباع ہنوز سسکے جا رہی تھی۔

''آخر کیا کہا ہے بھائی نے؟ کوئی بدتمیزی تو نہیں کر دی۔ تمہاری خاموشی اور اتنا رونا مجھے ڈرا رہا ہے اتباع، اتنے کھلے ماحول سے آئے ہیں۔ تہذیب سے عاری تو......'' اس سے زیادہ سننے کی تاب عبداللہ میں نہیں تھی۔ وہ بغیر لحاظ کے اندر گھس آیا۔

''امن!'' وہ بولا نہیں گرجا تھا۔ وہ دونوں

اپنے دھیان میں تھیں۔ بوکھلا کر شپٹا کر پلٹیں۔ امن تو اس کا غیض وغضب سے سرخ چہرہ دیکھ کر ہی دہل گئی تھی۔

''بھائی وہ......''

''شٹ اپ!'' وہ چیخا۔ اتباع تھر تھر کانپنے لگی۔ اس کا رنگ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ عبداللہ کی نگاہ اس پر تھی۔ اور انداز جارحانہ...... وہ قدم بڑھاتا ہوا اس کے بالکل سامنے آ گیا۔ اتباع پیچھے ہٹنا چاہتی تھی مگر یہ ممکن نہ تھا۔ اس کی پشت دو قدم چل کر ہی دیوار سے جا لگی تھی۔ خوف اس کی آنکھوں سے جھانکتا تھا۔

''کیا کہا تھا میں نے آپ سے اتباع! یہ آپ اسے بتائیں گی۔ تاکہ اسے یقین آ سکے کہ میں کس قدر تہذیب سے عاری ہوں۔'' وہ گرجا۔ اتباع کی جان ہوا ہونے لگی۔ حلق خشک ہو کر تڑخنے کے قریب تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز۔

''بھائی......!'' امن کا انداز احتجاجی تھا۔ عبداللہ نے اس پر توجہ نہیں دی۔

''بولیں اتباع......!'' وہ سرد آواز میں مخاطب تھا۔ اتباع کی آنکھوں سے آنسو گالوں پر اترے اور ہونٹ کانپنے لگے۔ امن کا طیش البتہ بڑھا تھا۔

''بات سنیں بھائی! میرا پورا فقرہ سن لیں۔ میں نے کہنا تھا آپ کھلے ماحول میں رہے۔ میں تہذیب سے پھر بھی عاری نہیں ہوئے اور......''

''امن تم جاؤ یہاں سے......'' عبداللہ نے مٹھیاں بھینچی تھیں۔

''جاتی ہوں۔ مگر میں پاپا کو بلا کر لاؤں گی۔ میری نہیں سنیں گے آپ۔'' وہ غصے میں کہتی تیزی سے نکل گئی۔ عبداللہ نے نظروں کا زاویہ بدل کر اتباع کو دیکھا۔ جسے دیکھ کر لگتا تھا وہ کسی بھی پل بے ہوش ہو کر گر سکتی ہے۔ اسے یکایک اپنی زیادتی کا احساس جاگا۔ اپنے رویے کی بدصورتی کا خیال آیا تو دماغ میں ٹھوکریں مارتا ہوا خون سرد پڑنے لگا۔ گہرے سانس بھر کے پہلے خود کو کمپوز کیا۔ پھر بولا تھا۔

''آئی ایم ساری اتباع!'' اس کا لہجہ بے حد مدھم تھا۔ اتباع جس کی جان لبوں پر تھی۔ ٹھٹھک کر اسے تکنے لگی۔

''مجھے اعتراف ہے میں غلطی پر تھا۔'' اتباع کچھ نہیں بولی۔ البتہ آنسوؤں میں مزید شدت آئی تھی۔ عبداللہ کا دل جیسے پگھل پگھل کر ڈھیر ہونے لگا۔

''بہت خفا ہیں مجھ سے؟'' اس کی نظروں میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔ اتباع اسے دیکھتی رہ گئی۔

''معاف کر دیں پلیز! ورنہ میں خود کو معاف نہیں کر سکوں گا کہ آپ کو میری وجہ سے اذیت ہوئی۔'' وہ تب بھی ساکن کھڑی رہی۔ جبکہ وہ آس مندانہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس قدرے بے چارگی بے بسی سے بولا تھا۔

بہت ناراض ہو ہم سے......؟
مگر ہم وہ ہیں جن کو تو منانا بھی نہیں آتا
کسی نے آج تک ہم سے محبت جو نہیں کی ہے
مگر جو ہارنا تھی سو وہ تو ہو چکی ہم کو
سنو ہارے ہوئے لوگوں سے اس قدر روٹھا نہیں کرتے

وہ خاموش ہوا تو پھر ملتجی نظروں سے اسے تکنے لگا تھا۔ اتباع کچھ گھبرائی ہوئی بے حد گریزاں نظر آئی تھی۔ ان نظروں کے جواب میں رُخ پھیر لیا۔ وہ سرد آہ بھر کے رہ گیا۔

''پلیز اتباع! مان جائیں۔ یہ گھر آپ کا

ہے۔ ہم تو بے دام خادم ہیں آپ کے۔'' اس کا بھاری لہجہ سرگوشیانہ ہوگیا۔ اتباع کی جان پر بن آنے لگی۔

'' پلیز......! یہاں سے چلے جائیں۔ ورنہ میں چلی جاؤں گی۔'' وہ سخت نالاں بے حد عاجز ہوکر پھر وہی بات منہ سے نکال بیٹھی۔ عبداللہ نے اسے منہ پر ہاتھ رکھتے پاکر اپنا قہقہہ نہیں روکا تھا۔

'' نہیں...... میں چلا جاتا ہوں آپ کے حکم پر۔ صرف یہاں سے نہیں اس گھر سے اس شہر سے بھی، کہیں تو اس دنیا سے بھی...... خادم ہوں جو حکم سرکار کا۔''

وہ مطمئن ہوا تو شرارت پر خود بخود مائل ہوگیا تھا۔ اتباع جتنا زچ اور عاجز ہوئی وہ اس قدر سرشار سا کچن سے نکلا تھا۔

☆......☆......☆

وہ کھڑکی میں کھڑی آسمان پر چمکتی بجلی کی لپک کو دیکھتی تھی اور نم آنکھیں جھپکے جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں آسمان کی طرح برسنے کو تیار تھیں۔ مگر وہ انہیں رونے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ وہ اس بے حس انسان کے لیے آنسو نہیں بہانا چاہتی تھی۔ جسے اس کی رتی برابر بھی پروا نہیں تھی۔ وہ بے نیاز تھا۔ صدیوں کے فاصلوں پر محسوس ہوتا تھا۔ ٹھیک تھا مگر یہ رویہ صرف اس کے لیے ہے۔ وہ امن سے کیسے گھل مل کے باتیں کررہا تھا۔ بلکہ یہ محسوس کرکے کہ عبدالعلی کی آنکھوں میں امن کے لیے پسندیدگی ہے۔ اس کا جھکاؤ اس کی جانب ہے یہ جان کر قدر کے وجود میں جیسے برزخ دہک اٹھے تھے۔ وہ اس کا تھا، شرعاً و قانوناً مگر اس سے ایسے بدکتا تھا جیسے نامحرم ہو۔ جبکہ وہ امن...... جو صرف اس کی کزن تھی۔ غیر محرم تھی۔ اسے کتنی نرم نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ قدر کا دل گیا تھا اس

نقصان پر ایک حشر اٹھا دے۔ مگر اپنا تماشا لگوانا بھی منظور نہیں تھا۔ جبھی بس اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔ یہ غصہ ہی تھا کہ اتباع اور علیزے جب جانے کو تیار ہوئیں تو وہ صاف انکاری ہوگئی تھی۔ مختلف بہانے بناتے ہوئے علیزے کی بے چینی اور پریشانی کو خاطر میں لائے بغیر وہ اپنی ضد پر اٹکی رہی۔ اور بالآخر فتح اسی کی ہوئی تھی کہ بریرہ...... امن اور عبداللہ کے ساتھ ہارون بھی اس کے حامی ہوگئے تھے۔

'' ہاں بھئی علیزے گڑیا! ہماری بیٹی اسی بہانے ہمارے گھر کچھ دن رہ لے گی۔ بات اس کی ہے بھی صحیح، جو رونق شادی کے موقع پر لڑکے والوں کے ہاں ہوتی ہے۔ لڑکی والوں کی طرف نہیں۔'' ہارون نے مسکراتے ہوئے قدر کے سر پر مشفقانہ انداز میں ہاتھ رکھ دیا تھا اور علیزے مضمحل سی اکیلی عبدالغنی کے ہاں چلی گئی تھیں۔ اپنی بات منوا کر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ مطمئن ہوتی اگر خوش نہیں بھی تھی۔ مگر صورتحال یہ تھی کہ عجیب سا سوز و ملال اندر اتر آیا تھا۔ آنکھوں میں تب سے ایک مستقل جلن آکے ٹھہر گئی تھی۔

'' قدر...... چائے پیوگی......؟'' رات کے کھانے کے بعد وہ کمرے میں گھس گئی تھی۔ آہٹ پر پلٹ کر دیکھا۔ امن مسکرا کر پوچھ رہی تھی۔ اس نے سر کونفی میں جنبش دی۔

'' کھانا بھی تم نے ٹھیک سے نہیں کھایا۔ طبیعت تو اچھی ہے تمہاری؟'' امن کو فطری تشویش لاحق ہوئی تھی۔ مگر قدر کو وہ پھر بھی بری لگی۔

'' میں ٹھیک ہوں۔ آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اس کا لہجہ اتنا خشک اور سپاٹ تھا کہ امن حق دق رہ گئی۔ مگر پھر خود کو سنبھال کر نرمی سے گویا ہوئی تھی۔

"ماما بلا رہی ہیں آپ کو۔ آپ کب سے یوں اکیلی کمرے میں......"

"معذرت کرلیں خالہ جانی سے، میری طبیعت کچھ بہتر نہیں ہے۔ پھر کمپنی دے دوں گی انہیں۔" اس کا لہجہ ہنوز خشک تھا۔ سرد تھا۔ امن کو نرم یارانہ تھا کہ کچھ اصرار کرپائی۔ جبھی پلٹ گئی تھی۔ مگر باہر آتے ہی عبدالعلی سے سامنا ہوگیا۔ جو اسی سمت آرہا تھا۔

"خیریت......؟ آپ پھر سے کیسے تشریف لے آئے؟" امن کی مسکراہٹ میں خوشگواریت تھی۔ جواباً عبدالعلی نے سرد آہ بھری۔

"قدر ابھی کمرے میں ہے؟ جاؤ بلا لاؤ اسے۔ کہنا لینے آیا ہوں۔" وہ سنجیدہ تھا۔ امن گہرا سانس کھینچ کر کاندھے اچکا گئی۔ جانتی تھی اگر وہ فیصلہ کرچکا ہے تو پھر پیچھے نہیں ہٹے گا۔ دوبارہ دروازہ ناک ہونے پر قدر نے ماتھے پر شکنیں لاکر اسے دیکھا تھا۔

"قدر...... عبدالعلی لینے آئے ہیں تمہیں۔ باہر منتظر ہیں۔"

امن نے محض پیغام دیا تھا اور الٹے قدموں پلٹ گئی۔ قدر کو تو جیسے اپنی سماعتوں پر اعتبار نہیں آسکا۔ دل جہاں کچھ دیر قبل عجیب سناٹا ویرانی اور حزن و ملال تھا۔ یکلخت جیسے بہار اُتر آئی۔ یہ خیال کہ وہ بذاتِ خود اس کی کمی کو محسوس کرنے کے بعد اسے لینے آچکا ہے۔ خوش بختی کا ایسا احساس تھا جو اسے لمحوں میں گلاب کی مانند کھلا چکا تھا۔ اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ دوپٹا اُٹھا کر اوڑھا وہ تیزی سے باہر آئی تو عبدالعلی کو راہداری کے سرے پر بریرہ کے ساتھ محو گفتگو پا کر اس کے قدموں کی رفتار خود بخود دھیمی پڑگئی تھی۔ اور نظریں اس پر ٹھہر گئیں۔ جو بے حد سنجیدہ تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کے وجود سے لاتعلق و بے نیاز۔ قدر کو یہ لاتعلقی بھی بری نہیں لگی۔

"ٹھیک ہے بوجانی! اجازت! پھر ملاقات ہوگی انشاء اللہ!" قدر نزدیک آئی تو عبدالعلی بریرہ کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہوگیا تھا۔ بریرہ نے باری باری دونوں کو گلے لگایا تھا اور پیار کیا۔

"جاؤ بیٹے! اب میں تمہیں نہیں روکوں گی۔ عبدالعلی اگر خود لینے نہ آیا ہوتا تو میں کبھی تمہیں جانے نہ دیتی۔" بریرہ مسکرا رہی تھیں۔ قدر جھینپ کر سر جھکا گئی۔ عبدالعلی کے ہمراہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے دروازہ بند کرتے اس کے تاثرات دیکھے جو ہنوز سنجیدہ بلکہ خطرناک قسم کے ہورہے تھے۔ باہر موسم کے تیور غضب کے تھے اور اندر وہ شخص اس کے قریب تھا۔ گاڑی کے ماحول میں خاموشی تھی۔ اور گاڑی کی چھت سے ٹکراتی بارش کی بوندوں کی مدھم تان، قدر پر جیسے کیف طاری ہونے لگا۔ زیادہ دن نہ بیتے تھے۔ جب اس نے ایسے ہی موسم میں اس شخص کے ہمراہ طویل سفر کی خواہش دل میں ہمکتی محسوس کی تھی۔

"اب بھی انکار کردیتیں آپ! نہ آتیں میرے بلانے پر جیسے بوجانی کو منع کیا تھا اور جیسے اتباع کو انکار کیا تھا۔"

گاڑی گیٹ سے نکل کر خطرناک ٹرن لے کر سڑک پر دوڑنے لگی تب وہ بادلوں کی سی گھن گرج کے ساتھ بولا پڑا تھا۔ قدر جو کسی اور ہی جہان میں گم تھی۔ چونک کر اسے تکنے لگی۔ عبدالعلی کے تاثرات اتنے برفیلے، اس درجہ کبیدہ خاطر ہورہے تھے کہ اس پر چھائی ساری ترنگ ہوا ہونے لگی۔ وہ پہلے سیدھی ہوکر بیٹھی پھر اسے نافہم نظروں سے تکنے لگی۔

"کیا مطلب ہے اس بات سے آپ

کا......؟''اس کی آنکھوں میں جلن اترنے لگی تھی پھر سے۔ساتھ ہی نمی بھی، جبھی تو اس کا وجیہہ عکس دھندلانے لگا تھا نظروں میں۔

''مس قدر عبدالہادی! ایک بات ہمیشہ کے لیے نوٹ کرلیں آج آپ۔ مجھے آپ کا اپنے گھر کے علاوہ کہیں اور رہنا وہ بھی رات گزارنے کے لیے...... ہرگز ہرگز پسند نہیں۔ امید ہے مجھے دوبارہ دہرانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''اس کا لہجہ ہنوز سرد اور تنبیہہ آمیز تھا۔ قدر کی ساری خوشی لمحوں میں کافور ہوئی تھی۔ لفظ مس قدر عبدالہادی!''اسے صاف صاف طنز لگا تھا۔ اسے اس کے خوابوں سمیت زمین بوس کرتا ہوا۔ وہ لمحوں میں ریزہ ریزہ ہوئی تھی۔ خود بھی' خواب بھی۔

''تو پھر آپ کو مجھے واپس میرے گھر پہنچانا چاہیے۔ بی کوز میرا گھر تو وہی ہے۔''اس کا لہجہ طنزیہ ہوا۔ اب کے عبدالہادی نے اسے ونڈ اسکرین سے نگاہ ہٹا کر دیکھا تھا۔ چاہے یہ نگاہ کتنی ہی پُرتپش اور آنچ دیتی ہوئی کیوں نہیں تھی۔

''جہاں میں اس وقت آپ کو لے جارہا ہوں۔ یہ بھی آپ کا ہی گھر ہے۔ آپ نہ سمجھیں تو الگ بات...... مگر حقیقت سے فرار ممکن نہیں۔''

اس کا لہجہ، اس کے الفاظ بھی اس کی نظروں کی طرح پُرتپش تھے۔ سنجیدگی کچھ اور گھمبیر ہوگئی تھی۔ قدر کو اس سے خوف بھی محسوس ہوا۔ مگر اس خوف کو اس نے اعصاب پر سوار نہیں کیا تھا۔

''اس رشتے یا تعلق کا ایڈوانٹیج لے کر آپ مجھ پر پابندیاں عائد کریں گے......؟''وہ سوالیہ ہوئی تھی۔ اور جواب میں عبدالعلی کی بیگانگی نظروں کو سہنا پڑا تھا۔ وہ بے ساختہ ہونٹ بھینچتی نظریں چرا گئی۔

''اونہہ...... تو اس وجہ سے لینے آئے تھے آپ مجھے؟''وہ جل ہی تو گئی تھی۔

''تو اور کیوں لینے آیا ہوں گا......؟''عبدالعلی کا لہجہ و انداز استہزائیہ ہوا۔

''آپ کیا سمجھیں میں آپ کی کمی محسوس کررہا تھا۔ آپ کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔''وہ مزید گویا ہوا مگر بے حد طنزیہ لہجے میں۔ قدر کو جیسے صحیح معنوں میں آگ لگ گئی۔

''جسٹ شٹ اپ! مجھ سے ایسی فضول باتیں مت کریں۔ عادت نہیں ہے مجھے ان کی۔'' وہ جتنا پھپھک کر بولی تھی۔ عبدالعلی کو اسی قدر ناگواری نے آن لیا۔

''اپنی زبان درست کریں۔ بات کرنے کی تمیز سیکھیں۔ مجھے یہ انداز ہرگز پسند نہیں۔ اور مزید یہ کہ عبداللہ سے آپ کی بے تکلفی سخت گراں گزرتی ہے مجھے۔ کیئر فل نیکسٹ ٹائم۔''اب وہ اسے باقاعدہ گھورتے ہوئے تنبیہہ کررہا تھا۔ قدر اس آخری بات پر حد سے زیادہ جھلس کر رہ گئی۔

''آپ الزام لگا رہے ہیں مجھ پر؟''آنسو اس کی آنکھوں میں مچل رہے تھے۔ عبدالعلی نے ایک نگاہ ڈال کر چہرہ پھیر لیا۔

''نہیں...... صرف آپ کی عادات درست کررہا ہوں۔ میرا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوتا جو تعلق استوار تو کرلیتے ہیں۔ مگر ان کی بقا اور کیئر سے غافل رہتے ہیں۔ مجھے اپنی چیزوں، اپنے رشتوں کو سنبھالنا آتا ہے۔''

وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔ مگر لہجہ اب کے قدرے دھیما اور نرم تھا۔ جو قدر کے جلتے تپتے دل پر پھوار بن کر برسا تھا صحیح معنوں میں۔ یہ احساس کہ وہ اس پر حق جتا رہا تھا بہت فخر میں مبتلا کردینے والا۔ غرور سے بھرنے کو کافی تھا۔ اسے مقدور بھر تسلی ہوئی تھی۔ وہ اس احساس کے ہمراہ رہنا چاہتی تھی مگر دل ملکیت پر آمادہ تھا۔ پوری اجارہ داری

چاہتا تھا۔ جبھی شا کی ہونے لگی۔
''مجھے بھی آپ کا امن سے گھلنا ملنا اور بے تکلف ہونا......''
''یہیں رُک جائیں قدر صاحبہ! اس الزام کے متعلق دوبارہ سوچیے گا بھی مت۔ ورنہ ہرگز لحاظ نہیں رکھوں گا۔ سن لیں آپ۔'' وہ ایکدم سے بھڑک اٹھا تھا۔ قدر سہم کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس قدر طیش میں تھا کہ چہرے کے حساس حصوں میں سرخی ہی نہیں اتری۔ باقاعدہ بھاپ سی نکلنے لگی۔ قدر روہانسی چہرے کا رخ کھڑکی کی جانب پھیر کر باہر گرجتے برستے بادلوں کا قہر ملاحظہ کرنے لگی۔ بارش میں بھیگ کر اسٹریٹ لائٹس میں چمکتی سڑک اور روشن سائن بورڈ بھیگتے کراچی کا منظر بھی کم حسین نہیں تھا۔ مگر اس کا دل غبار سے بھرتا جا رہا تھا۔ وہ بے حد شا کی تھی۔ اسے صاف لگتا تھا۔ یہ مفاد پرست شخص ساری عمر اسے یونہی رلائے گا، تڑپائے گا۔ اس کا ہو کر بھی کبھی خود کو پورا اسے نہیں سونپے گا۔ وہ اسے پا کر بھی تشنہ رہے گی۔ جیسے اس پل اس کی قربت میں مضطرب اور بے قرار تھی۔ باقی کا سارا راستہ اس نے خاموش آنسو بہائے تھے۔ اور پلٹ کر عبدالعلی کو نہیں دیکھا۔ یہ بھی ممکن نہ تھا کہ وہ اس کی گریہ و زاری سے بے خبر رہا ہو۔ ہاں البتہ بیگانہ ضرور بنا رہا۔ لاتعلق بھی۔ جو اس کی توجہ کی شعوری یا لاشعوری طور پر منتظر تھی۔ اس درجہ بے حسی کے مظاہرے پر اس کا دل صحیح معنوں میں خون ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ علیزے اور لاریب سمیت باقی سب کی حیرانی یا خوشگواری بھی اس کا موڈ بحال نہیں کر سکی۔ جو عبدالعلی کے ہمراہ اسے دیکھ کر سب خوش ہو رہے تھے۔
''آپ نے کیوں بھیجا تھا مجھے لینے انہیں۔''
موقع ملتے ہی وہ علیزے سے اُلجھنے لگی تھی۔
علیزے نے گہرا ٹھنڈا سانس بھرا۔
''ہمیں تو خود ابھی پتا چلا۔ تم نے دیکھا نہیں۔ تمہارے ماموں ممانیاں سب کتنے حیران ہوئے ہیں۔ عبدالعلی تمہیں کیوں لایا یہ اسی کو معلوم ہوگا۔'' علیزے کو اس کا خراب موڈ پھر پریشان کرنے لگا۔
''خود کو کچھ سمجھتا ہے آپ کا لاڈلا داماد! ابھی سے پابندیاں عائد کر رہے ہیں مجھ پر مگر......'' عبدالعلی کو وہاں قدم رکھتے پا کر وہ بے ساختہ زبان دبا گئی۔ علیزے کی نگاہ عبدالعلی پر پڑی تو جیسے خاموشی کی اچانک وجہ کو سمجھ گئی تھی۔ ایک انوکھا سا طمانیت کا احساس بھی نصیب ہوا۔ صد شکر کسی کا تو لحاظ تھا۔
''آؤ بیٹے!'' ان کا انداز محبت آمیز تھا، قدر کی روح جل کر خاک ہونے لگی۔ وہ جتنی فرصت سے آ کر بیٹھا تھا۔ اندازِ نشست بتاتا تھا۔ طویل گفتگو کا ارادہ ہے۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
''کہاں جا رہی ہو......؟ بیٹھ جاؤ تم بھی۔''
علیزے اس کا ارادہ بھانپ کر ہی بولی تھیں۔ انداز میں عجیب سی بے بسی تھی۔ وہ ہونٹ بھینچے جواب دیے بنا پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ عبدالعلی خاموش تھا۔ علیزے کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ عبدالعلی نے کہے بغیر ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ ڈھارس کے انداز میں رکھ دیا۔
''کیوں فکر کرتی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو سب بہتر ہوگا بوجانی!'' علیزے اس یقین پر اس بھروسے اور ساتھ پر ممنون و مشکور ہوتی بالآخر مسکرا دی تھیں۔

☆......☆......☆

''یہ والا ڈریس ٹھیک ہے نا اتباع کی بچی!

میں شاپنگ کے لیے جاتے یہ لباس پہن لوں؟''
عبدالعلی بال کمرے میں داخل ہوا تو اپنا سوٹ کیس کھولے کپڑوں کا ایک انبار جمع کیے بیٹھی وہ خوامخواہ چیخ رہی تھی یا عبدالعلی کو اس کا بلند آواز سے بولنا چیخنے کے مترادف لگتا تھا اور سخت کوفت تھی۔ اس وقت بھی اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

''اتباع کمرے یا گھر سے باہر نہیں ہے کہ آپ کو اتنا لاؤڈ ہونا پڑ رہا ہے۔ بات کرنے کا کوئی طریقہ بھی ہوتا ہے۔قدر نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ مخاطب بھلے ضرور تھا اس سے مگر متوجہ ہرگز نہیں...... اوپر سے ملامت کرتا ہوا انداز...... کیا پھر بھی اسے آگ نہ لگتی۔ توہین کے ایک ہی وقت کے اتنے انداز حرف اسی ایک شخص کو آسکتے تھے۔

''اتباع لوگوں سے کہہ دو۔ مجھے فضول کی روک ٹوک اور پابندیاں پسند نہیں ہیں۔'' بنالحاظ رکھے وہ ترخ کر کہتی پھر اسی اطمینان سے ایک اور سوٹ اٹھا کر دیکھنے لگی۔ جبکہ اتباع عبدالعلی کے چہرے پر انڈتا غیض دیکھ کر ہی خائف ہونے لگی تھی۔

''بھائی جان آپ......'' عبدالعلی نے ہاتھ اُٹھا کر اس کی بات درمیان میں ہی قطع کردی۔ اس کے چہرے کی بڑھتی سرخی اس کے غیض کی گواہ تھی۔

''اتباع تم جاؤ۔ ایک کپ چائے کا بنالانا میرے لیے۔ ساتھ میں ایک پین کلر بھی اگر ہوسکے تو۔'' اس کا لہجہ وانداز نرمی ورسان سموئے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود اتباع مضطرب وبے چین تھی۔ اور جیسے ناچار وہاں سے گئی۔ عبدالعلی نے اس کے دروازے سے نکلنے کا باقاعدہ انتظار کیا تھا۔ پھر قدر کی جانب متوجہ ہوا جو اسے نظر انداز کرنے کی کوشش میں معروف خود کو مگن ظاہر کررہی تھی مگر حقیقتاً اس کا دل اتنی قوت سے دھڑک رہا تھا گویا کسی بھی پل پسلیاں توڑ کر باہر آن گرے گا۔

''آپ شاپنگ کے لیے ان لوگوں کے ساتھ نہیں جائیں گی۔ سن لیا آپ نے......؟''
رسٹ واچ اُتار کر صوفے پر بیٹھتا ہوا وہ ٹھنڈے انداز میں حکم دے رہا تھا۔ قدر نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ وہ متوجہ نہیں تھا چونکہ جبھی وہ اسے گھورنے کا شوق پورا کرتی رہی۔

''ان لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گی تو کیا آپ لے کر جائیں گے مجھے......؟'' اپنے تئیں اس نے لاجواب کرنا چاہا تھا اسے۔ مگر عبدالعلی نے ہارنا نہیں سیکھا تھا۔

''ابھی اس کا موقع نہیں آیا۔ ویسے بھی میں ان فضولیات میں وقت برباد نہیں کرتا۔'' عبدالعلی کا لہجہ بے حد روکھا ہونے لگا۔ قدر کو تذلیل کے شدید احساس نے دہکا کر رکھ دیا۔ دکھ کا احساس اتنا گہرا اور قوی تھا کہ اس کی قوت گویائی بھی سلب ہو کر رہ گئی۔

''آپ مجھے پسند نہیں کرتے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے آپ کو پرمٹ مل گیا ہے میری تذلیل کرنے کا۔'' ہزار ہا ضبط کے باوجود آنکھوں کے کناروں سے دو موتی ٹوٹ کر گالوں پر بکھر گئے تھے۔ عبدالعلی جو اسی پل متوجہ ہوا تھا۔ جیسے ایک پل کو اسی لمحے کے سحر میں جکڑا گیا۔ یہ لمحاتی اثر تھا۔ اگلے پل وہ نارمل تھا۔ اور سر جھٹک چکا تھا۔

''آپ کو ایسا ہی کیوں لگتا ہے کہ میں آپ کی تذلیل کررہا ہوں۔ محترمہ آپ یہ بھی سمجھ سکتی ہیں کہ میں آپ کی بھلائی چاہتا ہوں۔'' اس کا لہجہ قدرے دھیما اور نرم ہوا۔ گویا اس لمحے کے سحر کا

اثر باقی تھا۔

''میں احمقوں کی جنت میں قیام کی قائل نہیں۔'' قدر نے درشتی سے کہا تھا اور ایک جھٹکے سے باہر نکل گئی۔ عبدالعلی طویل نیند لے کر اٹھا تو گھر میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ وہ قطعی بھول چکا تھا۔ ان لوگوں کو بازار جانا تھا۔ جبھی اتباع کو پکارتا ہوا کچن کی جانب آگیا کہ وہیں سے برتنوں کی کھسر پھسر کی آواز کسی کی موجودگی کا احساس دلاتی تھی۔ مگر اتباع کی بجائے قدر کو وہاں موجود پاکر وہ الٹے قدموں مڑا تھا کہ قدر نے ہی ہار مانتے ہوئے اسے پکارا تھا۔

''مجھے بتادیں کیا چاہیے......'' یہ طے تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور وہ تھی عبدالعلی نہیں۔ پھر کوئی بھی مقام ہوتا جھکنا اسے ہی پڑتا تھا۔

''زحمت نہ کریں۔ میں اتباع سے کہہ دوں گا۔'' وہ رُک تو گیا تھا۔ مگر پلٹا نہیں۔ قدر نے طویل گہرا سانس کھینچا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''اتباع اور ممانی جان گھر پر نہیں ہیں۔ مما اور بو بھی ابھی محلے میں کسی کی عیادت کو نکلی ہیں۔'' قدر کے جواب پر عبدالعلی نے کچھ سوچا پھر اندر چلا آیا۔ ہاٹ پاٹ دیکھا۔ ایک دوپہر کی روٹی پڑی تھی۔ اس نے وہی اٹھالی سالن موجود تھا۔ اسے گرم ہونے کو رکھا۔ اور فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالنے لگا۔

''یہ صبح کی روٹی ہے آپ نہ لیں یہ......'' قدر رہ نہ سکی۔ بول پڑی تھی۔ اپنی چائے کو بھولے جو اس نے بڑی توجہ سے بنائی تھی۔

''کیوں...... اسے کیا ہوا؟'' وہ اچنبھے میں گھر کر بولا تھا۔ قدر گڑبڑائی۔

''یہ رزق کی بے قدری ہوتی ہے کہ اسے محض اس بنا پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ بالکل تازہ نہیں ہے۔'' عبدالعلی کا لہجہ پرسان تھا۔ ٹھہرا ہوا۔ سمجھاتا ہوا۔ قدر کو بے تحاشا شرمندگی نے آن لیا۔ جبھی چہرے کے حساس حصوں میں ہلکی سی سرخی دوڑنے لگی۔

''مم میرا مطلب تھا کہ یہ ایک روٹی ناکافی بھی تو ہوگی آپ کے لیے......'' وہ ہاتھ مسل رہی تھی۔ عبدالعلی نے کاندھے جھٹک دیے۔

''اٹس اوکے، ہوجائے گا گزارہ۔'' سالن گرم ہوچکا تھا۔ وہ پلیٹ میں نکال رہا تھا۔

''مم میرا مطلب میں بنادوں آپ کو؟'' وہ فریج کی طرف گئی۔ عبدالعلی چونک کر متوجہ ہوا۔

''آپ کو روٹی بنانی آتی ہے؟'' اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔ طنز نہیں۔ اس کے باوجود وہ شرمندہ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ جبھی بے ساختہ نظریں چرا گئی۔ عبدالعلی کو جواب مل گیا تھا۔

''تو بس پھر رہنے دیں۔'' قدر اسی شرمندگی میں مبتلا فریج سے سلاد کی پلیٹ نکال لائی تھی۔ اس کے بعد رشین سیلڈ بھی اسے پیش کردیا۔

''کوئی پئیں گے یا چائے؟'' وہ کتنی مستعد تھی۔ عبدالعلی نے اب کی بار نگاہ نہیں اٹھائی۔

''میں بنالوں گا خود...... آپ جائیں اب اپنے کمرے میں...... دوپٹا وہیں ہوگا آپ کا غالباً۔'' اس کا لہجہ ہلکی سی تپش لیے تھا۔ قدر جس کا واقعی دھیان اس جانب نہیں گیا تھا۔ اسے دوپٹے کی عادت ہی نہ پڑسکی تھی۔ حالانکہ علیزے ہر وقت اسی ایک بات کے لیے اسے ڈانٹتی تھیں۔ پیار سے، محبت سے، ہر طرح سے اسے سمجھا کر دیکھ لیا تھا۔ مگر اسے دوپٹا جیسے پھندا محسوس ہوتا۔ بھاری بوجھ لگتا۔ ان کے کہنے پر وہ زیادہ ہوا تو کاندھے پر ڈال لیتی۔ ورنہ ہاتھ میں ساتھ لیے پھرا کرتی۔ اب وہ گھر پر نہیں تھیں۔ تو سب سے پہلے دوپٹے سے ہی نجات حاصل کی تھی۔ عبدالعلی

کے الفاظ جیسے زہریلے پتھر تھے۔ جو سناتے ہوئے آ کر سیدھے دل میں پیوست ہوئے تھے۔ پہلے اس کا چہرہ دھواں ہوا پھر آنکھیں بھی دھندلا گئیں۔ دل رنج سے بھرا تھا۔ وہ ایک لمحے کے توقف سے پلٹ کر وہاں سے بھاگی تھی۔ عبدالعلی کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ چند لمحوں میں اس پر کیا سے کیا قیامت ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے ٹائم دیکھا۔ ظہر میں ابھی کچھ منٹ تھے۔ اس نے چند برتن جو تھے وہ یونہی چھوڑنے کی بجائے دھو کر رکھے اور اپنے لیے چائے بناتے نگاہ چائے کے بھرے ہوئے مگ پر جا پڑی۔ اسے قدر کا کچن میں آنے کا مقصد یاد آیا۔ اس کی وجہ سے وہ اپنی چائے سے غافل ہوگئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکان جاگی۔ اس کا مگ بھی ساس پین میں الٹ دیا۔ چائے تیار ہونے پر چھان کر دو مگ تیار کیے اور ٹرے میں رکھے اس کے کمرے کی جانب آ گیا۔ دستک کو ہاتھ بڑھایا تھا۔ مگر نیم وا دروازے سے اس کی سسکیوں کی آواز پر چونکتا یکدم تھم گیا۔ ٹرے ہاتھوں میں تھی۔ جبھی کاندھے کے دباؤ سے دروازہ دھکیلتا ہوا اندر آ گیا تھا۔ وہ بیڈ پر گری گریہ وزاری میں مصروف تھی۔

''قدر......!'' عبدالعلی نے ٹرے میز پر رکھتے پریشانی کے عالم میں اسے پکارا تھا۔ وہ ایکدم ساکن ہوگئی تھی اس کی موجودگی کو محسوس کر کے...... پھر ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔

''کیوں آئے ہیں......؟ آپ کو ایٹی کیٹس کا پتا ہے؟ بغیر دستک کسی کے کمرے میں آنا کتنی معیوب بات ہے؟'' بکھرے بال...... آنسوؤں سے بھیگا گلاب چہرہ اس پر آتش فشانی موڈ۔ عبدالعلی تو اسے دیکھتا رہ گیا۔

''الحمد للہ! ایٹی کیٹس کا پتا ہے۔ آپ کے کمرے میں بغیر دستک کے آ سکتا ہوں۔ یہ بات آپ کو بھی معلوم ہوگی۔ پھر اعتراض بے جا کیوں......؟ یہ بتایئے رو کیوں رہی ہیں؟'' ہر اعتراض کند کرتا ہوا وہ اپنی بات کی اہمیت واضح کر چکا تھا۔ قدر کو حجاب آمیز کوفت اور جھنجلاہٹ نے آن لیا۔ کچھ کہے بغیر وہ اسے کچھ دیر گھورتی رہی۔ عبدالعلی جیسے ہی متوجہ ہوا اس کی نظریں جھک گئیں۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے......'' اس کا لہجہ اپنا مگ اٹھاتے بے حد کڑا ہوگا۔ گویا اپنی بات کی اہمیت نہ ملنا اسے طیش دلا رہا تھا۔

''جوتا ضروری نہیں ہے ہاتھ سے اُٹھا کر مارا جائے۔ اکثر جوتے زبان کے ذریعے، الفاظ کے سہارے مارے جاتے ہیں۔ جو ہاتھ کے جوتے سے زیادہ سختی سے لگتے ہیں۔ زیادہ تکلیف دیتے ہیں۔'' سر جھکا کر وہ بے حد مدھم آواز میں بولی تو گلے میں موجود نمی اس کے الفاظ اور آواز میں خود بخود اُتر آئی تھی۔ عبدالعلی نے گہرا سانس کھینچا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''یہ چائے لایا تھا آپ کے لیے۔ آپ وہیں بھول آئی تھیں۔'' سوال گندم جواب چنا...... قدر دہک کر رہ گئی۔ دانت کچکچاتے اس کا بس نہیں چل سکا۔ عبدالعلی کا سر پھاڑ دے۔

''کسی کو جرأت نہیں ہوسکتی کہ آپ کی جوتوں سے تواضع کرے۔ یہ ہماری کجیاں ہی ہوتی ہیں جو ایسے رویوں کا باعث ٹھہر سکتی ہیں۔ افسوس کا مقام یہ بھی ہونا چاہیے تھا کہ جس وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ اس خامی پر قابو پانے کی بجائے آپ نے محض اس کے اسباب پر کڑھنے پر وقت ضائع کر ڈالا۔'' عبدالعلی کے الفاظ جتنے بھی سلگتے ہوئے تھے۔ مگر اس کی نظروں کی خفگی اور چبھن

...... قدر کا بس نہیں چل سکا۔ ترمین پھٹ جائے وہ اس میں سما جائے۔ عبدالعلی کمرے سے جا چکا تھا۔ قدر کی خفت و شرمندگی پر پھر سے رنج و ملال غالب آ گیا۔ طیش کا غلبہ اتنا شدید تھا کہ اس نے پہلے اٹھ کر جائے کا مگ جھپٹ کر دیوار پر مارا تھا پھر دوپٹا بھی گول مول کر کے دور کونے میں پھینک دیا۔

''نہیں مانوں گی تمہاری کوئی بات بھی...... اگر تمہیں مجھ سے کوئی لگاؤ کوئی دلچسپی نہیں ہے تو میں کیوں سدھار دوں خود کو تمہاری خاطر...... عبدالعلی یہ طے ہوا کہ میں خود کو تمہاری راہوں میں نہیں بچھاؤں گی۔ مر سکتی ہوں مگر ہار تسلیم نہیں کروں گی۔ اگر تمہیں اپنی انا عزیز ہے تو میں بھی انا قربان نہیں کر سکتی۔'' گھٹنوں میں چہرہ چھپائے وہ پھر سے سسک رہی تھی۔

☆......☆......☆

''یہ لباس پہنو گی تم؟'' اتباع رہ نہیں سکی تو بالآخر اعتراض اٹھا دیا تھا۔ قدر جو ہاتھوں پیروں پر مہندی لگوائے قالین پر کشن کے سہارے نیم دراز آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ کانوں میں ہینڈ فری لگی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑا گہرا اطمینان تھا۔ اتباع کی بات اس تک پہنچ بھی کیسے سکتی تھی۔ علیزے کے منع کرنے کے باوجود وہ فل بازوؤں پر مہندی کے نقش و نگار بنوا چکی تھی۔ سلیو لیس شرٹ اور ہاف پنڈلیوں تک آتی اسٹاکنگ سی جینز میں بالوں کی اونچی پونی بنائے تمام تر جاذبیت اور چہرے سے چھلک پڑتی معصومیت کے باوجود بھی اس کا حلیہ خاصے سے زیادہ قابلِ اعتراض تھا۔ علیزے نے اپنی پیش نہ چلتی دیکھ کر اتباع کو ہی تاکید کی تھی۔ اندر سے دروازہ لاک کرنے کی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں۔ جب تک وہ اس حلیے میں ہے۔ گھر کے مردوں کی اس پر نظر پڑے۔ کہ ان کے خیال میں اس نے تو شرم و لحاظ ترک کر ڈالا تھا۔ جبکہ علیزے اس کی حرکتوں سے عاجز تھیں اب پریشان بھی ہو چکی تھیں۔

''یہ بہت بری بات ہے قدر! یہ اطوار مناسب نہیں۔ تمہیں اسی گھر میں بیاہ کر آنا ہے۔ بیٹے...... دل جیتنے کی بجائے تم اُلٹا سب کو عاجز کر رہی ہو۔'' وہ کتنی بے بس ہو رہی تھیں اس کے سامنے۔

''مجھے دل جیتنے کی مشقت میں نہیں پڑنا مما! جس نے مجھے ایسے قبول کرنا ہے کرے۔ ورنہ ہرگز مجبوری نہیں۔'' وہ کتنی بے مروتی سے کہہ گئی تھی۔ علیزے کے دل، ان کے احساسات کی پروا کیے بغیر۔

''فل بازوؤں پر مہندی لگوانے کی کیا ضرورت ہے؟ جب نظر نہیں آنی تو فائدہ؟'' علیزے کا اعتراض رخ تبدیل کر گیا تھا۔ یا شاید اس کے ارادوں کی تباہی کا اندازہ کرنا مقصود تھا۔

''کیوں نہیں نہیں آنی مما!'' وہ جھنجلائی تھی۔

''سلور لہنگا پہنوں گی میں اس کی آستینیں نہیں ہیں۔'' اس نے نخوت سے واضح کیا تھا۔ اور علیزے ہونٹ بھینچ کر رہ گئیں۔

''تم وہ لباس نہیں پہنوں گی قدر......!'' وہ عاجز ہوئیں قدر اسی قدر برافروختہ۔

''میں تو وہی پہنوں گی۔ یا پھر اس تقریب میں شامل نہیں ہوں گی۔ فیصلہ کر لیں اور مجھے بتا دیں۔'' اس نے بے حسی بے مروتی اور بدتمیزی کی انتہا کرتے کانوں میں ہینڈ فری لگا کر لیٹ گئی۔ تب ہی اتباع اندر آئی تھی۔ علیزے اُلجھ رہی تھیں۔ مگر کچھ کہے بغیر اٹھ گئیں۔

''افوہ بھئی...... کیا مصیبت ہے؟'' اتباع نے آ کر اس کی ہینڈ فری کھینچی تب وہ جھلا کر اٹھ

بیٹھی۔ ''تمہاری مہندی سوکھ گئی ہے۔ ہاتھ پیر دھولو اور لپ اسٹک یہ پہنو گی میں نے پوچھا ہے۔'' اتباع سنجیدہ تھی۔

''ہاں..... تمہیں بھی اعتراض ہے تو بتا دو۔'' وہ اٹھتے ہوئے بے حد چڑ کر بولی۔ اتباع نے گہرا سانس کھینچا۔

''اگر جو مجھے اعتراض ہو تو تم ارادہ بدل دو گی؟'' اتباع خود اپنے ہاتھوں پیروں کی مہندی کرید کرید کر اُتار رہی تھی۔ اسے بغور دیکھ کر مسکرائی تو قدر نے گہرا سانس بھر کے پوری شدومد سے سر کونفی میں جنبش دی۔

''ہرگز ہرگز بھی نہیں۔'' اتباع کا چہرہ پھیکا پڑ گیا مگر خود کو سنبھال لیا تھا۔

''بھائی جان کو بالکل اچھا نہیں لگے گا قدر......!'' وہ بے حد دھیمی رہ کر بولی تو قدر کے چہرے پر آنکھوں میں استہزا بکھر گیا۔

''تو پروا کس کو ہے۔ انہیں تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔'' اس کا لہجہ و انداز متنفرانہ ہوا۔

''قدر پلیز!'' اتباع ملتجی ہوئی۔ قدر نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔

''یہ بات نہیں مانوں گی اتباع! فضول میں ٹائم برباد نہ کرو۔ بتاؤ تم نہاؤ گی پہلے یا میں چلی جاؤں واش روم۔'' وال کلاک پر نگاہ ڈال کر وہ بے نیازی سے بولی تھی۔ اتباع کے انداز میں ملال اور بے دلی در آئی۔

''تم چلی جاؤ۔'' اس کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ قدر نے شانے اُچکا دیے تھے۔ اپنا لباس اٹھایا اور واش روم میں جا گھسی۔ وہ ایسے ہی بیٹھی تھی جب عبیر اندر آئی تھیں۔ اسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے دیکھ کر بولیں۔

''اتباع......! کیا ہوا بچی!'' ان کے انداز میں تشویش تھی۔ وہ چونکی پھر ایکدم سنبھل گئی۔

''کچھ نہیں امی جان! آیئے۔'' وہ زبردستی مسکرانے لگی تھی۔

''مہمان تو آنے والے ہیں بیٹے! آپ ابھی تک تیار بھی نہیں ہوئیں۔ آپ نے منع کر دیا۔ ورنہ بیوٹیشن تیار کر دیتیں آپ کو......''

''مسئلہ نہیں ہے امی جان! امن اور قدر یہ کام کر لیں گی بخوبی! آپ پریشان نہ ہوں۔'' وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔ عبیر مسکرا دیں۔ پھر اس کے حنائی ہاتھوں کو دیکھ کر ایکدم کھل اٹھیں۔

''ماشاء اللہ! بہت خوب رنگ چڑھا ہے۔ بہت جچی ہے مہندی آپ کو بیٹے! اللہ نصیب بھی بہت اچھا کرے آمین۔'' انہوں نے اس کی پیشانی چومی تھی۔ اتباع جبراً مسکرائی۔ جسے انہوں نے محسوس کیا۔

''خوش تو ہو بیٹے!''

''جی امی جان!'' وہ حجاب آمیز انداز میں نظریں جھکا چکی تھی۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ عبداللہ بہت اچھا بچہ ہے ہر لحاظ سے' پھر آپ سے محبت بھی بہت کرتا ہے۔ انہوں نے پھر اس کی پیشانی چومی۔ اتباع کے چہرے پر تمتماہٹ سی بکھرنے لگی۔ پلکیں بوجھل ہو چکی تھیں۔

''غسل کر لیا تم نے......؟''

''نہیں واش روم میں قدر ہے۔ میں بعد میں جاؤں گی۔'' اتباع کا لہجہ ہنوز تھا۔

''بیٹے بہت دیر ہو جائے گی۔ آپ کے بال بھی بہت لمبے اور گھنے ہیں۔ سوکھنے میں ٹائم لگتا ہے۔ آپ ایسا کرو میرے کمرے میں آجاؤ۔ اِدھر ہاتھ لے لو...... ہاں......؟'' انہوں نے اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑ کر اٹھایا۔ وہ جھجک سی گئی۔

بابا جان کمرے میں ہوں گے امی جان! ان کے سامنے سے شرم آ رہی ہے پلیز!'' وہ منمنائی تو عبیر مسکرا دی تھیں۔ ہلکا سا ہنسیں بھی۔

''تمہارے بابا جان آج تمہاری اماں کے ساتھ ہیں۔ انہی کے کمرے میں تیار ہوئے ہوں گے۔ آپ آ جاؤ۔'' اس جواب پر اتباع قدرے ریلیکس ہو کر ان کے ساتھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

اس کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ ہلکی پھلکی سلور جیولری...... بے حد خوبصورتی سے کیا گیا سلور میک اپ...... سلور کیچر میں جکڑے تراشیدہ سلکی بال جن کی موٹی لٹیں پھر بھی اس کے گالوں اور گردن کے ساتھ کاندھوں پر جھولتی اس کی دلکشی میں اضافے کا سبب بن رہی تھیں۔ اس نے قدرے مطمئن ہو کر خود اپنے عکس کو سراہا اور ہر زاویے سے خود کو دیکھنے کے بعد اسٹول پر بیٹھ کر قدرے جھک سی گئی۔ نازک سینڈل میں اس کے گلابی گداز حنائی نازک پیر آئے تو جیسے جوتوں کی قسمت جاگ اٹھی۔ قیمت وصول ہوئی۔ اس کا دل چاہا ایکدم سے عبدالعلی کہیں سے آن نکلے اور اس کا یہ روپ دیکھ کر کہیں کا نہ رہے۔ اسی کے لیے تو آج پور پور سجائی تھی اپنی...... وہ چاہتی تھی وہ اپنے سارے غرور سمیت اس کے سامنے آن گرے۔ اس کی بے نیازی، اس کی اکڑ خاک میں مل جائے۔ بس یہی تمنا تھی۔ اور اتنی شدید تھی کہ جو اسے کمرے سے نکال لائی تھی۔ دانستہ اس کا سامنا کرانا چاہتی تھی۔ اور جب کسی کام کی جدوجہد کی جائے اس کا حصول اتنا بھی ناممکن نہیں رہتا۔ بہرحال عبدالعلی اسی گھر کا مکین تھا۔ اس کے روبرو ہونے کے لیے اسے نہ جنت کا سفر طے کرنا تھا نہ کوہ کاف تک رسائی کی ضرورت تھی۔

دوپٹا داہنے شانے پر رکھے چٹکیوں میں پیروں میں رلتا ہوا لہنگا ذرا سا اوپر اٹھائے وہ سج سج جیسے پھولوں پر چلتی باہر آئی تھی تو پہلا سامنا ہی عبدالاحد سے ہو گیا۔ آف وائٹ کلف لگے شلوار قمیض میں ملبوس ہاتھوں میں پھولوں کے گجروں کا شاپر اٹھائے وہ اسی سمت آتا ٹھٹک کر رُکتا اسے دیکھنے لگا۔

ہونٹ خود بخود ستائش کے انداز میں کھل گئے۔

''افوہ...... یہ تم ہو......؟ یعنی اپنی قدر...... آج تو لوگ پہچانے بھی نہیں جا رہے۔'' وہ مسکرا کر چھیڑنے کا آغاز کر چکا تھا۔ قدر نے ناز سے اکڑی گردن مزید اکڑا لی۔ مگر بولی تو انداز میں خود ستائشی اور نخوت تھا۔

''آج سے کیا مطلب...... میں تو ہمیشہ سے ایسی ہی ہوں۔ بس ذرا خود پر توجہ نہیں دیتی۔'' عبدالاحد اس درجہ خود نمائی پر ہنس دیا تھا۔

''بہت خوب...... اعلیٰ اعلیٰ۔'' وہ جھومنے لگا۔

''صرف آج...... کس پر بجلیاں گرانے کا ارادہ ہے محترمہ کا......'' وہ پھر شریر ہونے لگا۔

''جس پر بھی ہو۔ تم تمیز سے ذرا بات کیا کرو مجھ سے۔'' اس نے فی الفور ٹوکا تھا۔ عبدالاحد کا منہ کھل گیا۔

''وہ کس سلسلے میں......؟ تاریخ گواہ ہے محترمہ خاص چھوٹی ہیں مجھ سے۔'' وہ ہرگز قائل اور متاثر ہونے کو تیار نہیں تھا۔ قدر کو غصہ آنے لگا۔

''میں بھی عمر کی بات نہیں کر رہی۔ رشتے کا لحاظ رکھو سمجھے؟''

''افوہ...... اب یہ نہ کہہ دینا۔ بڑی بھاوج، ماں برابر......'' وہ ٹھی ٹھی کرنے لگا۔ قدر نے اسے گھورا اور جھپٹ کر اس سے گجروں کا شاپر اُچک لیا۔

''بس یہی ایک کمی تھی۔ میرے لیے بھی

لائے ہو گے یقیناً نہیں لائے تو جا کر اتباع کے لیے اور لے آؤ۔" اس کی بے نیازی نقطہ عروج پر جا پہنچی تھی۔ عبدالاحد نے ہلکی سی آہ بھری۔

یہ تیرا سجنا سنورنا بن ساجن کے بے کار ہے
یہ پائل چوڑی کنگنا بن ساجن کے بے کار ہے۔

وہ شوخی سے گنگنایا تھا۔ انداز جتلانے والا تھا۔ جب اس کی گنگناہٹ عبدالعلی کی سرد پھنکارتی آواز میں دب کر رہ گئی۔ وہ تھرا کر پلٹا تھا۔

"جج جی...... بھائی جان!" اس کا رنگ ایک لمحے میں فق ہو گیا تھا۔ وہ تو اس سے ویسے ہی بہت خائف رہتا تھا۔ مگر اس وقت اس کی برہمی نے اوسان ہی خطا کر ڈالے۔

"اماں نیچے بلا رہی ہیں تمہیں۔ جاؤ بات سنو ان کی۔" عبدالعلی کا لہجہ ہنوز سرد تھا۔ اور انگارہ صفت نظروں کا مرکز قدر کا سجا سنورا سراپا تھا۔ مگر ان نگاہوں میں ستائش کی بجائے قہر کروٹیں لے رہا تھا۔

"اپنے کمرے میں چلیں۔" قدم بڑھا کر اس کے نزدیک آتا وہ اب کے دھاڑا تھا۔

"کیوں......؟" قدر مجال ہے جو ڈگمگائی ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈٹ کر بولی۔ عبدالعلی کا قہر حدوں سے نکلنے لگا۔ اس کا ہاتھ اس پر اٹھتا اٹھتا رہ گیا۔ کلائی فولادی گرفت میں جکڑ کر ایک طرح سے وہ اسے گھسیٹتا ہوا کمرے میں لایا تھا۔ اور اس انداز میں کلائی چھوڑی کہ وہ لہرا کر بستر پر جا کر گری تھی۔

"انسان اپنے دل، اپنے جذبات اور اپنے نفس پر قابو رکھے تو یہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ یہ کارنامہ بہت کم لوگ انجام دے سکتے ہیں میں جانتا ہوں۔" وہ بہت سخت انداز میں بات کر رہا تھا۔ قدر کو تو وہ بہت اکتایا ہوا بے زار بھی لگا خود سے۔ اس کا دوپٹا ڈھلک گیا تھا۔ پچھلے گلا بہت زیادہ گہرا تھا۔ مگر اس نے پھر بھی پروا نہیں کی اور سنبھل کر اٹھ کر پھر کھڑی ہو گئی۔

"آپ کو اگر یہ غلط فہمی ہے کہ میں آپ کی وجہ سے یہ سب کر رہی ہوں تو حد ہے پھر آپ کے تکبر کی۔" اس کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی حقارت سمیٹ لایا۔ عبدالعلی نے جواباً اسے جلتی ہوئی پرتپش نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر ہنکارا بھرا۔

"جس کے لیے بھی کر رہی ہیں۔ قابلِ اصلاح ہے۔ قدر صاحبہ حضرت امام حسینؓ کا قول ہے کہ مرد کی غیرت کا اندازہ اس کی عورت کے پردے سے لگایا جا سکتا ہے۔ میں آپ کو اس کی کسی صورت بھی اجازت نہیں دے سکتا۔ الحمدللہ میں بے غیرت نہیں ہوں۔ جا رہا ہوں۔ امید ہے آپ یہاں سے نکلیں گی تو اس لباس میں نہیں ہوں گی۔"

اب کے اس کا لہجہ دھیما تھا۔ گھن گرج کے بغیر کسی حد تک ملائمت لیے۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ پلٹ کر چلا گیا۔ قدر کے اندر کا سارا اشتعال، سارا غیض و غضب جیسے جھاگ کی طرح بیٹھنے لگا۔ اس نے اطمینان سے پہلے جیولری اُتاری تھی۔ پھر میک اپ صاف کر دیا۔ تیسرا مرحلہ لباس کی تبدیلی کا تھا۔

(میرا مقصد تمہیں دکھانا تھا عبدالعلی......! تم نے دیکھ لیا۔ اور کیا چاہیے) مسکراہٹ اس کے لبوں کے گوشوں میں اُمڈ رہی تھی۔

(میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اک دن وہ بھی میرا خدا میری زندگی میں لائے گا۔ جب تم مجھ سے محبت کرو گے۔ مجھے اسی دن کا انتظار ہے)

اس نے لباس تبدیل کرتے زیرلب خود سے کہا تھا۔ یا دعا مانگی تھی۔ بہرحال جو بھی ہے۔ وہ ہرگز مایوس نہیں تھی۔ وہ مایوس ہونا بھی نہیں چاہتی تھی۔

(لفظ لفظ مہکتے اِس خوبصورت ناول کی
اگلی قسط ماہِ ستمبر میں ملاحظہ فرمائیے)

افسانہ

سنبل

''یعنی ماں اس سے قدرت نے چھین لی تُو اپنی حرکتوں سے اس سے باپ بھی چھین لے اور تجھے پتا ہے ناں۔ نانی کے ہاں اُس کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے تُو اس کا گلا گھونٹ دے قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔'' وہ غصے اور طنز سے بولا۔ تو سیما......

انسانی رویے جب نا قابلِ برداشت ہو جائیں تو ایسے ہی افسانے جنم لیتے ہیں

میں یعنی شہرام اور نوید بچپن کے دوست تھے۔ ہماری دوستی بڑی عجیب نوعیت کی تھی۔ ہمیں ایک دوسرے کی فیلنگز بغیر کہے ہی پتا چل جاتی تھیں۔ شاید ہماری کیمسٹری آپس میں ملتی تھی۔

اور جب مجھے مناہل سے محبت ہوئی تو بھی سب سے پہلے مجھے اسی نے بتایا۔ مناہل میری خالہ زاد تھی اور بہترین اوصاف کی بنا پر خاندان میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ اور پھر وہ تھی بھی بلا کی خوبصورت، ہر ماں اور اس کے لعل کی نظروں میں سمائی ہوئی تھی۔

اور مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے میں بہت خوش تھا۔ میں نوید کے آفس پہنچا تو اس دن اس پر کام کا زیادہ لوڈ تھا مگر مجھے دیکھتے ہی اس نے سب کام چھوڑ دیے۔ مجھے پانی پلا کر اس نے خود پانی پیا۔

''آج صرف پانی سے کام نہیں چلے گا۔ آج ٹریٹ دے پیزا، چکن تکہ اور آئس کریم، ڈھائی لیٹر کی 7Up کے ساتھ۔'' میں نے مزے سے کہا۔

''بڑا خوش نظر آ رہا ہے کیا بات ہے۔'' اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ''کوئی لاٹری نکلی ہے۔''

''لاٹری ہی سمجھ یار! مجھے محبت ہو گئی ہے۔ I am in love yar۔'' میں خوشی خوشی بولا۔

''ابھی دیتا ہوں تجھے ٹریٹ۔ اب تو تُو دے گا۔ وہ میری گردن پکڑتے ہوئے بولا۔'' ویسے کون ہے وہ بدنصیب۔'' اس نے مجھے چھیڑا۔

''اس کا تو مجھے پتا نہیں کہ وہ بدنصیب ہے۔ ہاں مگر میں بڑا خوش نصیب ہوں۔'' میں سرشاری سے بولا۔

''پھوٹے گا بھی منہ سے یا نہیں۔ جلدی بتا کون ہے وہ۔'' اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''بوجھو تو جانیں۔'' میں مزے سے گنگنایا۔

''تیری ماسی شبیراں کی سنگی دھی لاڈو یا علاقے کی بھنگن بسنتی کی کلو۔'' اس نے مجھے چھیڑا تو میں نے اسے دھب رسید کی۔

”نہ میرے یار نہ۔ نہ بشیراں کی لاڈو نہ بسنتی کی کلو بلکہ خالہ کی مناہل۔“ میں بغیر چڑے بولا تو وہ خوش ہوگیا۔ مگر ٹریٹ بہر حال اُسے ہی دینی پڑی۔ کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا بلکہ اپنی بتائی چیزوں میں مزید اضافے کے ساتھ۔

☆......☆......☆

نوید کی مما کو پتا چلا کہ میرے لیے مناہل کا رشتہ منظور ہو چکا ہے تو انہوں نے بھی اس کے لیے لڑکیاں دیکھنا شروع کر دیں اور اس کے لیے سیما کو پسند کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ دونوں دوستوں کے سر پر سہرا ساتھ بجنا چاہیے۔

اور ہوا بھی یہی، ہم دونوں صرف ڈیڑھ مہینے کے فرق سے کنواروں کی لسٹ سے پروموٹ ہو کر شادی شداؤں کی لسٹ میں شامل ہو گئے۔

سیما بھابی نوید کے گھر کے لیے بڑی اچھی ثابت ہوئیں۔ وہ اچھی بہو، اچھی بیوی اور بھابی تھیں اور ماں بنیں تو ماں بھی بہترین تھیں۔

ہم دونوں کی دوستی ویسے ہی برقرار رہی بلکہ ہماری طرح سیما بھابی اور مناہل کی بھی دوستی ہو گئی۔ ہم دونوں کے ہی گھر والے اس بات سے بے حد خوش تھے۔

شادی کے سال بھر بعد نوید ایک خوبصورت اور صحت مند بیٹے کا باپ بن گیا۔ میں اور مناہل گئے تھے اسے مبارکباد دینے تو اس نے میرے منہ میں گلاب جامن ٹھونستے ہوئے کہا تھا۔

''اب تیرے گھر بیٹی آنا چاہیے اور وہ میرے بیٹے کی دلہن بنے گی۔'' میں نے تو باقاعدہ قہقہہ لگایا مگر مناہل شرما گئی۔

مگر پھر نہ صرف اس سال بلکہ اگلے چار سال تک ہم پیرنٹس کے عہدے پر فائز نہ ہو سکے۔ حالانکہ ہم ہر لحاظ سے صحت مند تھے۔

☆......☆......☆

اور پھر ماما اور بابا نے حج کا ارادہ باندھا اور ان کا ارادہ دربارِ خدا میں اپنی عرضی پہنچانے کا تھا۔ وہ حج کے لیے گئے۔ ماما حج کے دوران گریں اور سنبھل نہ سکیں۔ اور ان کا انتقال ہو گیا ان کی تدفین وہیں ہوئی۔ بابا گئے ماما کے ساتھ تھے آئے تو اکیلے تھے۔

مگر بابا کے آتے ہی ہم پر انکشاف ہوا کہ خدا کی رحمت ہم پر نازل ہو چکی ہے۔ یعنی ماما کی دعا قبول کر لی گئی ہے۔ خدا نے ان کی دعا رد نہیں کی۔ ان کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی لاج رکھ لی گئی تھی۔ ماما اور بابا میں اتنی محبت تھی کہ وہ ماما کے بعد محض چار ماہ زندہ رہے اور پھر وہ بھی راہی عدم ہوئے۔ میری تینوں بہنیں شادی شدہ تھیں اور ملک سے باہر تھیں۔ یوں گھر میں میں اور مناہل رہ گئے۔

اور ماما کے انتقال کے پورے نو ماہ بعد ہمارے گھر میں ایک صحت مند گول مٹول خوبصورت بچی نے جنم لیا۔ میری بیٹی نوید کے ساحر سے پورے پانچ سال چھوٹی تھی۔ اور میرے گھر سے زیادہ اُس کے گھر میں خوشیاں منائی گئی تھیں کہ اس کی بہو آ گئی ہے۔ اس وقت تک نوید مزید دو بچوں مائز اور مائزہ کا باپ بن چکا تھا۔ میری بیٹی کا نام ساحرہ بھی اس ہی نے رکھا تھا۔ ساحرہ کی پیدائش کے بعد مناہل مسلسل بیمار رہنے لگی۔ اور ساحرہ کے دو سال بعد قدرت ایک بار پھر ہم پر مہربان ہو گئی۔ اس بار مناہل کی طبیعت اتنی بگڑ جاتی تھی کہ اسے مہینے میں ایک آدھ بار Hospitalize کرنا پڑتا تھا۔ حالانکہ دوائیاں اور پرہیز سب برابر تھے۔ اس کی ڈیوڈیٹ سے تقریباً دو ہفتے پہلے اچانک اس کا بی پی ہائی ہو گیا۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اس نے مجھے موبائل پر اطلاع دی۔ مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔ جب میں آیا تو وہ بے ہوش پڑی تھی۔ میرے پاس اس کی طبیعت کے پیش نظر گھر کی ڈپلیکیٹ چابی تھی۔ میں اُسے لے کر ہاسپٹل پہنچا ڈاکٹرز نے سر توڑ کوشش کی مگر نہ وہ مناہل کو بچا سکے نہ میرے بچے کو۔

☆......☆......☆

مناہل کیا گئی میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا اتنی چھوٹی بچی کا ساتھ...... میں کیا کروں؟ گھر داری اور آفس میں کس طرح بیچ کر رہا تھا یہ میں جانتا تھا یا میرا خدا۔

روزانہ ساحرہ کو تیار کروا کر اسکول بھیجنا، ساتھ ناشتا اور اس کا لنچ تیار کرنا۔ واپسی پر وہ اپنی نانی کے گھر اترتی تھی۔ شام آفس سے واپسی پر میں اُسے پک کرتا تھا۔ پھر گھر آ کر کھانے وغیرہ کی تیاری۔ ہفتے اتوار کو واشنگ مشین اور گھر کی صفائی۔ اس سلسلے میں سیما بھابی نے بھی میری کافی مدد کی، اکثر آ کر کپڑے دھو دیتیں اور صفائی کر جاتیں، کئی کھانے بنا کر فریز کر جاتیں مگر یہ کوئی مستقل حل تو نہیں تھا۔ میں گھن چکر بن چکا تھا اس گھر داری میں۔

اور ایسے میں سب کے دوسری شادی کے دل جلا دینے والے مشورے۔ مناہل سے میں نے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ مجھے اس کے سوا اور کوئی نہیں چاہیے تھا۔ اور میں حالات سے ہار ماننے کو تیار بھی نہیں تھا۔ مگر پھر حالات ایسے ہو گئے کہ میں کڑوا گھونٹ پینے پر مجبور ہو گیا۔

میں روز جب ساحرہ کو گھر لاتا تو وہ ضد کرتی کہ اب وہ نانی کے گھر نہیں جائے گی اور دوسرے خالہ بھی مجھے دبے الفاظ میں کہنے لگی تھیں کہ ساحرہ کو یہاں نہ بھیجا کرو۔" اور جب میں نے استفسار کیا تو وہ پھٹ پڑیں۔

"بیٹا! یہ گھر اب ہمارا نہیں ہمارے بیٹوں اور بہوؤں کا ہے۔ اب یہاں ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہم ہی بڈھا بڑھیا ان کی نظروں میں کھٹکتے ہیں تو سوچو ساحرہ کا کیا حال کرتے ہوں گے۔ ان کے بچے اگر ساحرہ کو ماریں، تو سب نظریں چرا لیتے ہیں اور جواباً وہ مارے تو سب اس پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ اس بن ماں کی تین سالہ کم سن بچی کو مارتے ان کے ہاتھ نہیں ٹوٹتے۔ وہ یتیم جس کی آہوں سسکیوں سے آسمان ہل جاتا ہے۔ فرشتے کانپتے ہیں۔ اس یتیم کو مارتی ہیں میری بہوئیں اور مغلظات الگ بکتی ہیں۔ ہم کچھ کہیں تو ہمارے ہی لتے لینے لگتی ہیں۔ بیٹوں کو الگ بھرتی ہیں، وہ فساد الگ۔ اس ظلم سے بہتر ہے تم اس پر سوتیلی ہی سہی ماں لے آؤ۔ کم از کم اپنے گھر میں تو آرام سے رہے گی۔ وہ بولتے بولتے رو دیں اور میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ کم از کم اتنی کم سن بچی پر میں اس قسم کا ظلم تشدد برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

☆......☆......☆

لڑکی مناہل کی بھابیوں نے ڈھونڈی۔ وہ جلد از جلد ساحرہ سے جان چھڑا لینا چاہتی تھیں۔ مگر اب ساحرہ ان کے گھر جانے کے بجائے نوید کے گھر اترتی تھی اور خوش و مگن رہتی تھی۔ اور ان دنوں میرا زیادہ تر وقت نوید کے ساتھ گزرتا تھا۔ میں اس کے پاس اپنا غم غلط کرنے جاتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں مناہل سے بے وفائی کر رہا ہوں مگر اس نے مجھے سمجھایا کہ یہ بے وفائی نہیں ہے۔ عورت تمہارے گھر کی ضرورت ہے۔

بہر حال جلدی جلدی میں چھ ماہ بیت گئے۔

صائمہ پہلے سے طلاق یافتہ تھی۔ شادی کے تین سال تک ماں نہ بننے کے جرم میں اسے اس کے پہلے شوہر نے طلاق دے دی تھی۔

میں پہلے ہی دن سے اس کے فرائض روایتی مردوں کی طرح باور کرانے نہیں بیٹھ گیا۔ نہ ہی میں نے اُسے یہ احساس دلایا کہ وہ اس گھر میں بطور گورنس لائی گئی ہے اور مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس طرح عورت کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اور پھر وہ کتنے ہی اچھے

جذبات کے ساتھ کیوں نہ آئی ہو اس کے اندر نفرت پنپنے لگتی ہے اور وہ انتقامی ہو جاتی ہے۔

میں نے صائمہ اور ساحرہ کی صرف ملاقات کروائی۔ انہیں ایک دوسرے کا رشتہ باور کروایا اور ساحرہ کو نوید اور سیما بھابی کے ساتھ بھیج دیا اور ولیمے کے بعد واپس لایا۔

اس تمام عمل کا بڑا اچھا اثر پڑا۔ صائمہ نے بڑے کھلے دل سے ساحرہ کو قبول کیا۔ اور وہ دونوں دنوں میں گھل مل گئیں۔ میرے اپنے اندر بھی مناہل کی جدائی کا غم کم ہو گیا۔ مرد کو اگر گھر کا سکھ ملے تو ہر چیز بھول جاتا ہے۔ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ ایک سال کہاں گیا پتا ہی نہیں چلا۔

صائمہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ چیک اپ کروانے پر پتا چلا کہ خدا ہم پر ایک بار پھر مہربان ہو گیا ہے۔ صائمہ اور میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔

مگر ساحرہ پر اس کا بالکل الٹ اثر پڑا۔ وہ چڑچڑی ہو گئی۔ بات بات پر ضد کرنے لگی، صائمہ سے بھاگنے لگی۔ اس سے کوئی چیز نہیں لیتی تھی۔ اس سے بدتمیزی کرتی۔ بیڈ روم میں بھی اس ہی کی ضد ہوتی کہ انہیں یہاں سے اٹھائیں۔ حالانکہ اس کا بیڈ روم الگ تھا مگر وہ روزانہ ہمارے بیڈ روم میں سونے کی اور صائمہ کو ہٹانے کی ضد کرتی۔ دنوں میں اس نے ہمیں زچ کر کے رکھ دیا تھا۔ ایسی صورتحال نے ہمیں پریشان کر کے رکھ دیا۔

اور اس صورت حال میں بھی صائمہ کا صبر و برداشت غضب تھا۔ وہ اس کو بہلاتی، مناتی پاس بلاتی تھی۔ مگر وہ انتہائی بدتمیزی کرتی۔

ادھر صائمہ Pregnancy کی علامات سے سفر کر رہی تھی۔ الٹیاں متلی اور کمزوری، چڑچڑا پن۔ مگر وہ اس حالت میں بھی بہت برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

میں نے اُسے زیادہ باہر لے جانا شروع کر دیا۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ گھر سے باہر خوش گھر میں ویسی ناخوش۔ میں نے اُسے اسٹوری بک اور انڈور گیم لا کر دیے مگر بات نہیں بنی۔

اور حسب معمول میں فوراً نوید کے پاس پہنچا۔ اور حسب توقع اس کا پہلا سوال تھا۔

''تُو پریشان ہے۔'' اور میں ٹھنڈی سانس بھر کے اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور پھر میں نے اُسے ساری بات سنائی۔

''میرا خیال ہے وہ اپنی ماں کو مِس کرنے لگی ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''ہاہ! وری فنی!'' جس وقت اس نے اپنی ماں کو کھویا تھا۔ وہ تو محض پونے تین سال کی تھی اور جس نے اُسے ماں کی محبت دی۔ اس نے اُسے ہی ماں سمجھ لیا۔ اور اسی میں شیر و شکر ہو گی۔ لکھ لے کسی چیز پر اگر کسی نے اسے بتایا نہیں ہو گا تو اسے پتا بھی نہیں ہو گا کہ صائمہ اس کی ماں نہیں ہے۔

اس نے کہا۔ تب ہی بھابی کوفی اور اسنیکس لے آئیں۔

''پھر بھی وہ وجہ سمجھ نہیں آ رہی جس نے ساحرہ کو اَن سیو کر دیا ہے۔'' وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''سوچتا ہوں اُسے اس کی نانی کے پاس چھوڑ دوں۔'' میں نے بےزاری سے کہا۔

''یعنی ماں اس سے قدرت نے چھین لی تُو اپنی حرکتوں سے اس سے باپ بھی چھین لے اور تجھے پتا ہے ناں۔ نانی کے ہاں اُس کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے تُو اس کا گلا گھونٹ دے قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔'' وہ غصے اور طنز سے بولا۔ تو سیما بھابی نے بھی اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے کول ڈاؤن کیا۔

''تو پھر کیا کروں یار! صائمہ کی الگ طبیعت خراب ہے۔ وہ اس حالت میں بھی اُس کا خیال رکھتی ہے۔ مگر اس کے نخرے ہی ختم نہیں ہوتے۔'' میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''تُو اک کام کیوں نہیں کرتا؟'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''کیا۔''

''تو صائمہ بھابی کو چیک کیوں نہیں کرتا۔'' وہ بولا۔

''تیرے کہنے کا مطلب ہے کیا صائمہ۔'' میں نے بات درمیان میں ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں میرے کہنے کا مطلب یہی ہے کیونکہ ایک پانچ سالہ بچہ معصوم ہوتا ہے۔ دنیاوی آلائشوں سے پاک وہ وہی ردعمل ظاہر کرتا ہے جیسا اس کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ ورنہ تمہاری شادی کے بعد کا پورا ایک سال تمہارے سامنے ہے۔ اور اُس معصوم کو الہام نہیں ہوا یا خواب نہیں آیا ہے کہ تمہارے گھر کوئی ننھا مہمان آنے والا ہے۔'' اس نے اچھے خاصے میرے دماغ کے کیڑے جھاڑے اور میری سوچ کو بھی نئی راہ دے گیا۔

''کسی کی ماں بننا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ صرف ساحرہ کو ہی نہیں بھابی کو بھی چیک کر میرے یار۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔'' اور میں واپسی پر یہی کچھ سوچتا رہا۔

☆......☆......☆

اگلے ہفتے ہی رات کو ساحرہ نے بہت تنگ کیا۔ اور صبح میں صائمہ کی طبیعت میں کسلمندی اور کمزوری تھی۔ اور اس دن میں نے اپنے پروگرام پر عمل کرنے کا ارادہ بنایا۔ میں نے سب سے پہلے صائمہ کو اٹھنے سے منع کیا۔ پھر ناشتا بنا کر ساحرہ کو تیار کروا کر ناشتا کروا کر اسکول روانہ کیا۔ پھر اپنا اور صائمہ کا ناشتا لے کر روم میں آ گیا اور اُس کے ساتھ مل کر ناشتہ کیا تب اس نے بڑے ناز سے پوچھا۔

''کیا چھٹی کا ارادہ ہے؟'' اور میں نے شرارت سے کہا۔

''چھٹی کا کیا فائدہ تم تو بیمار ہو؟'' اور وہ شرما گئی۔ دھنک کے ساتوں رنگ اُس کے چہرے پر بکھر گئے۔

پھر میں نے تیار ہو کر باہر نکلتے وقت اس کے ماتھے پر پیار کیا اور اس سے کہا۔

اٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آرام کرنا۔ دوپہر میں فریج سے نکال کر کھا لینا۔ رات کو میں لیتا آؤں گا۔''

''اوکے باس!'' وہ طمانیت سے مسکرا دی۔

گھر سے باہر آ کر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور بند کر دی پھر موبائل نکالا اور آفس فون کر کے آج آنے سے معذرت کی۔ پھر گاڑی سے اتر کر ہی گھر کے اندر آیا دروازہ میں نے پہلے سے ہی کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ دروازہ آہستگی سے بند کر کے ڈرائنگ روم والے دروازے سے اندر داخل ہو گیا جو میں نے صبح ہی کھولا تھا اب دروزاہ بند کر کے میں نے موبائل نکالا اور صائمہ کا نمبر پریس کیا اس نے فوراً ریسیو کر لیا۔

''صائمہ جان! میں گاڑی چھوڑ کر جا رہا ہوں کچھ مسئلہ کر رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے Take Care Bye

اس نے کہا اور میں نے فون بند کر دیا۔

ہمارے ٹی وی لاؤنج اور ڈرائنگ روم کے درمیان میں سلائیڈنگ گلاس ڈور تھا۔ اور لاؤنج میں ہی اوپن کاؤنٹر کچن تھا۔ گلاس ڈور بند تھا۔ میں نے ڈور کو آہستگی سے آگے کھسکا دیا کہ باہر سے اندازہ نہ

ہوا اور گلاس ڈور پر پڑا پردہ معمولی سا ہٹا دیا۔
اب صورتحال یہ تھی کہ ڈرائنگ روم میں اندھیرا ہونے کے باعث لاؤنج سے ڈرائنگ روم نظر نہیں آتا تھا۔ مگر ڈرائنگ روم سے لاؤنج بخوبی نظر آتا تھا۔
تقریباً وہاں بیٹھے ہوئے مجھے دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ صائمہ بالکل فریش اندر سے نکل کر باہر آئی۔ اس وقت اس کی تھکن جس کا صبح وہ پرچار کر رہی تھی۔ نام ونشان بھی نہیں تھا۔ بلکہ وہ باقاعدہ ایک مشہور سونگ گنگنا رہی تھی۔ اس نے باہر سے آکر فریج سے جوس نکالا، کچن میں جا کر انڈہ فرائی کیا۔ بریڈ اور ماجرین لیا اور ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر ناشتا کرنے لگی حالانکہ ابھی میرے سامنے اس نے بڑے نخروں سے اس نے ایک سلائس اور بوائل انڈہ لیا تھا۔ اور اب بڑی رغبت سے بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔ میرے سامنے ہی اس نے جوس کے دو گلاس بھر کر پیے۔ اور ایک گلاس اس کے سامنے فورٹ ملک کا رکھا ہوا تھا۔ مجھے تکلیف ہوئی۔
اس لیے نہیں کہ وہ کھا رہی تھی۔ اچھا اور زیادہ کھانا اس وقت اس کی ضرورت تھا۔ تکلیف مجھے یہ ہوئی کہ وہ ہمیشہ میرے سامنے کم کھاتی تھی اور شکایت کرتی تھی کہ اس سے کھایا پیا نہیں جاتا۔ اسے متلی ہونے لگتی ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر کہتی تھیں۔ کھایا ضرور کرو چاہے Vomit Out ہو جائے مگر وہ مانتی ہی نہیں تھی۔ مگر یہ ہر بار اس کا اور بے بی کا وزن ٹھیک ہی ہوتا تھا۔ اس پر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ سو آج وہ بھی ختم ہو گئی۔
میں جوس پینے کو کہتا تو وہ بے چارہ سا منہ بنا کر کہتی کہ وہ تو ساحرہ چھوڑتی ہی نہیں اور دودھ بقول اس کے اس کا تو ذائقہ ہی برا لگتا ہے۔ اب نہ کسی چیز کا ذائقہ برا تھا نہ Vomiting کی شکایت
تھی۔ نہ جوس کی کمی تھی۔ ناشتے سے بھرپور انصاف کرنے کے بعد اس نے فون سنبھال لیا۔
سلام ودعا کے بعد حال احوال دریافت ہوئی پھر وہ دوسری طرف کی باتیں سننے لگی۔
اور پھر بولی تو لہجہ بڑا زہریلا تھا۔
''اس کی بادشاہت بس اس کے باپ کے سامنے تک کی ہے۔ ان کے پیچھے میں اس کو اوقات پر رکھتی ہوں۔'' اور مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کس کے لیے بات کر رہی ہے۔
''ہاں مما! آپ فکر مت کریں اُس کی چند گھنٹے کی بادشاہت کا بھی خاتمہ ہونے والا ہے۔ الٹرا ساؤنڈ سے پتا چلا ہے کہ بیٹا ہے مگر میں نے شہری کو ابھی بتایا نہیں ہے جب اس کی گود میں بیٹا آئے گا تو وہ انہیں یاد بھی نہیں رہے گا کہ کسی منا ہل نے ساحرہ کو جنم دیا تھا۔'' وہ نفرت سے بولی۔
''ارے مام! اس کی تو آپ فکر مت کریں۔ ڈائٹ کا تو میں خود خیال رکھتی ہوں۔ ہر چیز کا ڈھیر لگا رکھتے ہیں شہری۔ دودھ، جوس، پھل، انڈے، مچھلی، چکن، مکھن، اسنیکس، اور فروزن آئٹم ہر چیز وقت پر دستیاب ہوتی ہے۔ اب اُس کے لہجے میں شہد ٹپک رہا تھا۔
''کوئی بے وقوف سمجھا ہے مام! بالکل اندازہ نہیں ہونے دیتی کہ میں کھاتی ہوں۔ سب ماسی اور ساحرہ کے کھاتے میں ڈال دیتی ہوں۔ ان کے سامنے کم کھاتی ہوں اور بھوک نہ لگنے کی شکایت کرتی رہتی ہوں۔ وہ تو خود فکر مند ہوتے ہیں میرے ٹھیک طرح سے ڈائٹ نہ لینے پر۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسی۔
''ہاں مما! بتایا ہے ناں کوئی مسئلہ نہیں ہے ماسی سارا کام کرتی ہے موڈ ہو تو کچھ پکا لیتی ہوں ورنہ باہر سے آجاتا ہے اور میں آرام کرتی ہوں اور اس مہارانی کے دماغ کے کیڑے جھاڑتی ہوں۔'' وہ

بڑے مزے لے کر بولی۔

"کہاں مام! یہی تو کمال ہے آپ کی بیٹی شہری کے سامنے بھی مظلوم اور وہ بدتمیز، ضدی اور گستاخ ہے۔"

وہ گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"پتا نہیں مام! میرے سامنے تو یاد نہیں کرتے بلکہ میرے ہی ممنون رہتے ہیں کہ میں نے ان کا گھر اور بیٹی کو بڑا سنبھالا ہوا ہے۔ اور مام اگر یاد بھی آتی ہو گی تو بیٹا گود میں آتے ہی سب بھول جائیں گے۔ اچھا مام اب بند کرتی ہوں۔ جا کر آرام کروں گی۔ اس نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

ایک اور منافقت اگر وہ میرے اصرار پر کچھ کھا لیتی تو پھر لیٹتی نہیں تھی۔ پھر اُسے Walk پر لے جانا پڑتا تھا جبکہ وہی Vomiting حالانکہ میری امی Pregnancy میں Night Walk کو ناپسند کرتی تھیں۔ یہ پابندیاں میری بہنوں پر تھیں۔ وہ تینوں جب تک پاکستان میں تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ رات شیاطین کی ہوتی ہے۔ اور شیاطین معصوم بچوں پر اپنا تسلط جما لیتے ہیں مگر میں صائمہ کی طبیعت سے مجبور تھا۔

اور پھر وہ گنگناتی ہوئی بیڈ روم میں چلی گئی۔

تقریباً گیارہ بجے کے قریب ماسی آئی اور پورے گھر کی صفائی کر دی۔ ڈرائنگ روم کی جھاڑ پونچھ ہفتے میں صرف ایک بار ہوتی تھی یا اگر کوئی مہمان آتا تھا تو اس دن صفائی ہوتی تھی۔ اور یہ دونوں ممکنات نہیں ہوئے تھے۔ سو ڈرائنگ روم ماسی سے محفوظ رہا۔ ماسی نے برتن دھوئے، مشین ہفتے میں ایک بار ماسی ہی لگا جاتی تھی مگر آج وہ دن نہیں تھا۔ پھر اُس نے کپڑے استری کیے اور چلی گئی۔ میں نے صائمہ کی طبیعت کے پیش نظر ہر کام کے لیے ماسی سے کہا ہوا تھا۔

ماسی کے جانے کے بعد اس نے ایک پلیٹ میں فروٹس نکالے اور کمرے میں لے گئی۔ پھر ایک بجے باہر آئی تو اس بار اس نے اسنیکس نکالے اور ساتھ میں ہی جوس گلاس میں ڈالا اور اندر لے گئی۔

دو بجے دروازے کی بیل ہونے لگی۔ بیل ہر منٹ بعد تواتر سے ہو رہی تھی۔ اور صائمہ جان بوجھ کر آہستہ آہستہ ٹہلتی جا رہی تھی۔ اس پھرتی کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ جو صبح سے اس میں بھری ہوئی تھی۔ آخر اس نے دروازہ کھولا۔

"تمہارے باپ کی نوکر نہیں جو سارا دن ہی تمہارے انتظار میں دروازے سے چپکی کھڑی ہوتی ہوں۔ چھری تلے دم لیا کرو۔" وہ دروازے سے ہی اس پر چنگھاڑی۔

"بیل میں نہیں وین والے انکل بجاتے ہیں۔ یہ ان کی ڈیوٹی ہے کہ ہر بچے کو بحفاظت چھوڑ دیں۔" اس نے غالباً وین والے انکل کے الفاظ دہرائے۔

"اچھا اچھا مجھے زیادہ سبق نہ پڑھاؤ۔ کپڑے بدلو اور کپڑے اور بیگ جگہ پر رکھنا۔" اس کا انداز حکمیہ تھا۔ وہ نرمی اور پیار جس کا وہ میرے سامنے پرچار کرتی تھی مفقود تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ساحرہ فریش ہو کر آ گئی۔ اس وقت صائمہ ٹی وی کھولے کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی سامنے فلیورڈ ملک رکھا ہوا تھا۔

"ماما! کھانا دے دیں۔" وہ آہستگی سے بولی اس وقت ساحرہ کا بھی انداز بدلا ہوا تھا۔ بڑی بے چارگی تھی اس کے لہجے میں ڈری ہوئی سہمی ہوئی۔

"فریج میں کریلے اور روٹی رکھی ہے۔ مائیکرو ویو میں گرم کر کے کھا لو۔" وہ بغیر اس کی جانب متوجہ ہوئے بولی۔

"ماما! آپ کو پتا ہے۔ مجھے کریلے پسند نہیں ہیں ان کا Bitter Taste ہوتا ہے۔ مجھے اچھا

نہیں لگتا۔'' وہ منمنائی۔

''نہیں پسند تو کیا کروں کھانا تو تمہیں وہی پڑیں گے۔ اگر نہیں کھانا تو ایسے ہی سو جاؤ۔'' میرا دل چاہا اس منافق عورت کا چہرہ نوچ لوں۔ جو کل میری بچی کو کریلے نہ کھانے پر آملیٹ، میگی، اسپیگٹی، یا پھر میکرونی بنا کر دینے کی آفر کر رہی تھی۔

''ماما! مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ مجھے نیند نہیں آئے گی۔'' وہ پھر منمنائی۔

''بھوک لگ رہی ہے تو کریلے کھاؤ۔'' اور استہزائیہ ہنسی اور وہ معصوم فریج کی جانب بڑھی پھر کچھ سوچ کر پلٹی۔

''ماما مجھے بریڈ پر جام لگا دیں اور جوس یا ملک دے دیں۔'' وہ ذرا جوش سے بولی۔

''بریڈ تو ختم ہوگئی اور جوس اور ملک تو میرے لیے آتا ہے۔'' اس نے انتہائی سنگدلی سے کہا۔

''ماما! تھوڑا سا دے دیں۔'' اس نے بڑی بے چارگی سے کہا۔

''قطعی نہیں۔'' وہ اسی انداز میں بولی۔

''ماما! میں آپ کی شکایت بابا سے کروں گی۔'' وہ غصے سے بولی۔

''اچھا یہ بھی کر کے دیکھ لو۔'' وہ استہزائیہ ہنسی اور پھر غصے سے پلٹی۔

''یو بچ! تُو میری شکایت اپنے باپ سے کرے گی۔ اس نے ساحرہ کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے اور اس کے گالوں پر دو زوردار تھپڑ مارے اور بس میری برداشت سے باہر ہوگیا اور میں ڈور کھسکا کر باہر نکل آیا اور مجھے دیکھتے ہی صائمہ کا چہرہ فق ہوگیا جبکہ ساحرہ روتی ہوئی آ کر میرے پاؤں سے لپٹ گئی۔

میں نے صائمہ کو دیکھ کر تاسف سے سر ہلایا۔

''آج تم نے اپنا اعتبار ساری زندگی کے لیے کھو دیا ہے۔ میں نے تمہیں کتنا اعتبار اور کتنا مان دیا میں اپنی ہی معصوم بچی کو بدتمیز، ضدی اور ندیدی گردانتا رہا مگر میں نے تم پر شک نہیں کیا اور تم دن رات میرے اعتبار اور مان کا خون کرتی رہیں۔ مجھے میری بچی سے متنفر کرتی رہیں۔ جب تک تم یہ سمجھتی رہیں کہ تم بانجھ ہو تم اپنی محبتیں میری بچی پر نچھاور کرتی رہیں۔ جیسے ہی تمہاری گود بھری تم نے اُسے دھتکار دیا۔ صائمہ میرے سامنے سے چلی جاؤ۔ ورنہ کچھ برا ہو جائے گا۔'' میں نے کہا تو وہ اندر کمرے میں چلی گئی۔ صفائی دینے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے ساحرہ کو گود میں اٹھا کر اس کو پیار کیا اور اُس کا آنسوؤں سے تر چہرہ صاف کیا اور اوپر فریزر سے فروزن پراٹھے نکال کر توے پر ڈال کر سینکے اور ایک پر آملیٹ اور ایک پر چکن اسپریڈ لگایا۔ فریج سے جوس نکال کر گلاس میں ڈالا تو وہ جلدی کھانے لگی۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بہت بھوکی تھی۔ اب ہر شام اس کی چڑچڑاہٹ اور چیزوں کے لیے ضد میری سمجھ میں آ گئی۔ اُسے بھوکا رکھ کر اُس کا ندیدا پن ثابت کیا جا رہا تھا۔

''آپ اسکول سے آ کر کھانا نہیں کھاتیں۔'' میں نے آہستگی سے اُس کے بالوں کو سہلایا۔

''ماما! دیتی ہی نہیں ہیں۔ بابا مجھے جوس اور ملک اچھا لگتا ہے۔ اور ماما تو وہ بالکل ہی نہیں دیتی ہیں۔'' وہ معصومیت سے بولی اور مجھے اس پر اس طرح پیار آ گیا۔ اس کے دونوں گال تھپڑوں کی وجہ سے سرخ تھے۔ یہ میری مناہل کی زندہ نشانی تھی۔ میں اس سے کیسے غافل ہوگیا۔

کھانا کھاتے ہی اُس پر نیند غلبہ پانے لگی۔ میں نے اسے اس کے روم میں لے جا کر لٹا دیا۔ اور خود اپنے کمرے میں آ گیا۔ صائمہ رونے میں

مصروف تھی۔ مگر میں اُسے نظر انداز کر کے بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ فوراً میرے پاس آ گئی۔

''سنیے! مجھے معاف کر دیں۔ میں بھٹک گئی تھی۔ اب آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''شکایت کا موقع جب نہیں دیں گی۔ جب میں آپ کو یہ موقع دوں گا۔ اینڈ صائمہ! پلیز اس وقت میں کچھ سننے کے موڈ میں نہیں ہوں اور اگر کچھ برا نہیں چاہتیں تو پلیز اس وقت بالکل خاموش ہو جاؤ۔ ورنہ شاید کچھ برا ہو جائے گا۔'' میں نے چڑ کر کہا تو غالباً اسے بھی حالات کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔ سو وہ خاموش ہو کر میرے برابر میں ہی لیٹ گئی۔ گو اب بھی وہ رو رہی تھی مگر مجھے اس کے رونے کی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ ہاں ساحرہ کے سرخ گال تصور میں آ آ کر اب بھی مضطرب کر رہے تھے۔

☆......☆......☆

شام میں اٹھ کر میں نے ساحرہ کو تیار کرایا اور اُسے لے کر میں نوید کے گھر آ گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''یعنی میرا اندازہ درست تھا۔'' اور میں نے ٹھنڈی سانس بھر کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔

''پھر آگے کیا سوچا ہے؟'' اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''نوید مجھے اتنا غصہ ہے کہ دل چاہ رہا ہے کہ اُسے طلاق دے کر ابھی فارغ کر دوں۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''ایک غلطی تو پہلے کرتا رہا ہے بھابی پر نظر نہ رکھ کر۔ اور ایک اب کرنے کی سوچ رہا ہے۔ بے وقوف! وہ تیرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ تُو اپنے بچے کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی بے گھر کرنا چاہتا ہے۔ یہ اس بچے کے ساتھ نا انصافی

غزل

اپنے ہو جاتے ہیں بدذات تو دکھ ہوتا ہے
جب دِکھاتے ہیں وہ اوقات تو دکھ ہوتا ہے

جب وہ دیتا ہے مجھے مات تو دکھ ہوتا ہے
پھر تڑپتی ہے میری ذات تو دکھ ہوتا ہے

وہ تو اپنوں کا نہیں اور کسی کا کیا ہو
جب بھی سوچوں میں یہ بات تو دکھ ہوتا ہے

اس کا مقصد ہے فقط دل ہی دکھانا میرا
جی جلانے کی کرے بات تو دکھ ہوتا ہے

میرے محبوب کے ہاتھوں میں تھا ہاتھ میرا
یاد آئیں وہ لمحات تو دکھ ہوتا ہے

میں نے سمجھا تھا فقط میرا رہے گا بن کر
دل نے کھائی ہے بڑی مات تو دکھ ہوتا ہے

شادمانی میں گزرتے ہیں ترے شام و سحر
میرے بے رنگ سے ہوں دن رات تو دکھ ہوتا ہے

بعد مدت اُسے سوچیں تو ہنسی آتی ہے
ترکِ اُلفت کی شروعات تو دکھ ہوتا ہے

اپنے اسلاف کو سدا دل میں بسایا میں نے
ختم ہوتی ہیں روایات تو دکھ ہوتا ہے

جب بڑے شوق سے بیٹھ کے لکھتے ہوں غزل
اور بکھر جائیں خیالات تو دکھ ہوتا ہے

جدائی کا غم بھی شگفتہ ہے مگر اِس سے سوا
بے وجہ ہوں جو شکایات تو دکھ ہوتا ہے

شاعرہ: شگفتہ شفیق

ہے۔''اس نے مجھے سمجھایا۔

''تو پھر کیا کروں؟ کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا۔ کیا ہر وقت ساحرہ کو اپنے ساتھ لیے پھروں۔ وہ عورت تو اب قابل اعتبار نہیں ہے۔''میں نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں۔

''تو ایسا کر ساحرہ کو ہمیں دے دے آخر کو بڑے ہو کر تو اسے یہیں آنا ہے۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

''تُو نے خود ہی تو اس دن کہا تھا کہ ماں قدرت نے اس سے چھین لی اور باپ میں چھین لوں گا۔''میں نے اُسے اسی کی بات یاد دلائی۔

''تو پھر کیا کرے گا؟''اس نے سوال کیا۔

''کچھ نہ کچھ تو ضرور کروں گا۔ مگر یہ طے ہے کہ صائمہ کو سزا ضرور دوں گا۔ وہ صرف اگر سوتیلی ماں بن کر میری بچی کے ساتھ ایسا سلوک کرتی تو قابل قبول ہوتا۔ مگر اس نے تو مجھ سے سیاست کھیلی ہے۔ میری بچی کے ساتھ بھی برا سلوک کرتی تھی۔ اور اُسے میری نظر میں بُرا بنا رہی تھی۔ میری بچی دہرے عذاب سے گزر رہی تھی۔ وہ مجھے بتا نہیں پا رہی تھی کہ وہ کس عذاب میں گرفتار ہے۔ وہ اپنی فیلنگز مجھ سے شیئر نہیں کر پا رہی تھی کہ میرے سامنے محبت کا ڈھونگ رچانے والی عورت میرے پیچھے کیا کرتی ہے۔ تمہیں پتا ہے آج دوپہر کا کھانا مانگنے پر اس ظالم عورت نے میری کم سن بچی کے بال پکڑ کر اسے تھپڑ مارے۔ جس کا کچن اور فریج چیزوں سے بھرا ہو، اس کی بچی دوپہر کے کھانے کو ترسے۔ مناہل کی روح کیسے تڑپتی ہوگی۔ وہ تو عالم ارواح میں بھی بے چین ہوگی۔ یہ سلوک تھا اس کا میری بچی کے ساتھ۔''میں آزردگی سے بولتا چلا گیا۔

''بہرحال جو بھی کرنا سوچ سمجھ کر کرنا اور مجھے ضرور آگاہ کرنا''اس نے نصیحت کی اور میں نے سر ہلایا اور پھر میں ساحرہ کو لے کر واپس آ گیا۔

☆......☆......☆

میں کافی دن تک اس مسئلے پر سوچتا رہا اور آخر کار ایک حل میری سمجھ میں آ گیا اور میں نے اس پر عمل کر ڈالا۔

اب صائمہ کے علاوہ بھی میری ایک اور بیوی ہے اور بچپن کے ہونے والے کسی حادثے کے باعث بانجھ ہوگئی۔ اس کی اٹھارہ سال کی عمر میں شادی ہوگئی۔ جو کہ 23 سال کی عمر میں ختم ہوگئی۔ وجہ یہی اس کا بانجھ ہونا تھا۔ ہادیہ صائمہ سے زیادہ کم عمر ہے اور زیادہ خوبصورت بھی اور سب سے بڑھ کر وہ ساحرہ کو دل و جان سے چاہتی ہے۔ وہ سائے کی طرح اُس کی حفاظت کرتی ہے۔ کیونکہ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ سو وہ اپنی پیاسی ممتا کو ساحرہ کے وجود سے سیراب کرتی ہے۔

اور دوسری طرف صائمہ ہے۔ جو بیٹے کو گود میں لے کر بھی اپنے زخموں کو چاٹتی ہے۔ مجھے ساحرہ آج بھی نوفل سے زیادہ عزیز ہے۔ سو میرا زیادہ وقت ہادیہ کے ساتھ گزرتا ہے۔ لیکن میں ناانصافی کسی کے ساتھ نہیں کرتا۔ میرے وقت کی تقسیم عموماً برابر ہوتی ہے۔ مگر یہ بیٹیاں پتا نہیں کیوں اتنی پیاری ہوتی ہیں سب توجہ، سارا پیار سمیٹ لیتی ہیں۔ میرا زیادہ وقت جو ہادیہ کی طرف گزرتا ہے وہ ہادیہ کے ساتھ نہیں ساحرہ کے ساتھ گزرتا ہے۔ ساحرہ جو مناہل کا پرتو ہے۔ اور مناہل جو مجھے آج بھی صائمہ اور ہادیہ سے زیادہ عزیز ہے۔ اور میرا جو وقت ساحرہ کے ساتھ گزرتا ہے وہ صائمہ کو کھلتا ہے۔ کیونکہ وہ ہادیہ کی طرف گزرتا ہے مگر اب وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی ہے۔

تو یہ تھی صائمہ کے لیے سزا۔ اب فیصلہ آپ کریں۔ کہیں یہ سزا زیادہ تو نہیں ہوگئی!

☆......☆......☆

افسانہ

اک بار کہو!

''جاوید یہ بہت ندیدے لوگ ہیں۔ جب دیکھو منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ اور آتے بھی ٹھیک کھانے کے وقت ہیں۔'' اس بار وہ اپنے شوہر سے الجھ گئیں۔ ''ہمارے رشتے دار ہیں اب کیا کر سکتے ہیں۔'' جاوید نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔ ''عبیرہ! آج......

محبت کی آگہی سے جڑا ایک بہت خاص افسانہ
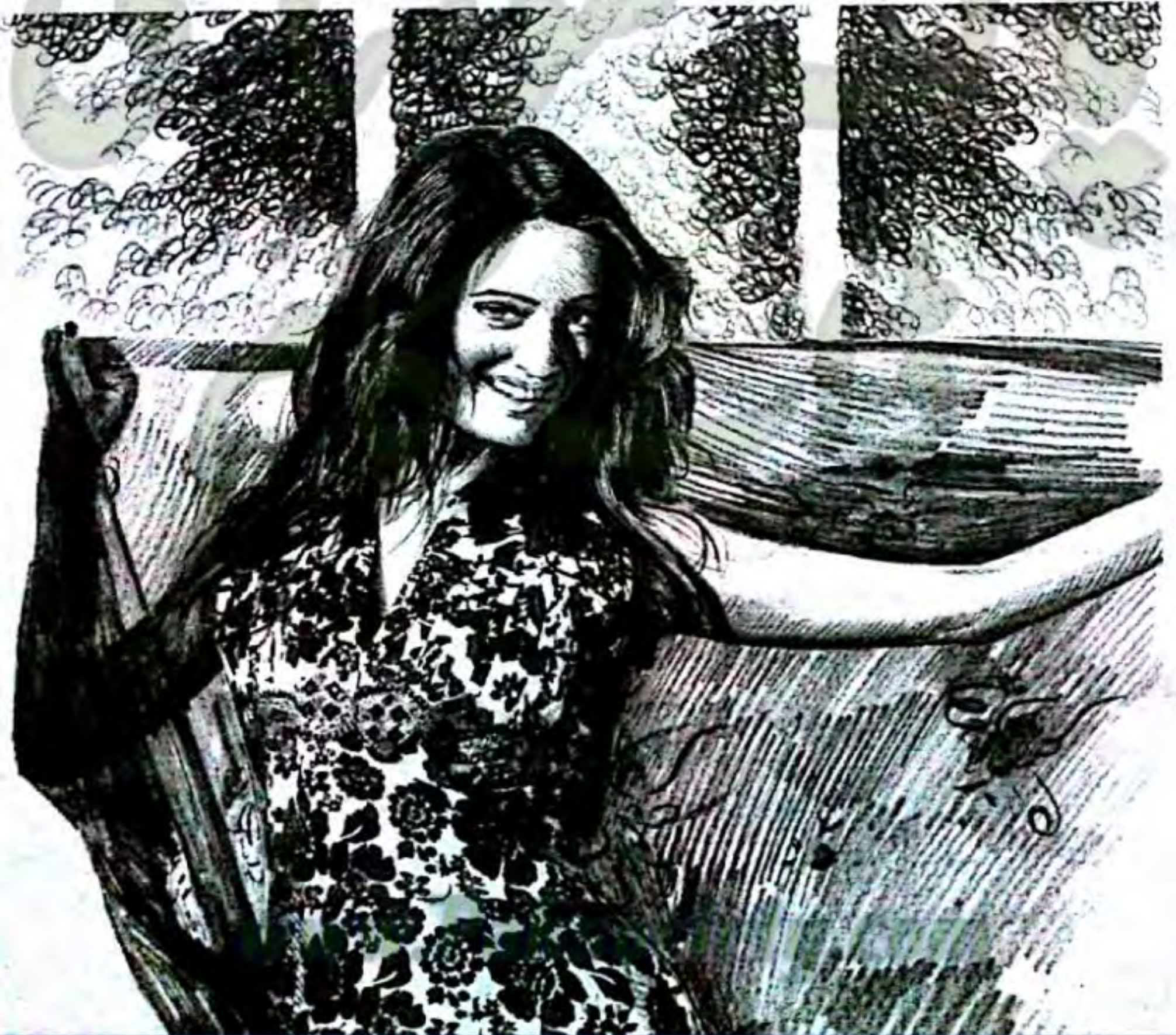
اُس نے مجھے اس موڑ پر چھوڑنا چاہا
جہاں محبتوں کا تاوان نہیں لیا جاتا
جہاں اذیتوں کا حساب نہیں لیا جاتا
جہاں خاموشی اک آزار ہوتی ہے
جہاں خواہشوں کا دستور نہیں ہوتا
جہاں عشق ذاتوں کا مکین نہیں ہوتا

خالہ کا فون آیا تھا۔ دانش نے عبیرہ سے منگنی کر دی ہے۔ عبیرہ کا دل اور اُس کا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ عزت، وقار، انا سب کی دھجیاں بکھر گئی تھیں۔ اُسے شدت سے کچھ کھونے کا احساس ہو رہا تھا۔ دانش نے اسے بے مول کر دیا تھا۔ کتنی بے دردی سے اپنے سارے وعدے بھلا دیے تھے۔

عبیرہ میں اتنی ہمت بھی نہیں ہوئی کہ خالہ سے وجہ پوچھ سکتی۔ دانش نے تو عرصہ ہوا اس سے فون پر بات بھی کرنی چھوڑ دی تھی۔ جسے وہ اُس کی مصروفیات سمجھتی رہی۔ جانتی تھی کہ اب بھی وہ اُسے اپنی بے وفائی کا کوئی جواز نہیں دے گا۔

دانش سے اُس کی منگنی میٹرک کلاس میں دانش کی شدید خواہش پر ہوئی تھی۔ دانش اُس کا خالہ زاد تھا۔ انسیت عبیرہ کو اس سے بچپن سے ہی تھی۔ یہ انسیت منگنی کے بعد شدید محبت میں بدل گئی۔ اب اس کے تمام خواب دانش سے وابستہ تھے۔

حالانکہ دانش ہر لحاظ سے ایک عام سا نوجوان تھا۔ ایف ایس سی کے بعد وہ ایک ہاسپٹل میں میل نرس کی جاب کر رہا تھا۔ شکل صورت تو خیر معمولی تھی ہی۔ اسٹیٹس بھی بہت کم تھا۔ اس کے ابا کسی دفتر میں کلرک تھے۔ وہ لوگ کورنگی میں دو کمروں کے اپنے ذاتی مکان میں رہتے تھے۔

جبکہ عبیرہ ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بہت دلکش اور نازک سراپا رکھتی تھی۔ پڑھائی میں بھی بہت ذہین تھی۔ سیرت اور عادات واطوار بہترین، سچی بات تو یہ تھی کہ اگر عبیرہ کی امی زندہ ہوتیں تو وہ کبھی یہ رشتہ نہ کرتیں، بے شک ان کی سگی بہن ناراض ہو جاتی۔ لیکن عبیرہ محض چار برس کی تھی۔ جب وہ انتقال کر گئیں۔ عبیرہ کے والد نے فوزیہ بیگم سے دوسری شادی کر لی۔ جو عبیرہ کے لیے روایتی سوتیلی ماں ثابت ہوئی۔ جلد ہی ان کے ہاں سامعہ اور پھر راحیل کی پیدائش ہوئی۔ ابو کی بھی ساری توجہ اپنی بیگم اور چھوٹے بچوں پہ تھیں۔

عبیرہ کو فوزیہ بیگم نے بہت چھوٹی عمر میں ہی گھر کے کام پر لگا دیا تھا۔ میٹرک کے بعد ہی عبیرہ امور خانہ داری میں طاق ہو گئی۔ اب تمام گھر کی ذمہ داری عبیرہ پہ ڈال کر وہ فراغت سے زیادہ وقت میکے یا بازاروں میں گزارنا پسند کرتیں۔

ان حالات میں دانش کی عبیرہ کے لیے جنون خیزی، اس کی محبت کی شدت، والہانہ پن اور عبیرہ کی چھوٹی چھوٹی سی تکلیف پر بے قرار ہو جانا عبیرہ جیسی محبت سے محروم لڑکی کے لیے جیسے چلچلاتی دھوپ میں ایک ٹھنڈے گھنے سائے کی مانند تھی۔ اس کے لیے دانش کی محبت کے سامنے اُس کی شکل وصورت اور اسٹیٹس کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔

☆......☆......☆

منگنی کے بعد خالہ کی فیملی کا اکثر ان کے گھر آنا جانا رہنے لگا تھا۔ جو فوزیہ بیگم کو بہت ناگوار گزرتا اور ان کا موڈ آف ہو جاتا۔

''جاوید یہ بہت ندیدے لوگ ہیں۔ جب دیکھو منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ اور آتے بھی ٹھیک کھانے کے وقت ہیں۔'' اس بار وہ اپنے شوہر سے الجھ گئیں۔

''ہمارے رشتے دار ہیں اب کیا کر سکتے ہیں۔'' جاوید نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

''عبیرہ! آج کے بعد انہیں کھانا کھلانے کی ضرورت نہیں۔ چائے پلا دیا کرو۔'' فوزیہ بیگم نے حکم دیا۔

''جی امی!'' عبیرہ کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

کچھ دن بعد اتوار والے دن سب پھر موجود تھے۔فوزیہ بیگم مروت میں ان کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

عبیرہ چائے کے ساتھ سموسے، نمکو، گلاب جامن لے آئی۔

جسے دیکھ کر فوزیہ بیگم کا موڈ خراب نظر آنے لگا۔ چہرے پر تناؤ سب ہی کو محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ سر درد کا بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ گئیں۔

جاوید صاحب نے بھی ان کی تقلید کی۔ عبیرہ شرمندہ سی نظر آنے لگی۔ ان کے جانے کے بعد فوزیہ بیگم باہر آ گئیں۔

''عبیرہ تم نے بہت سر پر چڑھا لیا ہے ان لوگوں کو اور پھر کنجوس ایسے کہ یوں ہی خالی ہاتھ چلے آتے ہیں۔''

''ٹھیک کہا تم نے۔'' جاوید بولے۔

''اس مہنگائی میں، میں یہ افورڈ نہیں کر سکتی، میں بہت دیکھ بھال کے خرچ کرنے کے عادی ہوں۔''

عبیرہ کی نگاہوں میں اُن کی آئے دن کی شاپنگ، بنا سوچے سمجھے خریداری گھوم گئی تھی۔

بہرحال رفتہ رفتہ خالہ کو بھی فوزیہ بیگم کے مزاج کا اندازہ ہو گیا اور آمد رفت میں واضح کمی نظر آنے لگی۔

عبیرہ کا خالہ کے گھر جانے کو بے حد دل چاہتا۔ دانش بھی ان کے گھر نہیں آ سکتا تھا کہ فوزیہ بیگم برداشت نہیں کرتی تھیں۔ وہ عبیرہ سے بات کرنے کے لیے بے چین رہتا لیکن چونکہ عبیرہ کے پاس موبائل ہی نہیں تھا۔ اس لیے وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ عبیرہ کے بجھے ہوئے دل میں اس وقت خوشی چراغ بن کر جل اٹھتی۔ جب کبھی دانش کا فون پی ٹی سی ایل پر آ جاتا۔ چہرہ سارا دن دمکتا رہتا۔

☆......☆......☆

عبیرہ نے کالج میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ اب اُس کے پاس موبائل تھا۔ لیکن ان ہی دنوں دانش نے دبئی جانے کا ارادہ کر لیا۔ عبیرہ کا دل اُس کی جدائی کا سوچ کر ہی بیٹھنے لگا۔ اُسے وعدوں اور تسلیوں کے ڈھیر سارے پھول تھما کر دبئی چلا گیا۔ وہاں جا کر عبیرہ کو بس محض تہواروں پر ہی فون کرتا۔ عبیرہ کا دل ہمہ وقت اُس کے خیالوں میں گم رہتا۔ خالہ بھی عید تہوار پہ ہی اب آنے لگی تھیں۔ اور ہر عید پہ اُسے ہزار روپے دے جاتیں۔ ان ہی پیسوں سے عبیرہ دانش کو فون کرتی۔ چار سال یہ سلسلہ چلتا رہا۔

دانش ایک مرتبہ اپنی بہن کی شادی میں آیا تھا۔ عبیرہ نے اُس شادی میں جیسے اپنے دل کی ساری پیاس بجھا دی۔ دونوں نے گھنٹوں باتیں کیں۔ شادی کے کچھ دن بعد وہ چلا گیا تھا۔ جانے کے بعد پھر اُس نے کوئی فون نہیں کیا۔ عبیرہ نے جب بھی نمبر ٹرائی کیا آف ملا اور اب اچانک سے خالہ کے فون نے اس کی دنیا میں اندھیرا کر دیا۔

☆......☆......☆

ساری رات اُسے تیز بخار رہا۔ لیکن صبح بیدار ہوتے ہی معمول کے کاموں میں معروف ہو گئی۔ آج اُس کے چچازاد عمر نے اسلام آباد سے آنا تھا۔ فوزیہ بیگم بہت خوش تھیں۔ عمر کی فیملی انہیں شروع ہی سے بہت پسند تھی۔ فوزیہ بیگم نے ایک تنقیدی نگاہ لاؤنج پر ڈالی۔ ہر شے بڑے

قرینے اور سلیقے سے سیٹ تھی۔ مطمئن ہو کر وہ کچن میں آ گئیں۔ جہاں عبیرہ صبح کے ناشتے کے برتن دھو رہی تھی۔

''عبیرہ! عمر شام میں آ رہا ہے کچھ بنا لو۔'' فوزیہ بیگم نے کہا۔

''کیا بنانا ہے؟'' کچن میں کھڑا ہونا دشوار لگ رہا تھا۔

''مٹن بریانی، شامی کباب، سلاد اور کھیر۔'' مینیو سن کر تو جیسے اُس کی جان ہی نکل گئی۔ چکراتے سر کے ساتھ بمشکل اس نے کھانا بنایا۔

عمر آ گیا تھا۔ گھر میں شور برپا تھا۔ سب ہنس بول رہے تھے۔ شکر ہے کھانا بھی تیار ہو گیا تھا۔

''عبیرہ آپی! کھانا تیار ہے تو لگا دیں۔'' سامعہ آ ئی تھی۔

عبیرہ کھانا لگانے لگی۔ عمر شاید اپنے روم میں تھا۔ فوزیہ بیگم نے ایک طائرانہ نظر بجی ٹیبل پر ڈالی سب کچھ تیار تھا۔ ترتیب سے رکھا تھا۔ تب ہی ان کی نظر سویٹ ڈش کے ڈونگے پر پڑی۔

''یہ کیا تم نے کھیر نہیں بنائی؟'' انہوں نے قدرے غصے سے کہا۔

عبیرہ شرمندہ ہو گئی۔ اب کیا بتاتی۔ صبح سے اُسے بخار ہو رہا تھا۔ کھیر بنانے کا نہ وقت تھا اور نہ ہی ہمت۔ تب اُس نے فٹافٹ پڈنگ مکس کا پیکٹ دودھ میں گھول کر سویٹ ڈش کا خانہ پُر کیا۔

''السلام وعلیکم۔'' تب ہی عمر کھانے کی ٹیبل پہ آیا۔

''وعلیکم السلام۔'' وہ وہاں ٹھہری نہیں چائے کا کپ لے کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ سب کھانا کھا رہے تھے۔ کسی نے اُسے رسماً بھی کھانے کا نہیں کہا تھا۔ کچھ دیر بعد کچن میں آئی تو ڈھیروں برتن اس کے منتظر تھے۔ بچا کھانا ڈبوں میں بند کر کے فریج میں رکھا۔ جھوٹے برتن سنک میں رکھ کر قمیض کے دونوں بازوں اوپر کیے اور اسفنج اٹھا کر برتن دھونے لگی۔ برتن دھو کر فارغ ہوئی ہی تھی کہ سامعہ چائے کی فرمائش کر گئی۔ اس کے سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ کچن میں کھڑے کھڑے ہی پین کلر لی اور چائے دے کے اپنے کمرے میں آئی تو سردی سے جسم کانپ رہا تھا۔ کمبل لے کر نم آنکھوں کے ساتھ لیٹ گئی۔

☆......☆......☆

رات کو وہ کھانے کی تیاری میں مگن تھی۔ عمر کچن کے باہر رکھے فریج سے پانی پی رہا تھا عبیرہ ٹماٹر لینے آئی تھی۔ ٹماٹر لے کر تیزی سے عبیرہ نے وہاں سے گزر کر جانا چاہا۔ جب ہی لہراتا دوپٹہ عمر کے وجود کو چھوتا راستے میں رکھی لوہے کی پرانی بوسیدہ کرسی میں پھنسا تھا۔ دوپٹہ کھنچاؤ لگنے سے سر سے اتر چکا تھا۔ عبیرہ کے لمبے ریشمی بال اس کی پشت پر بکھر گئے تھے۔ عمر سحر زدہ اُسے دیکھنے لگا۔

''اُف یہ کیا مصیبت ہے۔'' عبیرہ نے جھٹکے سے دوپٹے کو کھینچنا چاہا۔

''لائیں میں نکال دیتا ہوں۔'' اس طرح دوپٹہ پھٹ جائے گا۔''

''نہیں! پلیز میں نکال لوں گی۔'' ایک ہاتھ سے بال سمیٹے دوسرے ہاتھ سے وہ دوپٹہ نکال کے وہ بنا اُس کی جانب دیکھے تیزی سے کچن میں چلی گئی۔

عمر سحر زدہ اسے دیکھے گیا۔ اُسے گئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی خوشبو عمر کو اپنے اردگرد محسوس ہو رہی تھی۔

''عمر بھائی مجھے پیزا کھانا ہے۔ تیز مسالے اور ڈھیر ساری چیز کے ساتھ۔'' سامعہ نے فرمائش کی۔

''اور مجھے تکہ کھانا ہے۔'' راحیل بولا۔
''عیرہ آپ بھی چلیں۔'' عمر اُس سے مخاطب ہوا۔
''نہیں! مجھے کچھ کام ہے۔'' عیرہ نے جواب دیا۔
وہ سب چلے گئے۔ عیرہ اپنے کاموں میں مصروف رہی۔

☆......☆......☆

آسمانوں پر اترتے ہوئے پرندوں کو وہ بہت دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ جس کی بنفشی شعاعیں اس کے چہرے کی تابناکی میں کئی گنا اضافہ کررہی تھیں۔
عمر کا دل بہت چاہا۔ وہ اُس پیاری سی لڑکی کے ساتھ بیٹھے۔ اُس سے پوچھے کہ وہ سب سے الگ تھلگ کیوں ہے۔ کیوں وہ اداس رہتی ہے؟''
شاید اس لیے کہ کسی کو اس کی پروا نہیں، اور شاید کسی کو اُس سے محبت بھی نہیں ہے۔ عمر اس معصوم لڑکی کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ اُس کے لیے فکر مند رہنے لگا ہے۔ وہ اُسے اداس نہیں خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ کیوں کہ وہ اُس سے محبت کرنے لگا ہے۔
لیکن یہ سب وہ صرف سوچ ہی سکتا تھا۔ کبھی عیرہ نے موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اسے یہ سب بتاتا۔

کبھی ایسا ہو
تم آؤ اور ہم
ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر
اپنی باتیں کریں
لفظ ختم ہوجائیں
پھر ہم
اک دوسرے کی آنکھوں میں
دیر تک ایک دوسرے کو تلاشتے رہیں
اور یونہی ایک دوسرے کو دیکھتے دیکھتے
پتھر ہوجائیں
کبھی ایسا ہو
کبھی ایسا ہو

☆......☆......☆

پھر عمر کو جلد ہی موقع میسر آگیا۔
فوزیہ بیگم کے بھائی کے گھر قرآن خوانی تھی۔
فوزیہ بیگم اور جاوید صاحب اور اُن کے تینوں بچے وہاں گئے ہوئے تھے۔ فوزیہ بیگم عیرہ کو اپنی شادی کے بعد کبھی بھی اپنے میکے نہیں لے کر گئی تھیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے رشتے داروں میں کسی کو یہ پتا چلے کہ فوزیہ نے جس شخص سے شادی کی ہے وہ نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ ایک بیٹی کا باپ بھی ہے۔ فوزیہ بیگم کافی بیک ورڈ فیملی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا تعلق غریب گھرانے سے تھا۔
صورت بھی واجبی تھی۔ اس لیے پینتیس سال کی ہوگئی تھیں۔ مگر رشتہ نہیں ہوا تھا۔ ایسے میں جاوید صاحب کا رشتہ ان کی توقع سے بڑھ کر تھا۔
فوزیہ بیگم ہی نہیں ان کے تمام گھر والے خوش تھے۔ مسئلہ صرف جاوید کے شادی شدہ ہونے اور

پانی کے بغیر

یوں تو انسان پانی کے بغیر تین دن سے زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اگر اس کا نعم البدل ہو تو یہ ممکن ہے۔ اس کی مثال ناروے کے ایک شخص ہنری بجیس نے پیش کی اس نے اپنی عمر کے 33 ویں سال سے آخری عمر تک پانی نہیں پیا۔ وہ صرف دودھ پر گزارہ کرتا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ پانی پیے بغیر ایک سو دو سال تک زندہ رہا۔
حسنِ نظر: حاسم وقاص۔ لاہور

ایک بیٹی کے باپ ہونے میں تھا۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ سب سے اسے پوشیدہ رکھا۔ اسی لیے آج تک سب اس حقیقت سے بے خبر تھے۔

وہ کب سے چائے کا مگ لیے چھوٹے سے صحن میں برستی بارش دیکھ رہی تھی۔ اسے بارش کی بوندوں میں اداسی ٹپکتی محسوس ہو رہی تھی۔ صرف تنہائی اور اُداسی۔

تم مجھے یاد نہیں آتے
لوگوں سے
اور اپنے آپ سے
میں یہ بات کہہ کہہ کر اب تھک گیا ہوں۔

عمر نے بغور عبیرہ کو دیکھا۔ اُس لڑکی کی آنکھوں میں اُداسی عمر کو اضطراب میں مبتلا کر دیتی تھی۔

''عبیرہ تم نے کبھی محبت کی ہے؟''

عمر کا سوال غیر متوقع تھا۔ وہ چونکی اور کچھ لمحے اس کو دیکھنے لگی۔

برستی بارش تھی اس کی گرفت میں ایک نازک لمحہ تھا۔ وہ اس کے سامنے تھی جو بے خبری میں اس کی زیست کا عنوان بن گئی تھی۔

''عبیرہ! مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بہت والہانہ انداز میں اظہار کر گیا۔

عبیرہ ساکت رہ گئی۔ پلکیں بھی نہ جھپک سکی۔ لیکن اگلے ہی پل اُسے عبیرہ کی آنکھوں میں واضح بدگمانی نظر آئی۔

''دانش کو بھی مجھ سے ایسی ہی محبت تھی۔'' عبیرہ نے طنز کیا۔

عمر نے کچھ شاکڈ ہو کر اُس کی جانب دیکھا تو عبیرہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ دل ایسے ہی بھرا ہوا تھا۔ عمر کی بات نے جیسے اُسے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع دے دیا۔ وہ اُسے اپنی منگنی اور دانش کی بے وفائی کے بارے میں سب بتا گئی۔ اس کا ایک ایک لفظ اب ہر محبت سے بد گمانی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''عبیرہ! تم بہت اچھی ہو، بالکل ایسی ہی ہو جیسی شریک حیات کی میں نے خواہش کی تھی۔ دانش بہت بد نصیب تھا۔ جس نے اپنے ہاتھوں تمہیں گنوا دیا۔ اور میں خود کو بہت خوش نصیب سمجھوں گا اگر تمہیں پا لیا۔ پلیز انکار مت کرنا۔'' عمر نے محبت بھرے لہجے میں جیسے اس کی منت کی۔

عبیرہ بنا کوئی جواب دیے وہاں سے چلی گئی۔

وہ بے بسی سے اُسے دیکھتے گیا۔

رات کو عبیرہ صحن میں دھلے کپڑے پھیلا رہی تھی۔ وہ پھر آ گیا۔

''عبیرہ تم اتنا خاموش کیوں رہتی ہو؟''

'' کیا بولوں اور کس سے بولوں؟'' عبیرہ کوفت سے بولی۔

'' مجھ سے بولو...... اور میں جو چاہتا ہوں وہ بولو۔''

''کیا چاہتے ہو؟''

''تم کو۔''

'' میرے خیال میں تم سے بات کرنا فضول ہے۔'' وہ ناگواری سے کہہ کر چل دی۔

☆......☆......☆

رات کو برسوں بعد اس کے پاپا اس کے کمرے میں آئے تھے۔ وہ بہت خوش تھی۔ انہوں نے شفقت سے اس کا حال احوال دریافت کیا تھا۔

''بیٹا! ریاض بھائی نے عمر کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ عمر اچھا لڑکا ہے۔ محنتی، شریف النفس، با

اخلاق، با کردار ہے۔ جاب بھی اچھی ہے۔ ہمیں بہت پسند ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''عمر اچھا ہے لیکن مجھے کسی پر اعتبار نہیں ہے۔'' وہ بنا ارادہ کہہ گئی۔

''بیٹا اعتبار تو کرنا ہی پڑتا ہے۔'' وہ محبت سے بولے تھے۔

''اعتبار ہی تو نہیں آتا۔'' وہ سوچ کے رہ گئی۔

کچھ دیر ان دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ عبیرہ اس بار میں تمہاری خوشیوں کے لیے فوزیہ بیگم کے آگے ڈھال بن کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ تو بیٹا! تم سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ میں چلتا ہوں۔ تم ان کی فکر مت کرنا۔ عمر نے بھی اُن سے سختی سے بات کی ہے۔''

عبیرہ سر تھام کے بیٹھی رہ گئی۔

ساری رات جاگ کر گزاری۔ کمرے میں ٹہل ٹہل کر پاؤں شل ہو گئے تھے۔

عمر میں ایسی کوئی خامی نہیں تھی جس کو جواز بنا کے اُسے رد کیا جائے۔ صبح وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔ ناشتے کے بعد معمول کے کاموں میں مصروف تھی۔ عمر چلا آیا۔

''عبیرہ میں آج اسلام آباد جا رہا ہوں۔ میں تمہارے مثبت جواب کا انتظار کروں گا اور صرف تم سے یہ ہی کہوں گا۔ محبتوں میں کامیابی یا ناکامی ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ محبتوں کا یہی صلہ بہت ہوتا ہے کہ آپ سے کسی نے محبت کی یا آپ نے کسی سے محبت کی۔''

عمر چلا گیا تھا لیکن وہ ایک عجب بھنور میں پھنس گئی تھی۔ وہ محبت کے احساس سے واقف تھی۔ اور محبت کے ٹھکرائے جانے کے درد اور اذیت سے بھی بخوبی واقف تھی۔ وہ عمر کے محبت اور ارمان بھرے دل کو اپنے ہاتھوں قتل نہیں کر سکتی تھی۔ یہ اس کی محبت کی سچائی تھی۔ وہ عمر بھر کا رشتہ بنانا چاہتا تھا۔ وہ فلرٹ نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ محبت ثابت نہیں کی جاتی بلکہ وہ اپنا آپ خود منواتی ہے۔

ہم نے اپنی سوچوں سے
اس بند عمارت کی
کوئی تو کھڑکی کھولی ہے

''عمر میں تمہارے لوٹ آنے کا انتظار کروں گی۔'' عمر کے موبائل پر عبیرہ کی آواز گونجی تھی۔ ایک سکون سا عمر کے اعصابوں میں اترا تھا۔ اس نے محبت کی آواز پر لبیک کہا تھا۔

''تم! بے فکر رہو۔ میں جلد آؤں گا۔'' عمر کے جواب نے عبیرہ کے چہار سو جیسے دھنک بکھیر دی۔ عمر کا لہجہ تھوڑا سا اور شوخ ہوا۔ ''میں ایک بار تم سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔''

''کیا؟'' عبیرہ کا دھنک رنگ چہرہ اور گلابی ہوا۔

''بس...... ایک بار کہہ دو...... کہ...... تم پورے یقین کے ساتھ، اعتماد کے ساتھ۔ اپنی محبت میری ذات کا حصہ بنا رہی ہو۔''

''عمر...... پلیز!'' وہ کسمسائی کہ اتنی بڑی بات کہنے کے لیے اُسے واقعی بہت ہمت درکار تھی۔

''بس ایک بار......'' عمر کے لہجے میں کھلی حلاوت نے اسے اعتماد دے دیا تھا۔

''میں...... عبیرہ جاوید! سچ سچ آپ سے محبت کرتی ہوں اور اعتراف کرتی ہوں کہ میں آپ کی محبت کی اسیر ہو چکی۔''

یہ کہہ کر اُس نے فوراً فون بند کر دیا کہ اب اتنی ہمت کے بعد دل کی دھڑکن 'عمر' 'عمر' ہی پکار رہی تھی۔ عمر نے بھی کچھ دیر موبائل ہاتھ میں لیے رکھا اور پھر مسکراتے ہوئے جیب میں ڈال لیا کہ اب اُسے محبت کی تکمیل کے لیے جلد واپس آنا تھا۔

☆☆......☆☆☆

ناولٹ

تسنیم منیر علوی

بے پرواوں کی تتلی

زینت پھوپی ایسا شگوفہ چھوڑ گئیں عروبہ تو آپے سے باہر ہوگئی آخران کے سوا واقعی ہمارا کون خیال رکھتا تھا۔ عروبہ تو پہلے سے ہی ان کی گرویدہ تھی، اس کی پیشکش پہ تو پھولے نہیں سماتی تھی۔ ان دیکھے پاکستان کے عشق میں تو خیر ہم بھی کوئی کم مبتلا ......

اُن لوگوں کی کتھا، جو ہر حال میں اپنے مفاد کے غلام ہوتے ہیں

''بجیا کیا حرج تھا اگر تم ہمارے ساتھ بازار چلی چلتیں، کم از کم کچھ اچھے مسکراتے چہرے نظر آجاتے۔ آخر ہم دونوں یوں منہ بسورے کب تک زندگی گزاریں گے۔ تم کو تو اپنی کہانیوں میں ضرور کہیں شہزادہ مل جائے گا۔ مگر ہمارا کیا ہوگا۔'' پھر بڑی ادا سے انہوں نے ہمارے پاس ایک پیکٹ اچھالا۔ ''دیکھو یہ سرپرائز بڑی اچھی کوالٹی کا ہے۔ اور بڑی مناسب قیمت پر مل گیا۔ جب تم اس کو ہار سنگھار کے پھولوں سے رنگوگی تو اس کی خوبصورتی پر مزید نکھار آجائے گا۔'' ہم اس طوفانی گفتگو سے گھبرا اٹھ بیٹھے کیا ضرورت تھی اس فضول خرچی کی ...... اور یہ سب ......'' ہم نے دوسرے تھیلے پر نگاہ دوڑائی۔

''یہ تو بس ویسے ہی املی کے کتارے وغیرہ ہیں ہمارے یہاں لگا املی کا پیڑ اب پھل دینا چھوڑ چکا ہے۔'' اس نے خود ہی جواز بھی تراشا۔

''مگر پھر بھی عروبہ اتنا موتیوں سے لدا نگروندے کا پیڑ بھی تو ہے۔ اس سے چاہے اچار بناؤ، چٹنی یا مربے آج کل دیکھو تو ہر طرف سرخ سفید گھنگھرو بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔'' ہم کو بری طرح سے غصہ آ گیا مگر وہ کمرے سے یہ جا وہ جا۔

ہم رمشا علی بیگ اور چھوٹی بہن عروبہ اس گرتی اور زمین بوس ہوتی عمارت کے مکین ہیں جس کو لوگ کسی زمانے میں حویلی کہا کرتے تھے بقول شاعر یہاں اب کوئی نہیں......کوئی نہیں آئے گا......! کیوں کہ اماں تو کم سنی میں ہمیں چھوڑ گئیں تھیں۔ یہ ابا ہی تھے جنہوں نے ہمیں سنبھالا۔ گھر میں پرانے ملازمین جو وفادار بھی تھے اس لیے ابا بے فکر ہوکر اپنی نوکری پر جاتے اور ہم اسکول۔ ابا قریبی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے دوپہر کے بعد ان کا وقت شاگردوں کے ساتھ با آسانی بیت جاتا ہاں یہ بات ضرور تھی کہ ابا ہمارے اکلوتے بھائی امجد کی وجہ سے پریشان رہتے کیوں کہ اس کا پڑھائی میں زرہ برابر دل نہ لگتا تھا۔ اپنے گورنمنٹ اسکول سے نکال کر انگلش میڈیم

میں داخل کرایا مگر نتیجہ وہ ہی صفر۔ دل تو خیر ہمارا بھی پڑھائی میں نہ لگتا تھا۔ ہم تو افسانوں کہانیوں میں کھوئے رہتے اور خود بھی کبھی کبھی بچوں کے رسالے ''پھول'' میں کہانیاں بھیج بھی دیتے اور ایسے رازداری کے کام بے چارہ امجد ہی انجام دیتا۔ وقت یوں ہی گزر جاتا مگر جب میاں امجد دوبارہ بھی میٹرک میں فیل ہوئے تو ابا کو اپنی ہیڈ ماسٹری دکھانے کا بھرپور موقع مل گیا۔ اب یہ ستم ظرفی بھی کہہ سکتے ہیں ابا کو رات ہی علم ہو گیا تھا کہ صبح رزلٹ ہے مگر جب رول نمبر غائب پایا تو امجد کی پکار پڑی۔ موصوف رات عشاء میں بھی غائب تھے۔ اب ابا تاؤ میں چھاتا لیے برساتی اوڑھے باہر نکل دوڑے۔ کچھ تو رات مسجد سے غائب ہونے کا غصہ اور پھر ستم یہ کہ دوبارہ بھی امتحان میں فیل...... دوپہر سے شام ہونے کو آ گئی۔ ابا گھر آ کر بھی کبھی ٹہلتے کبھی اٹھتے ''کمبخت بھاگ گیا۔ شاید اس کو پہلے سے ہی انجام کی خبر تھی۔...... ناخلف......''

''رات کو کسی نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ ہم ابا کو تسلیاں دے رہے تھے کہ دوستوں کے ساتھ پکنک پہ چلا گیا ہوگا۔ آج کل چھٹیاں تھیں۔ سارے دوست اکثر گھومنے جاتے ہیں۔ اب تو یہ سن کر ابا کا پارہ مزید چڑھ گیا۔'' اچھا اب اوباش دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے بھی جانے لگے۔ آنے دو...... ٹانگیں توڑ دوں گا۔'' اچانک پچھواڑے دروازے پر آہٹ ہوئی...... دیکھا امجد کندھے پر جھولا لٹکائے، سر جھکائے کھڑے ہیں۔ ابا للکارے!

''امجد بیگ صاحب! میٹرک فیل تشریف لے آئے۔ آیئے قدم رنجا فرمایئے۔''

امجد کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں وہ کچھ ہکلایا۔

''ابا ہم شرمندہ ہیں۔ ہم سے کوئی بھی پابندی نہیں ہو سکی۔ پابندی سے اسکول جاؤ۔ پابندی سے مسجد جاؤ۔ ہمیں آپ معاف فرمائیں۔ ہم جا رہے ہیں کچھ بن جائیں گے تو لوٹ آئیں گے۔'' ہم دونوں گھبرا کر امجد کی جانب بڑھے مگر اس نے بختی سے ہاتھ جھٹک دیے اور قدم دروازے کی جانب بڑھائے۔ ابا دھاڑے۔

''جانے دو! کوئی مت روکنا۔ خود جا رہا ہے، خود ہی واپس آئے گا۔ جب باہر کی ٹھوکریں کھائے گا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ ڈیوڑھی سے بلاتی بابا جی نمودار ہوئے...... وہ امجد بیٹا بیٹا کرتے رہ گئے......

وہ دن آج کا دن امجد پھر نہیں آیا۔ ابا نے کچھ دن انتظار کیا تو پھر اپنے اثر و رسوخ سے دہلی، بریلی، علی گڑھ جانے کتنوں شہروں میں بانس ڈالے مگر کہیں سے بھی امید بر نہ آئی۔

پھر تو نہ جانے ابا کو کیسی چپ لگ گئی کہ ہم بہنوں کا بھی کچھ نہ سوچا...... چپ چاپ روتا بلکتا بھری دنیا میں تنہا کر گئے مانو ہم دنوں پر تو پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اب ہم ایک بوسیدہ، شکستہ عمارت اور کئی درجن نام نہاد ہمدرد، رشتہ دار جائیداد کے حصے کے ساتھ ساتھ ہمارے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگے کتب خانے سے نایاب کتابیں تک لوگ لے اڑے۔ پنکھے، فانوس، قیمتی ٹائلز، آرائشی راہداریاں...... پھر دور پرے کے رشتہ داروں نے یوں اپنا حق استعمال کیا کے عروبہ ہمارے ساتھ رہ لے گی۔ رمشا کو ہادی چچا نے بڑھ کر تھاما اور رہی یہ آثار قدیمہ جو اس کی قیمت لگی وہ ان لوگوں میں تقسیم کر دی جائے گی جن کے پاس بچے رہیں گے۔''

یا اللہ یہ کیسا انصاف ہو رہا تھا۔ ہر شخص بڑھ

بڑھ کر بولیاں لگانے لگا نہیں چھوٹی ہماری...... بڑی کو تم رکھ لو...... وہ ہا ہو کار ہوا کہ ابا کا غم تو کہیں دور جا پڑا ایسے میں بلاقی بابا نے آگے بڑھ کر ہم سب کو گلے لگایا۔

''نہ ہی بیٹا لوگ کہیں جا رہے ہیں اور نہ ہی یہ حویلی!! ابھی ہم زندہ ہیں اب ابا کے دو تین وفادار بھی آگے بڑھ آئے۔ اسی وقت ابا کی چچا زاد بہن جو بہت صاحب حیثیت تھیں۔ اکثر ابا کے پاس آتی رہتی تھیں اور کبھی خالی ہاتھ نہ آئیں۔ کبھی موسم کے پھل کبھی ہمارے لیے جوڑے کپڑے...... یہ زینت پھوپھو تھیں کیوں کہ وہ کالج میں پڑھاتی تھیں۔ شوہر ڈاکٹر تھے اس وقت بھی ان کے پاس گاڑی تھی یعنی راوی نے ان کے لیے چین ہی چین لکھا تھا۔

ہاں...... تو یہ زینت پھوپھو نے آگے بڑھ کر بلاقی بابا کا ساتھ دیا کہ بچیاں اپنے گھر میں ہی رہیں گی۔ جس کو ان کا خیال ہو وہ خبر گیری اپنے گھر سے بھی بیٹھ کر کر سکتے ہیں۔'' یوں ہماری اِن نام نہاد رشتے داروں سے جان چھوٹی۔ ہمیں بعد کو احساس ہوا کہ یہ تو بڑے کام کی پھوپھی ہیں۔ ابا خواہ مخواہ ان سے بدظن رہتے تھے۔

''یہ زینت ہے تو بڑی محبت والی مگر ذرا اس میں نمود و نمائش کا جذبہ زیادہ ہے۔ ویسے بڑی نیک عورت ہے۔'' جانے یہ ریمارکس ابا نے کیوں دیے تھے۔

☆......☆......☆

ماہ و سال کی گردش تھم تو گئیں تھیں، عروبہ کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ ہم نے پڑھائی چھوڑ کر گھر سنبھالا اور لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔'' تہذیب، جوہر نسواں، عصمت'' جیسے پائے کے پرچوں میں ہمارے افسانے لگنے لگے تو اعزاز یہ بھی گھر آنے لگا۔ کچھ باہر کے کرے کرایہ پر چڑھا دیے۔

کبھی کبھی نہ جانے دل کیوں تنہائیاں، دوریاں، مجبوریاں دیکھ کر ڈوبنے سا لگتا ہم باہر پرانے املی کے پیڑ تلے۔ جس پر عرصے سے پھل نہیں آتا) بیٹھے سوچ رہے تھے اب تو بلاقی بابا بھی کمزور ہو گئے ہیں۔ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ کنوئیں سے ڈول نکالنا بھی اب ان کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ ہم ڈول اوپر کھینچنے میں مدد کرتے۔ کیا کریں۔ سامنے وسیع چمکدار آسمان پھیلا ہوا، کچھ کچھ تارے چمک رہے تھے ایک تارا ٹوٹا اور لمبی لکیر بنا کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ پیچھے سے آہٹ ہوئی۔

اوہ، بجیا تارا ٹوٹا...... دیکھنا اب ہماری قسمت کا نجم کیسے چمکے گا۔ میں نے اس لمحے دعا جو مانگی ہے۔'' وہ کچھ پُر جوش ہو رہی تھی۔

''ارے عروبہ پیاری! یہ ہماری قسمت کا تارا نہیں...... یہ تو لپکا ہوا شعلہ ہے جو ابلیس کو مار بھگانے کے لیے پھینکا ہے۔ وہ اللہ کے دربار میں سن گن لینے کان لگائے بیٹھا تھا۔ سورۃ ملک کا ترجمہ پڑھ، یہ سب پتا چل جائے گا۔''

''اچھا بجیا ہم نے مان لیا...... مگر کبھی کبھی دل کو بہلانے کو اچھا پہلو نکالنا بری بات نہیں۔ اب اندر چلو۔ رات زیادہ ہو گئی ہے۔

عروبہ پڑھائی میں بہت تیز تھی مگر اس کو بیرونی سرگرمیوں میں بھی بڑی دلچسپی تھی باسکٹ بال کا ٹورنامنٹ ہے۔ کبھی بیڈمنٹن کا فائنل چل رہا ہے۔ یہ کپ وہ سرٹیفکیٹ......''

''یہ دیکھ بجیا ہم نے جیت لیا۔'' ہم نے اپنی نذیر نظر کتاب سے سر اٹھا کر پیار سے اس کو تھپکی دی اور قریب پڑے اماں کی مراد آبادی صندوقچی

سے کچھ رقم نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔
''واہ ہماری عروبہ نے تو ریکارڈ توڑ دیا۔''
یہ لو اپنی بجیا کی طرف سے یہ انعام اور وہ ہم سے یوں لپٹ جاتی جیسے اس نے ہمالیہ فتح کر لیا ہو۔''

ادھر ہمارا یہ خیال عروبہ زینہ بہ زینہ آگے بڑھ رہی ہے اور ہم پرائیویٹ بی اے بھی نہیں کر پا رہے ہیں کورس کی کتابوں میں دل ہی نہیں لگتا ۔ہمیں یاد آیا آٹھویں کے بعد جب صاحب سے جان چھوٹنے کی خوشخبری ملی تو مانو دو جہانوں کی خوشیاں مل گئیں۔ نہ عاداعظم کی فکر اور وہ مصیبت الجبرا جو ہمارے اوپر جبر ہی تھا ہم نے آگے بڑھنے سے انکار کیا۔ زینت پھوپھو آگے آگئیں۔

''تم پرائیویٹ امتحان دو حساب نہ لینا آرٹس لے لو۔ یوں اس آسیب سے جان چھوٹی۔ پھر مرحلہ آیا علی گڑھ جالر امتحان دینا یہ بہت آسان تھا ابا کا ایک شاگرد ڈیوڑھی پر کورس پہنچا دیتا۔ یوں ہم کچھ عروبہ سے مدد لیتے کچھ اپنا دماغ کھپاتے انٹر پاس کر بیٹھے جانے یہ معجزہ کیسے ظہور پذیر ہوا ابھی تک عقل حیران وششدر ہے۔

عروبہ اکثر زینت پھوپھو کے ساتھ جلسوں میں جاتی آج کمپنی باغ میں بی اماں کا خطاب ہے کبھی بیگم خلیق الزماں کی تقریب۔ خود ہم سے عروبہ نظمیں اور لکھوا کر لے جاتی اور لانے لے جانے کا کام زینت پھوپھو انجام دیتیں۔

بڑا جوش وخروش تھا۔ خواتین کو جناح کے پاکستان میں اپنے خواب پورے ہوتے دکھائی دیتے اور لکھنؤ کا کمپنی باغ جلسوں کا گڑھ تھا۔ بیگم شائستہ اکرام کی تقریر سننے تو ہم بھی گئے تھے بڑی پرجوش اور مہذب خواتین تھیں بعد میں پاکستان کی پہلی سینیٹر خواتین بننے کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہوا۔ ویسے تو ہمارا شہر بڑا پُر امن تھا۔ پاکستان بننے کی خبر پھوپھو نے مٹھائی کھلا کر دی۔ شہر میں مسلمانوں نے ایک دوسرے کو گلے لگ کر مبارک بادیں دیں۔ مگر دوسرے شہر میں بلوائیوں نے بہت لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ عورتیں بچے کسی کو نہیں بخشا۔ ٹرینوں کی لوٹ مار سب کی اطلاع عروبہ لاتی۔ کالج اسکول بند تھے سرکاری ملازمین جو پاکستان کے حامل تھے وہ البتہ بڑی مشکل میں تھے جب ان سے'' بندے ماترم'' ترانے کی فرمائش کی جاتی تو باتعظیم کے لیے جھنڈے کو سلامی پر مجبور کیا جاتا تو کئی مسلمان نوکریاں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تب ان کے گھروں پر چھاپے پڑے۔

اس وقت ادب میں اچانک موجودہ حالات کی جھلک نظر آنے لگیں اور تقسیم اور بٹوارے پر بیدی کرشن عصمت سب نے قلم اٹھایا اور جو ادب عالیہ شمار ہوتا ہے رہ گئے ہم جیسے لوگ جو ہوا کے دوش پہ رکھے چراغ تھے کبھی جل اٹھے تو کبھی بھڑک اٹھے۔

حالات کسی کروٹ بیٹھے تو عروبہ کو کالج کی سوجھی اور ہم کو بیرونی طالب علم کی حیثیت سے امتحان دینے پر اکسایا۔

''بجیا بی اے کی تیاری کرو...... جمشید بھیا سے پارٹ ون کا کورس منگواؤ۔ مضامین کا انتخاب بھی ہم ہی کر دیتے ہیں۔ اودو ،تاریخ، نفسیات......'' وہ تیزی میں نظر آرہی تھی آنکھیں انجام خمار سے لبریز۔

''سنو عروبہ نفسیات کیوں، ایسا کرتے ہیں سنکرت یا ہندی لے لیتے ہیں۔'' ہم نے قدرے خفگی سے کہا۔ اب ہمیں نہیں پڑھنا نہ ہمارے

اتنے وسائل ہیں اور نہ ہمیں شوق ہے۔ اور تم یہ سب اتنی آسانی سے کیسے دوسروں پر فیصلے مسلط کرنے لگی ہو یہ کریں وہ نہ کریں یہ مضمون نہیں وہ۔ ہاں ...... چھوٹی ہو...... تو چھوٹی رہو کیا ہوا اگر تم زیادہ ذہین و فطین ہو۔ کنیوس پر اپنی زندگی اپنی پسند کے مطابق ہی رنگ آمیز کرتی ہے ۔تمہاری دخل در معلومات ہرگز وہ گوارہ نہیں کرے گی۔ نہ ہم ملکہ صبا ہیں اور نہ تم سلیمان جو جن کے لیے ہمیں محل میں اتار دے۔ اور ہم اچانک سب کچھ حاصل کرلیں۔ سمجھیں اب جاؤ اور جاکر اپنے ٹیسٹ کی تیاری کرو۔''

واہ بجیا واہ ویل ڈن! تم تو ڈیبیٹر ہوگئیں۔ کیا اچھا بولتی ہو۔ ویسے بائے داوے اس حسن سلوک پر آپ کی ہمیشہ مشکور رہوں گی اور وہ اپنی کمر پر جھولتی چوٹی کو لاپرواہی سے جھلاتی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی ہم نے سوچا یہ ادا یہ ناز اس پر کتنا کھپتا ہے۔ ہمیں بھی کیا پڑی تھی اتنی جھاڑ پلانے کی۔ ویسے بھی عرصہ ہوا اس کھنڈر میں کوئی نہ آیا گیا۔ اس ویرانے میں بھوتوں کا بسیرا ہو مگر نہیں اب تو شاید بھوت بھی یکسانیت سے اکتا کر اپنا ٹھکانہ بدلنے پر مجبور ہوگئے ہوں گے۔

☆......☆......☆

ملک کے حالات قدرے پر سکون تھے...... فی الحال بی اے کا رادہ ترک کرکے لکھنے پر مائل ہوئی عروبہ کالج، لائبریری، تقسیم اسناد نہ جانے کیا کیا ٹرافیاں انعامات لیے زندگی میں مگن آگے بڑھ رہی تھی ہم نے اس سے ایک دن کہا

'' اتنی ڈھیر سی ایکوٹیز سے تم گھبرا نہیں جاتیں۔'' اس لمحے وہ شرارتی لڑکیوں کی طرح اُس نے رخسار پر جھوتی اپنی لٹ کو جھٹکے سے پیچھے کیا۔

'' اوجہ بجیا تم نہیں جانتیں نا کالج لائف۔ زینت پھوپھی کہہ رہی تھیں پاکستان میں بڑے بڑے کالج یونیورسٹیز کھل رہی ہیں۔ ڈاکٹر پروفیسر، انجینئر کی وہاں ضرورت ہے اور پتا ہے انہوں نے سینی اور ہشام بھائی کو امریکہ پڑھنے کے لیے بھیجنے کی پوری تیاری کرلی ہے۔ پھر بڑی بے پروائی سے کہا۔'' کیا ہی مزہ آئے گا جب ہم پاکستان چلے جائیں گے۔'' میں نے گھبرا کر ایک گہری سانس کھینچی۔'' یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ یہاں اماں، ابا کی قبریں، ہماری یہ حویلی......'' ہم نے چہار جانب نظریں دوڑائی......

'' آپی اس کھنڈر کو تم حویلی کہتی ہو۔ ذرا ٹھنڈے دل سے اس بے ضرر مگر خوش آئند پیشکش پر غور کرنا۔''

'' غور کرنا تو دور کی بات ہے دوسرے دن زینت پھوپھو ہمارے گھر آئیں تو اطلاع دی کہ بچوں کی سیٹ بک ہوچکی ہیں وہ باہر پڑھنے جارہے ہیں اور ہم لوگ پاکستان جانے کا پروگرام بنارہے ہیں لیکن مجھے بار بار تم لوگوں کا خیال آرہا ہے اگر چاہو تو ہمارے ساتھ تم لوگ بھی چل سکتی ہو۔ سوچ لو...... ابھی وقت ہے۔''

'' مگر پھوپھی ایسا کیسے ممکن ہے۔ آپ کے ساتھ تو سرجن انکل ہیں۔ ہم دونوں ہمارا مطلب...... وہ سفر...... پھر وہاں کا کرپر رہائش کا مسئلہ۔'' ہم نے فکر مندی سے کہا۔

'' اس کی تم فکر نہ کرو۔ جب تک تم لوگوں کا کچھ انتظام نہیں ہوجاتا ہمارے ساتھ رہنا جہاں ہم رہیں گے اب فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔'' عروبہ تو سن کر اچھل ہی پڑی......

'' بالکل پھوپھو اس میں سوچنے والی کون سی

بات ہے۔ جہاں آپ وہاں ہم۔ ہمارا یہاں آپ کے سوا کون ہے؟ میں بجیا کو سنبھال لوں گی ویسے آپ پکا ہی سمجھیے۔''
زینت پھوپھی ایسا شگوفہ چھوڑ گئیں عروبہ تو آپے سے باہر ہوگئی آخر ان کے سوا واقعی ہمارا کون خیال رکھتا تھا۔ عروبہ تو پہلے سے ہی ان کی گرویدہ تھی، اس کی پیشکش پہ تو پھولے نہیں سماتی تھی۔ ان دیکھے پاکستان کے عشق میں تو خیر ہم بھی کوئی کم مبتلا نہیں تھے کہ ہمارا الگ وطن ہوگا، بس ذرا مسائل کی کثرت اتنی تھی کہ پریشان تھے۔ بہر حال بلاقی بابا تو ہماری وجہ سے رکے ہوئے تھے ان کا بیٹا خود پاکستان چلا گیا تھا، دوسرا ابھی پر تول رہا تھا۔ مراد آباد میں برتنوں کی دکان پر کام کرتا تھا تھا ان کو ہم نے آزاد کیا وہ بچارے دل گرفتہ روتے ہوئے ہمیں چھوڑ گئے۔ حویلی اونے پونے بکی۔ جمشید جو اس وقت لاء کا اسٹوڈنٹ تھا خود فائنل کے بعد پاکستان نکلنے کی تیاری کر رہا تھا جانے کس دل سے سب کو الوداع کہا اور ایک نئی دنیا کے کولمبس بننے ہم لوگ نکل پڑے۔

☆......☆......☆

یہ ایک نئی دنیا تھی۔ پاکستان قائم ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ عجیب نفسا نفسی کا عالم ضرور تھا۔ کراچی ہمارا مسکن ٹھہرا۔ بیرک میں سرکاری آفیسوں میں لوگوں کا اژدھام۔ لوگ کاغذوں کے پلندے اٹھائے ادھر سے ادھر بھاگے پھر رہے تھے شفقت انکل تو وہاں سرجن تھے۔ وہاں کی ویل آف فیملی سے ان کا تعلق تھا بڑا اثر و سروخ استعمال کیا۔ گورنر اعظم خان سے بھی جا ملے بہر حال ایک مہینے کی جہد و جہد رنگ لائی اور اتیلی جنس اسکول کی ایک بڑی سی بیرک انکل کے نام الاٹ ہوگئی۔ اس بڑی سی بیرک میں سب ہی کچھ تھا لائن سے سرونٹ کوارٹر، لان، پھول کی کیاریاں...... ابھی ہم ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ مگر ہمیں بہت تکلف محسوس ہوتا تھا بیرک تو بڑا تھا مگر بیڈ روم کم تھے۔ ہال، ڈائننگ روم خوب روشن اور بڑے تھے ہمارے ذہن رسا میں ایک آئیڈیا آیا......
''پھوپھی زینت اگر آپ جازت دیں تو ساتھ میں جو کوارٹر ہے ہم وہاں رہ لیں۔'' عروبہ سامنے لیٹی تھی اٹھ بیٹھی اس کا دل کہہ رہا تھا ایسا پھوپھی نہ ہونے دیں گی۔
''نہیں رمشا بیٹی تم ایسا کیوں سوچتی ہو عروبہ کو ایڈمیشن مل جائے ذرا حالات سیٹ ہو جائیں پھر کچھ سوچنا......'' انہوں نے فیصلہ سنایا عروبہ دوبارہ بستر پر اطمینان سے دراز ہوگئی۔
''مگر پھوپھی مجھے اچھا نہیں لگتا آپ کے ساتھ ہی تو ہوں گے۔''
''اچھا چلو تمہاری مرضی...... میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔'' عروبہ پھر لیٹے سے اٹھ بیٹھی۔ مگر اب ہم فیصلہ کر چکے تھے۔
''انکل شفقت نے ہمارا بینک اکاؤنٹ پہلے ہی کھلوا دیا تھا کیوں کہ حویلی کی رقم ہمارے پاس تھی جو ظاہر ہے کافی بڑی تھی۔ اس کوارٹر میں سب کچھ ہی تھا سامان، پلنگ، میز، کرسیاں، کچن کا کچھ سامان ہم نے منگوا لیا۔ یوں زندگی کرنے کا سامان ہوا۔ پھوپھو کو کسی بڑے کالج میں جاب ملی تو عروبہ بھی وہاں پہنچ گئی انکل کو میڈیکل کالج میں پہلے پروفیسر پھر اسپتال میں سرجری میں بلایا جانے لگا اب ہم نے بھی اپنے ہی کاغذ قلم کو سنبھالا۔
اپنا ملک اپنا شہر بڑا روشن اور چمکدار اور ٹھنڈی ہوائیں سمندر سے چلی تو معلوم ہوا نسیم

سحری اور نسیم بری کسے کہتے ہیں عروبہ صبح کالج نکلتی تو واپسی پر کمنٹری کرنا نہ بھولتی۔

''بجیا صبح سڑکیں دھل رہی ہوتی ہیں گھر کہ قریب یہ بڑا سا بورڈ لگا۔'' ریڈیو پاکستان'' اب تمہاری پے منٹ آئے تو ایک ٹرانسسٹر ہی خرید لینا۔'' لیجیے فرمائشی پروگرام شروع......

آج اطلاع ملی بجیا یہ فجر کے بعد باریش سے بزرگ سائیکل پر جاتے ہیں نا یہ احتشام الحق تھانوی صاحب ہیں'' تلاوت قرآن پاک اور اس کا ترجمہ'' صبح کا آغاز ان کی مسحور کن تلاوت سے ہوتا ہے''

''اچھا آج کی خبر کس نے دی۔''

''عفت ہے نا، وہ ہم سے پہلے آگئی تھی سامنے والے ''ہٹ'' (Hut) میں رہتی ہے اس نے بتایا وہ میرے ساتھ ہی روز اسٹاپ پر ہوتی ہے نا۔ اس کی جنرل نالج بڑے غضب کی ہے انٹر سائنس کر رہی ہے مگر معلومات میں پی ایچ ڈی لگتی ہے۔''

اب حیات کا دھارا بدل گیا تھا۔ تقسیم کے بڑے بڑے ادیب شاعر پاکستان آگئے تھے ادبی پرچوں کا اجراء ہو رہا تھا ہم نے بھی۔'' نیرنگ خیال، جام نو، نقوش عنوان'' جیسے پرچوں میں اپنی تحریریں بھیجیں جو جلدی شائع بھی ہوگئیں۔ ایڈیٹروں کی کی فرمائشیں ہونے لگی۔ پزیرائی ملی تو ہماری تحریروں میں بھی نکھار آ گیا۔ سادگی میں بھی پرکاری ہے آپ جلد کہانی ارسال کریں۔ ایڈیٹر لکھتے تو حوصلہ بڑھنے لگتا۔

زندگی سہل ہوگئی تھی وہ یوں کہ عروبہ تعلیم کے میدان میں جھنڈے گاڑ رہی تھی۔ ہم کتابیں اور افسانے لکھ رہے تھے۔ حالات نے اس وقت کروٹ بدلی جب زینت آنٹی کے دونوں بچے تعلیم مکمل کر کے آگئے۔

یہ پورے برگر بچے تھے۔ آدھے تیتر آدھے بٹیر، وہ منہ گول کر کے امریکن لہجے میں بولتے، گھڑ سواری کرتے، آتے جاتے ہم لوگوں پر نظر پڑ جاتی تو نخوت سے منہ مزید سکڑ جاتا۔

اب آئے دن پارٹیاں شروع ہوگئیں ایک عدد پالتو کتا بھی کہیں سے آ ٹپکا۔ جس کی سنہری زنجیر تھامے خراماں خراماں عینی شام کو ہوا خوری کے بعد داخل ہوتی عروبہ کو یہ سب بڑا فینسی نیٹ کرتا۔ آس پاس چکر لگاتی رہتی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی عینی سے دوستی گانٹھنے کی مگر اس کی سرگرمیاں ذرا مختلف تھیں۔ وہ سہیلیوں کے بجائے ہپی ٹائپ لڑکوں کے ساتھ گھومتی...... یوں یوں جیسے اب آنٹی زینت کا Status اپنی امریکہ پلٹ اولادوں کی بدولت تیزی سے بدل رہا تھا۔

ہم نے عروبہ کی بات مانتے ہوئے پرائیویٹ ایم اے کرنے کا رادہ کرلیا۔ اب یہاں ابا کا شاگرد جمشید آیا تو وہ سارا کورس لے آیا ایم اے کے لیے تو لائبرری جانا ضروری تھا۔ تو جناب صبح دس بجے ہم خالق دنیا ہال کی لائبریری سے استفادہ حاصل کرتے۔ (جی ہاں صرف مولانا مقدر پر مقدمہ ہی نہیں چلا تھا یہاں کتب کا نہ بھی ہوا کرتا تھا)

عروبہ کو عینی یا مشام کی سرگرمیوں پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ گاہے بگاہے وہاں چکر لگاتی اور اپنی معلومات کا خزانہ مجھ ناتواں کے گوش گزار کرتی۔

''بجیا وہ جو مسز زلفی ایدھم (شاید زلیخا سے زلفی اور ابراہیم سے ایدھم بن چکے تھے) ہیں سنا ہے ان کا Pet دنیا کا قیمتی ترین پیٹ ہے blood Hound۔ وہ انسانی بو سونگھنے تک

کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور اس پر مسز سرفراز نے کہا کہ امریکہ میں 150 نسلیں ان کی تسلیم شدہ ہی۔ بقیا سب ایسے شیپرڈ وغیرہ کا نام لے کر ایمپریس کرتے ہیں۔"

وہ بڑے آرام سے لن ترانیاں فرما رہی تھیں ہم نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

" نہ معلوم یہ فضول قسم کی گفتگو تم کیسے برداشت کرتی ہو۔ ہمارے تو خیال میں کچھ دن اس پرستان کی سیر چراغاں کر لو پھر Blood hound تمہاری بو سونگھ کر ایسا بھونکے گا کہ ادھر کا دوبارہ رخ نہ کرو گی۔"

" بجیا...... نالج...... صرف نالج کے لیے وہ تم ہی تو کہتی تھیں۔"

اچھا اب تم جاؤ ہمیں کام مکمل کرنے دو۔"

☆......☆......☆

میں عروبہ بیگ بجیا سے تین سال چھوٹی تھی مگر نیچر وائز ان کی برعکس اب یہ کوئی غلط تو نہیں کہہ رہی تھی کہ زینت آنٹی کا بیٹا مشام بہت ہی ہینڈسم گڈ لکنگ ہے مگر سمجھتا اپنے آپ کو ملکہ الزبتھ کا جانشین ہے۔ بڑی نخوت سے ناک سکوڑتا ہے اگر اب ان کو پھوپھو کے بجائے آنٹی کہلانا اچھا لگتا ہے تو بجیا کو کیا اعتراض۔

خود تو شاعروں ادیبوں کی طرح غم کا شامیانہ تانے ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں۔ ان کے تو جیسے کوئی جذبات ہی نہیں مگر بھئی چھوٹی بہن کے جذبات تو پامال نہ کرو۔ منشی صاحب اپنے ایک ہینڈسم دوست کے ساتھ داخل ہوئے۔ کیا ہینڈسم پرسنیلٹی تھی۔ آنٹی نے کہا۔

" عروبہ ذرا ان لوگوں کو جوس سرو کرو میں ابھی آئی۔" بھلا بتائیے اس میں ناراض ہونے والی کون سی بات تھی۔ بس خفا ہو گئیں۔ دو دن منانے میں لگ گئے اور اب ہم آپ کو کیا بتائیں سچی بات ہے وہ ہم پر جان دیتی تھیں مگر بقول ان کے ہی، شاعر صاحب کہ اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے۔

ان کے پاس تو پڑھنے اور لکھنے کے علاوہ کوئی کام نہیں لیکن بھئی ہمارے پاس تو ہیں نا کام۔ اب یہ ہی دیکھیے پارٹیشن سے پہلے آنٹی نے عینی کے جانے کے بعد مجھے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ اس کے سارے کپڑے مجھے دے دیے تھے۔ بجیا کو وہاں بھی سوائے اعتراض کے کوئی کام نہیں...... رہنے کو جگہ دی ساتھ لائیں، اپنے کالج میں داخلہ دلایا۔ خود ان کو ایم اے کرنے پر آمادہ کیا کہ پڑھ لکھ کر اپنے قدموں پہ کھڑی ہوں گی۔ مگر وہ اس سے بھی خوش نہیں...... وہ ہر وقت اب ہمیں اپنی اوقات یاد دلاتی رہتی ہیں۔ کہتیں کہ ہم اب الگ گھر لے کر رہیں گے۔ بھلا بتائیے، اچھے اچھے خاندانی امیر کبیر دھکے کھا رہے ہیں وہ تو مجھے معلوم بھی نہ ہوتا۔ ابا کا شاگرد وہ کیا دقیانوسی کا نام تھا ...... وہ کسی رسالے والوں سے ایڈریس لے کر پہنچ گیا۔ اس نے جانے کیا لارے لپے دیے کہ اس دن سے رٹ لگ گئی ہے کہ اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ بات بڑی معمولی سی ہے۔ آنٹی ہمارے گھر آئیں، ہاں یہ بات ٹھیک ہے...... وہ کبھی کوارٹر نہ آئی تھیں۔ آئی ایگری مگر اب وہ آ گئی تھیں اور اصرار کیا کہ تم لوگ چکر لگایا کرو۔ رمشا تمہارے ایم اے کا کیا بنا۔ ہاں پڑھائی ختم کرو کوئی ملازمت جوائن کر کے، ذرا جہیز بناؤ تو تمہاری شادی ہو۔ یوں بھی زمان بابا اپنی فیملی کو پشاور بلانا چاہ رہا ہے۔" انہوں نے تو ہمارا بھلا ہی سوچا۔ اُس دن سے بھول گئیں کہ کیا کہہ گئیں۔ یہ سب تمہارے پرنس کا کیا دھرا ہے۔ جو ہر وقت

تم چکوری بنی پھرتی ہو۔ وہ تک چڑھا شہزادہ! کیا وہ ایک ہاتھ سینے اور دوسرا ہاتھ کمر پر رکھ کے تمہیں کورنش بجا لاتا ہے۔ آیئے آیئے یہ تخت طاؤس آپ کا منتظر ہے۔''

بجیا کی اس تلخیاتی منظر کشی نے مجھے اندر سے زخمی کر دیا وہ اسی طرح مجھے ہرٹ کرتی تھیں۔ ہونہہ ہمیں کیا! ہمیں تو وہاں اچھا لگتا ہے......!

☆......☆......☆

زینت آنٹی کے یہاں پارٹی زوروں پر تھی مسز سرفراز اور بیگم شاہنوار کو سیاست سے بڑی دلچسپی ہے صدر جانسن پر گفتگو کرتے کرتے انڈیا پاکستان بحث شروع ہوگئی مشام صاحب اپنے بلیک سوٹ میں نہرو کی طرح گلاب کا پھول لگائے گیٹ پر مہمانوں کا استقبال فرما رہے تھے۔ مسز سرفراز کے بچے پکے کانگریسی۔ ماں باپ کی وجہ سے پاکستان آنے پر مجبور ہوئے۔ ان کے لڑکے نے کہیں جملہ کس دیا۔''

گلاب لگا تو شیروانی پر ہی بجتا ہے۔ وہ بھی صرف نہرو کی۔''

بس ایک دم چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ کچھ شرمندہ سے بولے۔

''ادھر کوٹ میں ایک ایک ہک ہوتا ہے۔ جس میں کوئی کلی یا فلاور لگایا جا سکے۔''

اور آئینہ بولے بلیڈی فول'' اتنے قیمتی کوٹ کی توہین برداشت کرنا آپ جانیے کوئی آسان بات ہے۔

وہ تو میں کسی نا کسی بہانے پاس ہی پاس ہوتی ہوں مگر گویا میں ان کے پاس ہوتی ہوں۔ اب دیکھیں نا نوکر اتنی آسانی سے آگے پیچھے پھر تو نہیں سکتا۔ قیمتی شوپیس رکھے ہیں۔ بچے نقصان نہ پہنچا دیں۔ بھئی آنٹی اس لیے تو مجھ پر اتنا اعتماد کرتی ہیں۔ انسان جس کو اپنا سمجھتا ہے اسی سے کام بھی کہتا ہے۔ بجیا سے تو وہ کچھ نہ کہتیں تھیں نا۔

جب بجیا کو اب اس طلسم ہوشربا کی کہانیاں سناتے (کیا کریں دل کی بھڑاس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ہماری سنے) اس میں کیا برا ہے وہ ہم سے ہر کام کہتی ہے تو ہمیں خوشی ہوتی ہے۔

''منشی صاحب......'' (فوراً بجیا نے ٹوک دیا مشام بھائی کہو) تو کیا تم بھی پیار...... میرا مطلب......'' میں نے دل میں بڑی خفت محسوس کی۔

اب بجیا ایمان سے تم کو پوری کہانی نہیں سناؤں گی، اگر بیچ میں ٹوکا تو میں چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ ہاں تو وہ منشی کا لمبی زلفوں والا دوست زلفی مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے تھے اتنے میں ہوا کیا کوئی بچہ بھاگتا ہوا دونوں کے درمیان سے بھاگا زلفی کے براؤن کوٹ پر جوس چھلک گیا۔ آنٹی زینت نے بڑی اپنائیت سے مجھے اشارہ کیا عروبہ یہ ٹشو لے جاؤ ذرا زلفی کی مدد کرو۔ یہ بچے بھی ذرا انہیں دیکھتے۔

''وہ شرمندہ تھیں ہم نے فوراً حکم کی بجا آوری کی اور ہم نے آگے بڑھ کر جاذب پیپر کی طرح اچھی طرح جوس صاف کر دیا۔ وہ کہتا رہا اٹس اوکے! آل رائٹ اور ابھی گیٹ تک میرا تھینکس کر رہا تھا۔ اوہ ویری نائس نائس گرل لاٹ آف تھینکس مگر ہم ویلیم کہہ...... کرتے کرتے بھاگ پڑے کبھی اتنی رئیریکٹو بندے جس کے پاس کسی شاندار برانڈ کے کی پرفیوم کی مہک سانسوں میں اتر رہی ہو۔ برابر کھڑے مشام نے پر اشتیاق نظروں سے ہمیں تک رہے ہوں۔ بجیا ایک ہم جیسی مڈل کلاس مشرقی لڑکی کے لیے بہت مشکل تھا......''

لیجیے اب جو بجیا کی طرف نگاہ اٹھائی تو وہ غصے سے کھول کر لال پیلی ہو رہی تھیں۔

''اور جاؤ گھو...... آج کوٹ کی صفائی کی ہے کل سے فرش کی شروع ہو جائے گی۔ اب یہ دو چار قدم لب نام رہ گیا ہے پھر اس وقت پر رونا جب ہر ویک اینڈ پر ایزاے ہیلپر مدعو ہو گی۔ ابھی سوچ لو کچھ آپشن ہیں۔ جس میں کچھ لازمی اور کچھ چوائس ہیں اور پانچ نمبر صفائی کے بھی ہیں۔''

☆......☆......☆

آج عروبہ کو کالج سے آنے میں بہت دیر ہو گئی۔ ہم بار بار گھڑی دیکھتے یا باہر کا دروازہ شام ہونے کو آئی۔ گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ وسوسے دل میں گھر کر رہے تھے۔ آہٹ پر چونکتے بے چین ہو کر دروازے کی طرف بڑھے۔

''عروبہ سب خیریت! مغرب ہونے والی ہے۔'' ہمارے لہجے میں نا چاہتے ہوئے بھی غیر ارادی طور پر تلخی آ گئی۔

یہ کوئی وقت ہے کالج سے واپسی کا۔'' اس نے جواب میں کندھے اچکائے۔

صبح انفارم تو کر دیا تھا۔ آج دیر ہو گی لیب ہے۔ پھر سب دوستیں کچھ کھا پی کر گھر آئیں گے۔ یہ آج آنٹی کے ہاں بڑی چہل پہل ہے۔ باہر ڈیکوریشن والوں کی گاڑیاں کھڑی ہیں۔ کچھ چراغاں کا بھی اہتمام ہے۔ اس نے پنجوں کے بل اچک کر چاروں اطراف نظریں دوڑائیں۔

''ہاں تو بھئی بڑے بڑے لوگ ہیں، کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ویسے بھی آج ویک اینڈ ہے۔ کیا خبر بیٹے کی یا بیٹی کی منگنی ہو۔'' ہم نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''واہ کیا بات کرتی ہو۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ ہمارے یعنی ہم لوگوں کے بغیر ایک واحد ہم رشتہ دار ہیں۔''

''سنو! سنو! انہوں نے پھوپی کہنے سے منع کر دیا ہے۔ رشتہ ختم۔'' ہم نے اس کی تصحیح کی۔

''ہاں ضرور بے حسی ہے۔ تم وہاں جا کر اتنا کام کرتی ہو۔ تمہیں نہیں انوائٹ کیا۔...... جاؤ اب چینج کرو۔''

آج ہم نے بھی بڑے بے مہر انداز میں اس کو آئینہ دکھا دیا۔ ہمیں پچھلے ہفتے اس کی بے عزتی کا بہت غم تھا۔ رات محفل جواں تھی۔ قہقہے، مصنوعی مسکراہٹیں، مختلف برانڈ کی نیو گاڑیاں، امپالا، شورلیٹ مہکتے اور لہکتے جسم ان سے پھوٹتی معروف خوشبو یات کا طوفان ایک حسینہ پری وش Sleeve Less پنک بلاؤز چھلہ سی کمر لنگ رہا ہے۔ بجیا چل نہیں رہی تیر رہی ہے۔

یہ لیجیے ایک دوسری اپسرا دیوی اس کے ساتھ ایک شہزادہ۔ ہاتھوں میں خوبصورت سا پیکٹ خراماں خراماں! اوہ مائی گاڈ! کیا ہارٹ ٹچینگ پرسنیلیٹی ہے۔ سوچو بجیا سوچو جس کے مہمان ایسے ہوں تو میزبان خود کیسا ہوگا۔''

لو وہ جازی اپنی مما کے ساتھ داخل ہو رہا ہے۔ آج گرے سوٹ میں ملبوس ہے۔ کالر کے پاس ایک کلی اٹکی ہوئی مسکرا رہی ہے۔

پیاری بجیا ادھر آؤ نا۔ تم نے ایسے نظارے نہیں دیکھیں ہوں گے۔ دیکھ لو نا۔ ارے دیکھ لو نا یہ تو شاید فلم اسٹار ہے۔ جانا پہچانا چہرہ ہے۔''

''تم نہیں آئیں نا چلی بھی گئی۔ کاش آج تم مجھے وہاں جانے سے منع نہ کرتیں۔ کتنا مس کیا میں نے۔'' وہ مسلسل جافری سے لگی کمنٹری کر رہی تھی۔ اور یہاں ہم دل ہی دل میں کھولے جا رہے تھے۔ یہ لڑکی کیا سوچ رہی ہے۔ اس کو ہم لوگوں کی بے عزتی کا ذرا بھی ملال نہیں۔ عاجز

آ کر اس کو آواز دی۔

''اب کھانا کھالو...... دس بجے کے بعد تمہارا بلاوا نہیں آسکتا ہے۔''

وہ لٹے لٹے قدموں سے ہمارے قریب آئی۔ اس کی آنکھوں میں اماوس کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہمارا جی چاہا کہ ایک چراغ روشن اس کی مایوس آنکھوں میں جلا دیں۔ ہمارا بس چلے گلاب، یاسمین، اور، موسم بہار وصبا اس کے دامن میں ڈھیر کر دیں۔ صرف ایک مشام کا، اس کا زلف دراز دوست جازی ہی کیوں......؟

رات سے سردی بڑھ گئی تھی۔ ہمارا فائنل کا آخری پیپر تھا۔ لائٹ آف کر کے ہم لیٹ گئے۔

☆......☆......☆

ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ امریلی باشندوں کے اندر کہیں نہ کہیں ایک برمودا ٹرائی اینگل انگڑائیاں لے رہا ہوتا ہے جس میں ان کے جہاز غرق ہوتے رہتے ہیں۔ اور جو لوگ عرصہ دراز ان کے ماحول میں رہ کے رچ بس جاتے ہیں وہ بھی ان ہی کی طرح ابھرتے ڈوبتے رہتے ہیں۔ مشام اور عینی۔ (قراۃ العین) کا حال بھی کچھ ویسا ہی ہو چکا ہے کہ والدین نے ان کی خاطر پہلے خود کو بدلا اور اب دونوں کو وہاں جیسا ہی ماحول فراہم کر دیا۔ عینی گھر سے غائب رہنے لگی۔ مشام منہ گول کر کے تھک کے نڈھال ہو چکا ہے۔ اس کا جہاز تو مانو غرق ہی ہو گیا۔ کیوں کہ ماما پاپا گرل فرینڈ کے بجائے اس کی شادی پر زور ڈال رہے ہیں۔

ایسے میں ایک ملگجے اندھیرے میں عرصے کے بعد زینت آنٹی ہمارے کوارٹر تک آئیں اور ایسی بات کہہ دی جس نے ہمارے پیروں تلے زمین ہی کھینچ لی۔ ہم نے بے یقینی نے ان کی جانب دیکھا۔ ایسی انہونی کیسے ہو سکتی ہے۔ کہیں یہ کوئی ڈرامہ تو نہیں۔ سوچ میں غرق دیکھ کر بڑی اپنائیت سے ہمارا چہرہ اوپر کیا جو آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔

''کوئی جلدی نہیں ہے۔ سوچ لو ابھی وقت ہے۔ سارے پہلو سامنے رکھ کر جواب دینا۔''

یعنی پہلے دھمکی دی کہ کوارٹر خالی کرو اور پھر یہ پیغام یقینی اقرار ورنہ......!

شام کو عروبہ سے ہم نے پوچھا تمہیں مشام کیسا لگتا ہے۔'' جواب آیا۔

نائیس...... نیچر وائز...... نائیس...... کریکٹر وائز نائیس۔''

''تو اس نائیس شخص کو تو تمہاری زندگی کا ساتھی بنا دیتے ہیں۔''

''نائیس ویری نائیس۔'' وہ کتاب چھوڑ کر اچانک اچھل پڑی۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو بجیا۔ تم نے یقیناً کوئی خواب دیکھا ہے۔

''تھا تو یقیناً خواب مگر اب حقیقت بننے کو ہے۔ زینت آنٹی آج ہمارے پاس آئی تھیں۔''

اچھا!'' اس کی آنکھوں کی چمک عود کر آئی۔ ''شی از سو گریٹ۔''

''مگر عروبہ تم اچھی طرح سوچ لو۔ یہ رشتہ ہمارے جوڑ کا نہیں۔ مجھے تو کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔''

(کہیں آنٹی لارنس آف عربیہ کی طرح بھیس بدل کر ہمیں برباد تو نہیں کرنا چاہتیں۔) یہ بات ہم نے صرف دل تک سوچی زبان تک نہ لا سکے اس کے چہرے پر سجا چراغاں اچانک تاریکی میں تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔

☆......☆......☆

آج سردی بڑھ گئی ہے۔ شام ہی سے سناٹے کا راج تھا۔ گرم لحاف میں لیٹے اپنے ماضی وحال

کا موازنہ کر رہے تھے۔ ابا...... امجد بھیا۔ کاش اس کٹھن راستے پر کوئی تو راہ دکھانے والا ہوتا ...... مگر عروبہ نے ہمیں زیادہ سوچنے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ وہ خود زینت آنٹی اور مشام سے بات کر آئی۔ اور اس نے کہا۔

بجیا تمہارے وسوسے اور واہمے! سب منتشر ذہن کی پیداوار ہیں۔ وہاں سب اس رشتے سے بہت خوش ہیں۔ میری زبردست پذیرائی ہوی۔ تم خواہ مخواہ پریشان تھیں۔ تم فوراً منظوری دے دو، کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

اور اس کے کہنے کے مطابق ہم نے حکم کی تکمیل کرنے میں دیر نہ لگائی۔

☆......☆......☆

مشام اسی وقت کلینک سے واپس آیا تھا اور شاید پھر کہیں باہر جا رہا تھا۔ بڑے والہانہ انداز میں میرے سراپے نظر ڈالی۔ اس کے چہرے پر ستائشی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ خود فریش شیو اجلا اور روشن چہرہ لیے مدھ بھری اور مسحور کن خوشبو میں بسا ایک دلکش وجود لیے میرے سامنے تھا۔ پہلی بار میں نے اپنائیت سے پوچھا۔

''آپ کہیں جا رہے ہیں۔'' اس نے اپنے دراز قد کو تھوڑا ایڑی سے اوپر اٹھایا۔

''لیس ...... میں نکل ہی رہا تھا۔ دوست کی طرف۔'' پھر دستی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''میں ویسے ہی لیٹ ہو چکا ہوں اس لیے سوری! پھر جلدی ملتے ہیں۔ اچھا او کے بائے۔'' مجھ پر تو منوں اوس جا پڑی...... باہر سے آنے والے لوگوں کو ٹائم کا بہت خیال ہوتا ہے ورنہ بیچارہ رک جاتا۔ اور جانے کتنی باتیں کرتا مگر بجیا کو ہمیشہ سے ان لوگوں کے خلوص پر شک رہا ہے۔ اب بیچاری وہ بھی کیا کریں۔ بڑی بہن کو چھوڑ کر چھوٹی بہن کے لیے اصرار کرنا ہے تو ذرا مشکل کام تو زیادتی ہے بجیا کی۔ ان کو بھی سوچنا چاہیے امریکہ پلٹ نوجوان کو فر فر انگلش بولتی لڑکی چاہیے ہوتی ہے کہ ایک اردو اسٹوری کی رائٹر کی۔

میں جانے کن سوچوں میں گھری گھر کے لیے پلٹی تو عینی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''اوہ سوری ...... سوری وہ گھڑ سواری کے ٹریک سوٹ میں کسی فارنرز سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے خوش اخلاقی سے کندھے اچکائے۔

''ڈونٹ وری...... اٹس او کے......'' اور پھر میں نے بجیا کو اپنی مرضی سے آگاہ کر دیا۔

ہم نے اس کے شنگرفی گالوں کو تھپتھپایا......'' تُو ہمیشہ خوش رہے۔ کیوں کہ ہمیں اب معلوم ہو چکا تھا کہ دلیلیں، منتیں، اور فلسفے سب دھرے رہ چکے ہیں۔

ان دنوں وہ ایک خوشیوں کی رتھ پر سوار ایک شہزادی لگ رہی تھی۔ اس کی گہری آنکھوں پر سجی خم دار پلکیں اور کمان سی تنی بھنویں یعنی سارے نقوش نکھر گئے تھے۔ اس نے ہماری دلجوئی میں آگے بڑھ کر گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''بس بجیا میری رسائی اس محل تک ہوگئی۔ تم سمجھو تم بھی وہاں خود بخود پہنچ جاؤ گی۔ کسی سلیمانی قالین کی ضرورت نہ پڑے گی۔''

☆......☆......☆

ملک میں حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ ہم نے کئی جگہ اپلائی کیا ہوا تھا مگر اسکندر مرزا اور دوسرے وزراء کی ریشہ دوانیاں اور زور پکڑ چکی تھیں۔

جب ہی صبح آنکھ کھلی تو معلوم ہوا حکومت بدل گئی ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے اقتدار سنبھال لیا ہے۔ عروبہ کی جلد شادی ہوتے ہوتے

اچانک رُک گئی۔ ہر طرف چھاپے، گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ بڑے بڑے چور ناجائز ذخیرہ خور سمندر میں سونے چاندی غرق کرنے لگے۔

شکر ہے اماں کا زیور ہمارے پاس تھا اور بینک سے کچھ رقم بھی تیاری کے لیے نکال لی تھی آنٹی نے کہا تھا تم کو کیا تیاری کرنی ہے۔ ایک گھر سے اٹھ کر دوسرے گھر آ جاؤ گی۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے۔۔ مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

ملک کے حالات کنٹرول میں آئے تو آنٹی کو دوبارہ شادی کی تاریخ یاد آنے لگی۔ وہ دراصل مصروف بھی زیادہ ہوگئی تھیں۔ ان کو ہمیشہ سے سوشل ورک کا زیادہ شوق تھا۔ پہلے انہوں نے ''اپوا'' جوائن کی پھران کو خیال آیا یہ اتنا قیمتی وقت اور محنت اپنے کام میں کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے تو اس لیے انہوں نے ایک ادارہ ''مسکن'' کے نام سے قائم کیا۔ تو اب ان کا کام بہت بڑھ گیا۔ اس لیے وہ گھر میں بہو کی آمد جلدی چاہ رہی تھیں۔

آج زینت آنٹی کے گھر اسی سلسلے میں ایک پارٹی تھی۔ سماجی ادارے کا افتتاح ہوا تو دوستوں نے ٹریٹ کی فرمائش کر دی۔ صرف قریبی دوست انوائٹ تھے۔ عردہ اب ہونے والی بہو کی حیثیت سے انوار ہو چکی تھی۔ کچن میں کام دیکھ رہی تھی۔ جب ہی اُس کے کانوں میں مسز قزلباش کی آواز ٹکرائی۔

''مسز شفقت آپ کا بڑا ظرف ہے کہ آپ نے ایک بے سہارا کو سہارا دیا اور وہ بھی اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے ایک پناہ گیر (Refugee) کو پہلے شیلٹر فراہم کیا اور اب بہو بنا لیا ...... نہ تو آپ نے Status دیکھا۔'' وہ خاتون بڑے زخمی انداز میں ان کو سراہنے سے زیادہ جیسے افسوس کر رہی تھیں۔ میں نے کچن کی دیوار کا سہارا نہ لیا ہوتا تو شاید گر جاتی۔ زینت آنٹی کی آواز نے گویا بم گرایا۔

''ہاں ہمیں تو ہمیشہ سے ہی سوشل ورک کا شوق رہا ہے۔ یہ حق تو پڑوس کا ہے نا۔''

میرا حلق خشک ہوگیا۔ اور زیادہ دیر وہاں کھڑی رہتی تو ہارٹ فیل ہو جاتا۔ مگر اپنے آپ کو سنبھالا سبیلے ایک گلاس پانی پیا۔ خود کو سنبھال کر آنکھوں کی نمی کو چھپاتے باہر آئی۔ ظاہر نہ کیا کہ اندر مجھ پر کیسی قیامت گزر رہی ہے۔ سامنے ہی خواتین کا جمگھٹا تھا، گوسپ جاری تھیں۔

اوہ ہائے عروبہ، ہا، ہاؤ سویٹ آپ تو خوش نصیب ہیں۔ گھر میں ہی Pair مل گیا۔ مسز سرفراز نے جملہ لگایا۔

''میں ایکسیوز کر کے باہر آ گئی۔''

بوجھل دل لیے گھر میں پھرتی رہی۔ بجیا سے سر درد کا بہانہ کیا۔ بجیا نے کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔

رات گئے باہر تاروں بھری ایک اداس رات کو کھڑکی کے پاس ٹہلتی ہوئی گزر رہی تھی کہ اپنا نام سن کر رک گئی۔ یہ مشام کا کمرا تھا۔ کمرے میں دودھیا نائٹ بلب جل رہا تھا۔ ہوا سے پردے ہل رہے تھے۔

''ماما ویسے آپ میرے ساتھ اچھا کر نہیں رہی ہیں۔ وہ ایک کمزور احساس کمتری کی ماری لڑکی ہے۔ اس کو یعنی اکلوتے بیٹے کے ساتھ۔''

پھر سناٹے میں آنٹی کے دل سے آواز ابھری۔

''تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میری این جی او کے لیے یہ ایک بہترین پروجیکٹ ہے۔ یوں بھی کالج کی نوکری کے بعد اس ایوسی ایشن سے ہی بھی ساری امیدیں ہیں۔ میں چیئر پرسن ''مسکن'' ہوں۔ جب ایک ریفیوجی کو اپنی بہو بناؤں گی تو سوچو ڈالروں کی بارش ہو جائے گی۔ بھرپور فنڈنگ ہوگی۔ غریب نادار لڑکی، لٹا پٹا گھرانہ، سوچو...... مشی سوچو تمہاری ممی اچانک کہاں کھڑی نظر آئیں گی

آنسو...... میرے دامن کو تر کر رہے تھے۔

مشام نے پھر کچھ بحث کی...... تو غصے میں آ گئیں۔ آواز کا ارتعاش تیز ہو گیا۔

''اب تم سمجھتے کیوں نہیں۔ کیا تم نے اپنی ڈاکٹری رپورٹ نہیں دیکھی۔ ایک دو سال بعد طلاق دے کر فارغ کر دینا کہ وہ میڈیکلی طور پر ماں نہیں بن سکتی۔ پھر بھی احسان اور ہمارے ادارے کے لیے مزید...... فنڈ...... تم اب سمجھ گئے۔ شاید اسی کو کہتے ہیں ایک تیر سے دو شکار۔'' اور پھر وہ اپنے بے بی کو شاید چمکارے لپٹانے لگیں۔

میرے ذہن میں آندھیوں نے گھر کر لیا۔

جانے کس غم کا استعارہ ہے
تتلیاں مر رہی ہیں خوابوں میں

☆......☆......☆

لارنس آف عربیہ کا فلمی سفاک چہرہ میرے سامنے کھل گیا۔ بجیا نے ٹھیک ہی سوچا تھا کچھ لوگ جو ہٹلر کو طلسماتی کردار سمجھتے ہیں...... تین کریکٹر...... جوزف گوئبلز، ہٹلر...... اور ہیملر...... تینوں جھوٹ اور ظلم کے ہولوکاسٹ تھے۔

تینوں نے جھوٹ اور ظلم کے پہاڑ توڑ توڑ کر اپنا سکہ جمایا۔ آج اس لمحہ موجود میں مجھے یہ اتنی بڑی پروفیسر، اعلیٰ تعلیم یافتہ بچے سب اسی گیم کا حصہ لگ رہے ہیں اور میں عروبہ بیگ ایک بے پروں کی تتلی بنی پھڑپھڑا رہی ہے اور جو اپنی طاقت پرواز کھو بیٹھی ہے......

جو اپنے سے اونچا صنم دیکھتے ہیں وہ منہ کے بل گر جاتے ہیں۔ میں تیز آندھیوں کے جھکڑ میں اپنا آپ سنبھال نہیں پا رہی اور اوندھے منہ جیسے کسی گہری کھائی میں جا پڑی ہوں۔

اب ہم رمشا علی بیگ اپنی اسٹوری اختتام کر کے آنکھیں موند لیتے ہیں ایڈیٹر نے جلد...... کہانی بھیجنے پر اصرار کیا ہے۔

☆......☆......☆

افسانہ

خولہ عرفان

فریب

رات وہ سونے لیٹی تو سویرا نے اُس سے پوچھا۔ ''تم کو پتا ہے جویریہ! ممانی آج کیوں آئی تھیں۔'' اُس نے ہنستے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔ ''بھئی پہلے تمہارے لیے فکر مند رہتی تھیں اب میرے لیے فکر مند ہوں گی۔ اور کیا بس اگر فکر مند نہیں ہوں گی تو......

اُن لوگوں کا افسانہ، جو ہمیشہ اپنا ہی بھلا چاہتے ہیں

نیم کے سوکھے پتے ہوا کا ہاتھ پکڑے صحن میں ادھر سے اُدھر گھومتے پھر رہے تھے۔ وہ پلنگ پر آرام سے پاؤں پر پاؤں رکھے پڑوسیوں کی مشترکہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ان ہی کے نیم کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھی لیموں پانی پیتے ہوئے اس نظارے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ تبھی دروازے پر ہوتی کھٹ کھٹ اس وقت اس کو سخت ناگواری گزری۔

''افوہ بھئی اتنی شدید گرمی میں اس وقت کون آ گیا۔ کمبخت لائٹ بھی گئی ہوئی ہے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے پلنگ سے اتری۔ دروازے کی جانب جاتے ہوئے اپنے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ جہاں لائٹ نہ ہونے کے باوجود اس گرمی میں بھی سویرا غافل سو رہی تھی جبکہ اماں بھی اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں۔

''کون ہے؟'' اس نے دروازے پر جا کر پوچھا اور باہر سے چیخنے والے انداز میں ممانی کی آواز آئی۔

''ارے پوچھتی ہی رہو گی یا دروازہ بھی کھولو گی۔'' اس نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔ ممانی گرمی اور غصے سے لال بھبھوکا ہو رہی تھیں۔

''تم سے جلدی نہیں چلا جاتا اتنی سستی، توبہ توبہ سسرال میں خوب نام روشن کرو گی۔'' انہوں نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''سوری ممانی وہ ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔'' اس نے ان کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے صاف جھوٹ بولا۔ ''اچھا، اچھا'' ممانی احسان کرتے ہوئے اندر آ گئیں۔ اس نے جلدی سے کچن میں جا کر ٹینگ بنایا اور جب وہ شربت لے کر کمرے میں آئی تو ممانی اور اماں باتوں میں مصروف ہو چکی تھیں۔ اس نے ممانی کو سلام کیا اور شربت دیا تو وعلیکم السلام کہتے ہوئے انہوں نے خوشگوار موڈ میں شربت لے لیا۔ اماں نے ٹوکا۔

''تم کو اب سلام کا خیال آیا ہے۔''

''وہ اماں دروازہ کھولتے وقت ممانی اتنے غصے میں تھیں کہ میں نے سوچا پہلے ممانی سکون سے

بیٹھ جائیں۔ پھر سلام کر لوں گی۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں اماں کو جواب دیا۔ ممانی کو اپنے رویے کا احساس ہوا تو انہوں نے نند کو خود ٹوک دیا۔

''ہاں، ہاں زبیدہ گرمی کے مارے میرا دماغ بہت گرم ہو گیا تھا۔ بے چاری بچی کو بے بھاؤ کے سنا ڈالیں۔ ویسے بھی زبیدہ تمہاری بچیاں ہیں بہت سمجھدار۔ ممانی نے محبت سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ مسکرا دی۔

''ممانی لائٹ گئی ہوئی ہے۔ آپ کو یہاں بہت گرمی لگے گی۔ باہر بہت اچھی ہوا چل رہی ہے۔ آپ دونوں باہر آ جائیں۔'' وہ ان کو خلوص سے مشورہ دیتے ہوئے صحن میں چلی آئی۔ کچھ بھی تھا۔ ممانی اس کو اچھی لگتی تھیں۔ اُس کا لیموں پانی گرم ہو چکا تھا۔ اس نے فریج میں رکھا اور واپس آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اماں اور ممانی دوسرے پلنگ پر محو گفتگو ہو گئی تھیں۔ موضوع وہی پرانا تھا۔ اماں کی سویرا کی شادی کے لیے پریشانی اور ممانی کی تسلیاں اور مشورے۔

''ارے زبیدہ اپنی لڑکیوں کو ذرا باہر نکالو۔ ملنے ملانے لے کر جایا کرو۔ ہر وقت گھر میں گھسی رہتی ہیں۔ اس طرح رشتے تھوڑی ملتے ہیں۔ سویرا کو جاب کروا کر دنیا سے بالکل بیگانہ کر دیا ہے۔''

وہ نان اسٹاپ بولے جا رہی تھیں۔

''یاد رکھو زبیدہ سو فیصد تمہاری پسند کا لڑکا تو تمہیں نہیں مل سکے گا۔ اگر سویرا نے ماسٹرز کر لیا ہے تو تم اس بھول میں مت رہنا کہ کوئی ڈاکٹر یا انجینئر یا کوئی ڈگری یافتہ ہی تمہارا داماد بنے۔ ہم متوسط طبقے کے لوگوں پر یہ چونچلے اچھے نہیں لگتے۔ خالہ رشیدہ کو دیکھ لو اس آس میں انہوں نے بچی کے سر

میں چاندی کے تار اتار دیے اور آخر کار ایک عمر رسیدہ گریجویٹ سے اُس وقت شادی کی جب اولاد کے بجائے تنہائی کا خوف شادی کے اس نازک بندھن کو جوڑے رکھتا ہے۔ بتاؤ بھلا خواہشوں اور جذبوں کو جواں عمری میں سلاتے رہو اور جب وہ احساسات لبِ گور آ جائیں ،تو ایک ایسی عمر کے آدمی کے سپرد بچی کو کر دو جو خود کچھ سالوں کا مہمان ہو۔ پیسہ تو ویسے بھی لڑکی کے نصیب میں ہوتا ہے۔ دولت ثروت کیا دیکھنی۔''

ممانی نے ایسی ہولناک تصویر خالہ رشیدہ کی بیٹی کی اماں کے سامنے کھینچی کہ اماں ہولا ہو گئیں۔

''نہیں ،نہیں بھابی ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں اور سویرا کے ابا تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ لڑکا بھلے گریجویٹ ہو ،لیکن با اخلاق اور کشادہ ذہن کا مالک ہو۔'' اماں نے کچھ کھسیا کر صفائی دی۔

''ارے زبیدہ اگر میرا منظر زبیدہ سے چھوٹا نہ ہوتا تو تمہیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں اپنی بچیوں کو کبھی باہر جانے نہیں دیتی۔''

وہ اماں اور ممانی کو الجھتا چھوڑ کر خود کمرے میں آ گئی۔ اگرچہ سویرا اور اُس کی عمر میں تین سال کا فرق تھا لیکن اماں کے کہنے کے باوجود وہ بھی آپا کے بجائے سویرا کا نام ہی لیتی تھی۔ انٹر کے امتحانات کے بعد اب وہ فارغ تھی۔ جاب کا سوچا تھا، تو ابا نے سختی سے منع کر دیا کہ سویرا نے بھی ماسٹرز کر لیا ہے۔ اس لیے اجازت دی ہے تاکہ فارغ وقت میں اپنی تعلیم کو صحیح مصرف میں لائے۔ لیکن تم کو ابھی پڑھنا ہے۔ اگر فارغ ہو تو اس کے علاوہ کوئی اور مشغلہ ڈھونڈ لو اور وہ بھی ممانی کے گھر چلی جاتی کبھی زوبیہ کے پاس یا کبھی اُس کو بلا لیتی، وہ بھی اس لیے کہ گھر قریب تھے۔ باقی اور کزنز سے فون پر رابطہ رہتا تھا۔ یا اگر بجلی اور فراغت مل بیٹھے تو وہ نیٹ پر اپنی دوستوں سے چیٹنگ کر لیتی تھی۔ اماں کے ساتھ بھی گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی لیکن پہاڑ سا دن کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ البتہ گھر کے چھوٹے بڑے مسائل سے اُسے بڑی حد تک آگاہی ہو گئی تھی۔ جب ممانی نہیں ہوتی تھیں تو اماں اپنی فکر و پریشانی اس سے بانٹنے لگتیں اور وہ اماں کے گلے میں پیار سے بانہیں ڈال کر انہیں سمجھاتی۔

''اماں پریشان نہ ہوں ،جس رب نے آپ کو ہم جیسی پیاری بیٹیوں سے نوازا ہے۔ وہ ہی ان کی حفاظت بھی کرے گا اور ان کی ضرورت کو بھی پورا کرے گا۔'' اور ابا جب بھی اُس کی یہ بات سنتے تو اماں سے کہتے۔ ''زبیدہ میری بیٹیاں واقعی رب کا تحفہ ہیں۔ تم ناحق پریشان ہوتی ہو۔'' اور اماں ہنوز متفکر چہرے کے ساتھ مسکرا دیتیں۔

وہ دیکھ رہی تھی کہ ہفتہ عشرے میں ضرور کوئی نہ کوئی مہمان سویرا کو دیکھنے کے بہانے آتا تھا۔ وہ اُس کو پُر شوق نظروں سے دیکھنے کے بعد پھر کبھی نہیں آتا تھا۔ وہ تو بعد میں اماں نے اُسے بتایا کہ وہ سویرا کی جگہ اسے پسند کر جاتے تھے۔ لہٰذا اماں نے منع کر دیا کہ آئندہ تم چائے دینے نہیں آؤ گی بلکہ مہمانوں کے سامنے قطعاً آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

کبھی لڑکے کی عمر زیادہ ہوتی' کبھی سویرا کی جگہ اُس کو پسند کر کے چلے جاتے۔ کہیں تعلیم کی کمی رشتے کی رکاوٹ بن جاتی تو کہیں جہیز کا مطالبہ منہ پھاڑے کھڑا نظر آتا۔ اوپر سے ممانی کی دل دہلا دینے والی باتیں۔ ممانی کی محبت سر آنکھوں پر تھی لیکن کبھی کبھی اُسے ایسا لگتا کہ ممانی کا بس چلے تو کسی راہ گیر کو پکڑ کر اُس سے سویرا کا نکاح کروا دیں۔

ایک دن تو اُس نے اماں سے کہہ بھی دیا کہ اماں کیا سویرا ممانی پر بوجھ ہے۔ وہ پال رہی ہیں اسے کیا؟ آپ سے زیادہ وہ پریشان نظر آتی ہیں۔'' تو اماں نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

''نہیں بیٹا! ایسا نہیں سوچتے محبت کرتی ہیں۔ وہ تم دونوں سے بس اس لیے متفکر ہو جاتی ہیں۔''

'' تو اپنی بیٹی کے لیے رشتہ دیکھیں اس کے لیے بھی پریشان ہوں۔'' اس نے زچ کر کے کہا۔

'' وہ تو تمہاری عمر کی ہے اور پڑھ رہی ہے۔ بیٹا! کسی کے خلوص پر شک نہیں کرنا چاہیے۔'' اماں نے اُسی پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''اماں آج کل اتنی مثبت سوچ کون رکھتا ہے۔ سب کا کوئی نہ کوئی مفاد ہوتا ہے۔'' اس نے ایسے ہی جملہ پھینکا۔ مگر اماں اُسے بغور دیکھتے ہوئے بنا جواب دیے اٹھ گئیں۔ کیوں کہ انہوں نے کبھی کوئی منفی سوچ اپنے بچوں میں منتقل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور وہ اسی بات سے ڈر رہی تھیں کہ کہیں سویرا اور جویریہ میں لوگوں کے رویوں سے کوئی غلط سوچ پروان نہ چڑھ جائے۔

☆......☆......☆

آج بھی کسی کو آنا تھا۔ چھٹی کا دن تھا۔ سویرا ابھی تک سو رہی تھی۔ جویریہ اٹھ کر باہر آ گئی۔ ناشتا سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھی کہ ممانی حاضر ہو گئیں۔

'' سویرا کہاں ہے نظر نہیں آ رہی ہے۔'' انہوں نے اماں سے پوچھا۔

''سو رہی ہے۔ آج ہی کا دن تو ملتا ہے۔ نماز پڑھ کر سو گئی تھی۔''

'' ارے زبیدہ! لڑکیوں کا اتنا دن چڑھے سونا کوئی اچھے گر نہیں ہیں۔ دنیا سے نرالی جاب کر رہی ہے کیا؟'' انہیں پھر تنقید کرنے کا موقع مل گیا اور اُس کا دل چاہا کہ کہہ دے ہاں دنیا سے نرالی جاب کر رہی ہے، لیکن اماں نے مسکرا کر نظر انداز کر دیا تو وہ بھی خاموشی سے ممانی کے لیے چائے بنانے کے لیے اٹھ گئی۔

وہ جانتی تھی کہ اماں یہی کہیں گی کہ ایسی باتوں کا جواب نہیں دینا چاہیے۔ جو دوسرا بندہ محسوس کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔'' اماں کے فلسفے بھی اماں ہی سمجھ سکتی تھیں۔ وہ چائے لے کر آئی۔ ممانی کو دی اور خود اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ کیونکہ پھر پرانی رام کہانی شروع ہو چکی تھی۔

شام میں مہمان آئے۔ ان کے جانے کے بعد اماں ابا کافی مطمئن لگ رہے تھے۔ پتا چلا کہ ابا کے پرانے دوست ہیں۔ اپنے دوسرے نمبر والے بیٹے کے لیے لڑکی دیکھنے آئے تھے۔ سویرا ان کو کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی تھی کہ فوراً ہی رضامند ہو گئے۔ البتہ ابا نے سوچنے کا وقت لیا۔ تنویر بھائی بی کام تھے اور اسٹیل مل میں جاب کرتے تھے۔ سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک تھے۔ اس کو بھی اچھے لگے۔ چھان بین کے بعد رشتہ طے ہو گیا۔ اور چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی کہانی ہوئی۔

☆......☆......☆

شادی کے بعد سویرا خوش تھی۔ اماں ابا بھی خوش اور مطمئن تھے۔ اس کا رزلٹ آ چکا تھا۔ اب نے کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں ایڈمیشن لے لیا۔ ممانی کا آنا جانا کم ہو گیا تھا یا وہ مصروف ہو گئی تھیں۔ اس کی بہت کم ممانی سے ملاقات ہوتی۔ سویرا سے بھی ویک اینڈ پر ہی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ بھی اگر تنویر بھائی کی مرضی ہوتی تو کیونکہ طبیعت کے وہ ذرا سخت واقع ہوئے تھے۔ جس بات کو منع کر دیتے تو اُن کے والد بھی اس نہ کو ہاں میں بدلنے سے قاصر رہتے تھے۔ پھر سویرا کو تو ان کی زندگی کا حصہ بنے چھ مہینے ہی ہوئے تھے۔ مگر سویرا کافی سمجھداری سے

ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ کبھی نہ اپنی زیادہ
قابلیت کا اظہار کیا نہ بے جا ضد کی عورت شادی
کے بعد جتنی جلدی اپنی ضد اور انا کو قربان کرتی ہے
اتنی ہی دیرپا اس کو خوشگوار ازدواجی زندگی ملتی
ہے۔ بقول ممانی کہ لڑکی کی قابلیت کا تو اس کی
شادی کے بعد اس کی خوشگوار زندگی سے پتا چلتا ہے
اور وہ ممانی کے اس نظریے کی ہمیشہ تردید کرتی تھی
کہ خوشگوار زندگی کا تعلق ایک قابلیت سے نہیں
نصیب سے ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ اس کا تیسرا ایمسٹر
ختم ہو چکا تھا۔ وہ سویرا کے بیٹے عمیر کے ساتھ
کمرے میں کھیلنے میں مصروف تھی کہ سویرا نے ممانی
اور زوبیہ کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ عمیر کو سویرا
کے حوالے کر کے ممانی کو سلام کرنے آئی، تو ممانی
نے اُسے بہت محبت سے گلے لگایا زوبیہ اور منظر
بھائی بھی ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ جویریہ نے خوش ہو کر
انہیں دیکھا۔

''اوہو! آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔

''اب تم نہیں آؤ گی تو ہم کو تو آنا پڑے گا نا۔''
زوبیہ نے بھی شکوہ کیا کہ دو گلی چھوڑ کر گھر ہے یہ نہیں
کہ کبھی خیر خیریت لینے آ جایا کرو۔ تب اس نے
اپنی صفائی میں منظر کو بھی شامل کر لیا۔

''منظر بھائی آپ نے بھی فزکس میں ماسٹرز
کیا ہے تو آپ کو تو پتا ہونا چاہیے کہ یونیورسٹی لائف
کتنی سخت ہوتی ہے، ذرا وقت نہیں ملتا۔'' منظر
بھائی نے مسکراتے ہوئے اس کا ساتھ دیا۔

''ہاں، ہاں مجھے پتا ہے میں تو مذاق کر رہا تھا۔
صرف زوبیہ کا ساتھ دینے کے لیے۔'' جویریہ نے
زوبیہ کی طرف مڑ کر شکایتی نظروں سے گھورا۔
انجینئرنگ یونیورسٹی بھی میری یونیورسٹی کے ساتھ

تمہیں تو میری مصروفیات کا پتا ہونا
ہی ہے۔
چاہیے۔'' اور پھر دونوں مسکراتے ہوئے اماں اور
ممانی کو باتوں میں مصروف چھوڑ کر اپنے کمرے
میں آ گئیں۔ اماں نے ممانی کو کھانے پر روک لیا
تھا۔ چنانچہ وہ زوبیہ کو لے کر کچن میں آ گئی۔ سویرا
بھی سوئے ہوئے عمیر کو اپنی امی کے پاس لٹا کر ان
کی مدد کے لیے آ گئی۔

رات وہ سونے لیٹی تو سویرا نے اُس سے پوچھا۔

''تم کو پتا ہے جویریہ! ممانی آج کیوں آئی
تھیں۔'' اُس نے ہنستے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔

''بھئی پہلے تمہارے لیے فکرمند رہتی تھیں اب
میرے لیے فکرمند ہوں گی۔ اور کیا بس اگر فکرمند
نہیں ہوں گی تو اپنی بیٹی کے لیے نہیں ہوں گی۔''
سویرا نے فوراً ہی اُسے ٹوکا۔

چھوڑو میں سنجیدہ ہوں۔ وہ تمہارے لیے منظر
کا رشتہ لائی ہیں۔'' اس کی ہنسی پہلے حیرانی اور پھر
پریشانی میں تبدیل ہو گئی۔

''کیا کہہ رہی ہو سویرا۔ ابھی تو میرا گریجویشن
بھی مکمل نہیں ہوا ہے۔''

''اچھا......سویرا نے اچھا کو کھینچتے ہوئے مسکرا
کر اُسے دیکھا۔'' تو تم کو صرف گریجویشن مکمل
ہونے کی پریشانی ہے نا، منظر پر تو کوئی اعتراض
نہیں ہے۔'' سویرا کی بات پر وہ کچھ خفا سی ہو گئی۔

''دیکھو ایک تو یہ کام اماں ابا کا ہے کہ وہ ہاں کریں یا
نہ ان کی مرضی پر میں راضی ہوں۔ دوسرا یہ کہ میں نے تم
کو تنویر بھائی کا نام لے کر چھیڑا تھا، نہیں نا تو......''

''تو کیا۔'' سویرا نے غصہ سے اسے دیکھا۔

''تو......تو یہ کہ تم چھیڑ سکتی ہو۔'' اس نے مسکرا
کر کہا۔ سویرا کو بھی ہنسی آ گئی اور وہ مطمئن سی لیٹ
گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ زیادہ پڑھ کر اماں کو
رشتوں کے لیے پریشان ہوتے اور پھر اپنی

امیدوں سے کم رشتے پر بخوشی رضامند ہو کر اپنے ہی خوابوں پر ان کو روتا دیکھے۔ بس یہ یقین تھا کہ علم رب نے جتنا اس کے مقدر میں لکھ دیا ہے۔ وہ ہر صورت میں اس کو مل جائے گا اور علم کا مقصد اپنی آئندہ زندگی کو عقل وشعور کو کام میں لاتے ہوئے آسان بنانا ہے اور صحیح راستے پر رکھنا ہے نہ کہ اندھی دوڑ میں شامل ہو کر اپنے لیے پریشانی مول لے لی جائے۔

اماں کی صلح جو طبیعت اور اپنی چادر میں رہتے ہوئے اپنی خواہشات کو پابند رکھنے کی عادت دونوں میں فطری طور پر منتقل ہوئی تھی۔ وہ اس لحاظ سے مطمئن بھی تھی کہ اماں ابا سے دو گلی کے فاصلے پر ہی جانا ہے۔

☆......☆......☆

شادی اماں ابا نے سادہ طریقے سے اپنی گنجائش کے مطابق ہی کی تھی۔ نہ ماموں ممانی میں کوئی دکھاوا تھا اور نہ منظر میں۔ وہ خوش تھی۔ زوبیہ کی اپنی مصروفیات تھیں۔ لیکن اب وہ کزن سے زیادہ اس کی اکلوتی نند تھی اور رشتے میں چھوٹی ہونے کی وجہ سے جویریہ کا رتبہ اس سے بڑھ گیا تھا۔

رشتے بدلنے کے ساتھ خیالات کا بدلنا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ ہر رشتے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ تقاضے جتنی سمجھداری اور سچائی سے پورے کیے جائیں اتنے ہی پائیدار رشتے قائم ہوتے ہیں لیکن اس کا بنیادی پہلو برداشت ہے۔ وہ بھی پوری خلوص نیت سے سارے رشتے نبھانے کی کوشش کررہی تھی۔

زوبیہ کی انجینئرنگ مکمل ہونے تک وہ ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھی لیکن اپنی شادی کے بعد ہر دن اُسے صرف اس بات پر حیرت ہوتی کہ اُسے اور سویرا کو سستی پر، زیادہ پڑھنے لکھنے پر طعنے دینے والی ممانی نے ایک دن بھی زوبیہ کو دن چڑھے سونے پر، کام نا کرنے پر یا کسی کے گھر نہ جانے پر بھی کونہ کسی یا سسرال میں باتیں سننے کا طعنہ نہیں دیا۔ اور نہ ہی اُس کی شادی کے لیے کسی لمحہ فکرمندی دکھائی دیں۔

اُس دن بھی وہ زوبیہ کو بارہ بجے اٹھا کر آئی تو ناشتا دیتے ہوئے مذاق سے کہنے لگیں۔

''اب روٹین کی زندگی پر واپس آجاؤ۔ اتنی، اتنی دیر تک سونا چھوڑ دو۔ ذرا گھرداری کی طرف بھی دھیان دو۔ کہیں دولہا بھائی سے تمہارا قصیدہ سننے کو نہ ملے۔'' اُس نے تو یہ بات شرارتاً کہی تھی، لیکن ممانی کو نجانے کیوں بہت برا لگا فوراً کہنے لگیں۔

''شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتے ہیں اتنی مشکل پڑھائی پڑھ رہی ہے میری بیٹی۔ تم نے پڑھی ہوتی تو تم کو بھی پتا چلتا۔''

اور وہ دُکھ سے سوچ کے رہ گئی کہ کاش ممانی آپ نے روز روز آکر اور اماں کو ہم لوگوں کی شادی کے بارے میں دہلا دہلا کر پریشان نہ کیا ہوتا تو شاید اس سے کہیں زیادہ اچھا بھی پڑھ لیتے اور اتنے نخرے بھی نہ ہوتے۔''

☆......☆......☆

ممانی پر اب وہی وقت آچکا تھا۔ جس کے لیے وہ اماں کو دہلاتی رہتی تھیں۔ زوبیہ کے رشتے آرہے تھے لیکن ممانی حقیقتوں سے نظریں چرا کر اس بات پر مصر تھیں کہ لڑکا ڈاکٹر یا انجینئر ہو۔ ہم اپنی اتنی قابل بیٹی کو ایسے ہی تھوڑی پھینک دیں گے۔

یعنی باقی ماں باپ جو اپنی بیٹیوں کی شادی کرتے ہیں۔ ان کو اپنی بچیوں سے محبت نہیں ہوتی۔ وہ شادی نہیں کرتے بلکہ پھینک دیتے ہیں۔ وہ بھول رہی تھیں کہ وہ بھی متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن ان کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے لیے الگ اور دوسروں کے لیے زندگی گزارنے کے پیمانے الگ رکھتے ہیں۔

زوبیہ کی عمر جب تیس سے کراس کرگئی، تو اللہ اللہ کر کے ممانی کو ایک رشتہ پسند آ ہی گیا اور انہوں نے اپنی انا اور ارمانوں کا سودا لڑکے کی عمر کے ساتھ کر دیا۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ تیس بتیس سال میں تو زیادہ عمر کا رشتہ آ بھی رہا ہے۔ اس کے بعد تو طلاق یافتہ یا دوسری شادی کے خواہش مند حضرات کے رشتے آنا شروع ہو جائیں گے۔

زوبیہ افتخار بھائی کے ساتھ بیاہ کر دوبئ چلی گئی۔ سلال کے بعد حمنہ اور زویا کی پیدائش نے اُس کو بھی مصروف کر دیا تھا۔ زوبیہ کے یہاں سمیرا کی پیدائش پر ممانی کی پریشانی دیدنی تھی۔ ایک تو شادی کے تین سال بعد یہ خوشخبری سننے کا موقع ملا تھا اور وہ تھی بھی دور۔ جب تک خیریت کی اطلاع نہیں آ گئی۔ ممانی پریشانی کے عالم میں کسی سے بات ہی نہیں کر پا رہی تھیں۔ ارے نہیں لگ رہا تھا یہ وہی ممانی ہیں جو سلال کی پیدائش کے وقت اماں کے پریشان ہونے پر کہہ رہی تھیں کہ زبیدہ بلا وجہ پریشان ہو رہی ہو۔ وہ دنیا سے نرالی ماں بننے نہیں جا رہی ہے۔'' اور اماں اپنے پریشان ہونے پر بھی شرمندہ سی ہو گئی تھیں۔

☆......☆......☆

زوبیہ سمیرا کی پیدائش کے بعد جب پہلی دفعہ رہنے آئی تو اس نے محبت اور مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بیٹی اس کی تھی بھی بہت پیاری۔ سارا دن اُس کے بچوں کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ اپنی ماں کو تو بالکل تنگ نہیں کرتی تھی۔

اس دن اماں کے ساتھ ممانی کی کوئی رشتہ دار زوبیہ کے دبئی سے آنے کا سن کر ملنے آئی ہوئی تھیں۔ وہ کھانے کی تیاری میں لگی ہوتی تھی۔ کچھ دیر کے لیے اُن کے درمیان آ کر بیٹھ گئی کہ برا نہ مانیں۔ آنٹی زوبیہ سے پوچھ رہی تھیں کہ تمہارے میاں جی تو ڈاکٹر ہیں۔ مصروف رہتے ہوں گے۔ تم فارغ ہوتی ہو تو کوئی جاب کیوں نہیں کر لیتیں۔''

زوبیہ نے اِٹھلا کر کہا۔

''فی الحال تو افتخار کی سخت ہدایت ہے کہ جب تک سمیرا بڑی نہ ہو جائے تم کو جاب وغیرہ نہیں کرنی۔ ویسے بھی اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ صرف شاپنگ کرو اور سمیرا کا خیال رکھو۔ اور پھر میاں جی بھی صبح کے گئے رات گئے گھر آتے ہیں۔ ڈاکٹر ہیں کسی بھی وقت ایمرجنسی کال آ جاتی ہے۔ نہ دن اپنے ہیں نہ رات۔ بس گھر داری کر رہی ہوں۔

ممانی کے چہرے پر اپنی بچی اور اس کی نظر نہ آنے والی مصروف زندگی پر ملال کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ جیسے بڑی مظلوم زندگی گزار رہی ہے۔ آنٹی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''تو کیا فائدہ ہوا تمہارا انجینئرنگ پڑھنے کا جب گھر داری ہی کرنی تھی تو۔ پڑھ پڑھ کر حال بھی خراب کیا۔ پھر موزوں رشتے کے انتظار میں اتنے جواں سال برباد ہوئے اور کر وہی گھر داری رہی ہو۔ افتخار بھی ننھا تو نہیں ہے۔ پینتالیس سال سے کم کا تو شادی کے وقت بھی نہیں لگتا تھا کیوں؟ زبیدہ۔

آنٹی نے سارے ہی جلے دل کے پھپھولے ایک ساتھ پھوڑ دیے۔ اور حمایت کے لیے پوچھا بھی تو اماں نے گڑبڑا کر جویریہ کو دیکھا جو ممانی کی بدلتی رنگت سے نظریں چرا رہی تھی۔ جہاں ملال کے ساتھ ساتھ پشیمانی کے تاثرات بھی نمایاں ہو گئے تھے۔ آج ان کو حقیقت کے آئینے میں اپنا عکس صاف نظر آ گیا تھا کہ دوسروں کی بیٹیوں کو محبت کا فریب دے کر ان کو منزلوں اور خوابوں سے ہٹا کر وہ حقیقتاً اُن کی زندگی بنا گئی تھیں، لیکن اپنی بیٹی کو منزلیں اور خواب دے کر بھی فریب دے گئی تھیں۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

لمحوں نے خطا کی تھی

''کس کا فون ہے کال کاٹ کیوں دی۔'' لبنیٰ نے درشتی سے کہا۔ اب اُسے غصہ آرہا تھا۔ امن کا رویہ اُسے مشتعل کررہا تھا۔ امن عجیب 'چوروں' جیسی حرکتیں کررہی تھی۔ تبھی کال دوبارہ آنے لگی۔ امن پک نہیں کررہی تھی۔ لبنیٰ نے امن کے ہاتھ سے......

اُس دوشیزہ کی کتھا، جس کی ایک لمحے کی خطا نے اُس کی ساری زندگی کو مجسم خطا بنا ڈالا تھا **پانچویں کڑی**

فاخرہ ہوسپٹل میں ہی تھی اور صبا مسلسل رابطے میں تھی جب وہ لوگ پہنچے تو سیدھے ہوسپٹل ہی آگئے تھے۔ نیہات تھوڑی دیر بیٹھ کر ضویا کو ساتھ لے کر چلا گیا صغریٰ فاخرہ کے پاس ہی تھی، صبا دادو کے متعلق فاخرہ سے پوچھتی رہی۔ پھر تقریب کی باتیں بتاتی رہی۔ فرقان والی ساری بات صبا نے فاخرہ کو بتائی۔ فاخرہ کبھی رونے لگتی کبھی مسکراتی مگر آنسو بھری آنکھوں سے۔

''ماما چاچو نے مجھے گولڈ کا سیٹ گفٹ کیا۔'' صبا خوش تھی بے تحاشا خوش۔

''ماما مجھے چیزوں کی حرص نہیں ہے آپ جانتی ہیں مگر......''

''مگر کیا۔''

''مجھے اتنے بڑے مجمع میں کسی نے سراہا۔ وہ جو میرا اپنا تھا، میرا خون کا رشتہ، میرا چاچو۔ اتنا سکون تھا جب انہوں نے مجھے گلے لگایا۔ مجھے پیار کیا۔ وہ لحات بہت قیمتی تھے صبا زمان کی زندگی کے انمول لحات۔''

صبا جیسے ابھی تک انہی لمحوں کی دلکشی میں کھوئی ہوئی تھی دور کہیں، جہاں وہ کسی اپنے کے سینے میں سمائی تھی۔ کسی بہت اپنے نے اُسے اپنائیت سے اپنایا تھا، اس کی آنکھوں میں جیسے کسی نے مٹھی بھر جگنو بھر دیے تھے۔ صبا کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں، گال تمتا رہے تھے۔

فاخرہ کیا کہتی بس خوش تھی۔ فاخرہ کب چاہتی تھی کہ اُس کی اولاد اپنوں سے دور رہے۔ وہ تو خود دل سے چاہتی تھی کہ ایسا کوئی جادو ہو کہ وہ سب پر پھونکے اور اُس کے بچے اپنے کھوئے ہوئے رشتے پالیں۔

یہ ساری بات چیت ہورہی تھی کہ بشیراں ناشتا لے کر ہوسپٹل آگئی۔ سب نے مل کر ناشتہ کیا۔ فاخرہ نے بشیراں کو بھی بتایا کہ فرقان لبنیٰ اور اُس کے بچے صبا سے ملے ہیں اور فرقان بہت شرمندہ ہے۔ صبا سے معافی بھی مانگ رہا تھا۔ بشیراں کی آنکھوں میں

خوشگوار حیرت تھی۔

فرقان کا ارادہ تھا کہ بہاول پور پہنچتے ہی زمان بھائی کے گھر اماں کی خیریت پوچھنے جائے گا مگر طویل سفر کی تکان نے جیسے جوڑ جوڑ ہلا دیا۔ گھر آتے ہی اُسے کچھ ہوش نہیں رہا، وہ بے سدھ سو گیا۔ نہانے کا، فریش ہونے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ کچھ رحمان سے ہونے والی بدمزگی نے جیسے فرقان کو نڈھال و پژمردہ کر دیا تھا۔

گھر مٹی سے اٹا پڑا تھا لبنیٰ کا بھی مارے تھکن کے برا حال تھا۔ مگر اُسے مٹی اور جا بجا بکھرے پتے، کاغذ اور الم غلم سے وحشت ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کوئی آندھی آئی تھی پیچھے، جس وجہ سے گلی سے گند بلا، گرد و غبار اُڑ اُڑ کر گھر میں بکھر گیا تھا۔ لبنیٰ کو اُلجھن ہو رہی تھی۔

اُسے زوروں کی نیند آ رہی تھی مگر وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر وہ گھر ایسے ہی گندا سندا چھوڑ کر سو بھی گئی تو پہلی بات کہ وہ سو نہیں سکے گی دوسرا وہ پُرسکون نیند نہیں سو سکے گی۔ اس لیے لبنیٰ نے پائپ لگا کر اپنے پائنچے اُڑس لیے اور گھر دھونے لگی۔ اُس نے دل لگا کر، گھر دھویا، واش روم دھوئے تب تک اُس کا اپنا حلیہ بگڑ چکا تھا۔

لبنیٰ الماری سے اپنے کپڑے لینے گئی دروازہ نیم وا تھا اور اندر سے دبی دبی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ لبنیٰ چونکی، امن تھی اندر، لبنیٰ کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔

''امن تم رو کیوں رہی ہو۔'' لبنیٰ نے عجلت میں دروازہ کھولا تو امن ٹپٹا گئی۔ وہ فون پر بات کر رہی تھی اور رو رہی تھی مگر کیوں...... امن نے بوکھلا کر کال ڈسکنکٹ کر دی۔

''نن...... نہیں، رو تو نہیں رہی۔'' امن نے بدحواسی میں آنسو صاف کیے۔

''امن سب ٹھیک تو ہے نا بیٹا، کس کا فون تھا، میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔'' لبنیٰ کا رنگ فق ہو گیا۔ دل بہت سے خدشات سمیٹ لایا۔ وہم آ کر دل کے کناروں سے لپٹنے لگے۔

''جی مما......'' امن خشک لبوں پر زبان پھیرنے لگی۔ اُس کی حرکات و سکنات مشکوک سی تھیں۔ تبھی امن کے سیل پر 'کملی' کی تانیں بکھرنے لگیں امن نے کال کاٹ دی۔

''کس کا فون ہے کال کاٹ کیوں دی۔'' لبنیٰ نے درشتی سے کہا۔ اب اُسے غصہ آ رہا تھا۔ امن کا رویہ اُسے مشتعل کر رہا تھا۔ امن عجیب 'چوروں' جیسی حرکتیں کر رہی تھی۔ تبھی کال دوبارہ آنے لگی۔ امن پک نہیں کر رہی تھی۔ لبنیٰ نے امن کے ہاتھ سے سیل فون جھپٹ لیا۔ کال او کے کر کے سیل فون کان سے لگایا مگر بولی کچھ نہیں۔

''ہیلو جان، ناراض مت ہو میں مصروف تھا۔ رابطہ نہیں کر سکا سوری نا۔'' سجاد بلوچ بول رہا تھا اور لبنیٰ کو لگ رہا تھا کہ اُس کے بدن سے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہے۔ وہ وہیں دیوار سے لگتی گھسٹتی ہوئی فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ لبنیٰ کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سیل فون نیچے گر پڑا تھا۔

''مما کیا ہوا، مما......'' امن حواس باختہ سی لبنیٰ کو پکارتی رہی مگر وہ کوئی جواب نہیں دے رہی تھی۔ امن سراسیمہ سی گھبراہٹ کے مارے روئے جا رہی تھی۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی، امن کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ سجاد کی بار بار کال آ رہی تھی۔ امن نے فون ہی بند کر دیا۔

''بابا...... بابا...... مما کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔'' امن کو کچھ اور نہیں سوجھا تو دوسرے کمرے میں سوئے ہوئے فرقان کو جگا دیا۔ فرقان کی تو جان پر بن آئی۔ وہ لبنیٰ کے پاس آیا، وہ بے سدھ پڑی تھی۔ فرقان

نے پانی کے چھینٹے لبنیٰ کے چہرے پر مارے۔ لبنیٰ نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں پھر بند کرلیں۔ فرقان نے سہارا دے کر لبنیٰ کو فرش سے اٹھایا اور بیڈ پر ذرا سا بٹھا کر پانی پلایا تو لبنیٰ کی جان میں جان آئی۔ فرقان نے اِسے بیڈ پر لٹا دیا اور فرقان بی پی آپریٹر اٹھا لایا اور لبنیٰ کا بی پی چیک کرنے لگا وہ فکر مند تھا۔

''بی پی بہت لو ہے، اپنی مما کی میڈیسن اٹھالو۔'' پاس کھڑی امن سے کہا تو وہ بھاگ کر دوا اٹھالائی۔ فرقان نے لبنیٰ کو خود دوا کھلائی، امن چور سی بنی کھڑی تھی لرزیدہ سی۔

''بیٹا تم کہاں تھیں۔ جب تمہاری مما گریں۔'' فرقان نے امن سے پوچھا تو اُس سے بروقت کوئی جواب نہیں بن پایا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔ لبنیٰ نے امن پر نظر ڈالی...... وہ کیسی نظر تھی سلگتی سی چبھتی ہوئی، جس میں شکایت کی لپک تھی۔ امن بے ساختہ نظریں چرانے لگی۔

''امن ایسی لاپروائی ٹھیک نہیں بیٹا۔ اپنی مما کا خیال رکھا کرو۔ وہ تھک جاتی ہے۔ ہاتھ بٹایا کرو۔ بیٹیوں کو ماؤں کی تھکن بانٹ لینی چاہیے۔ وہ آتے ہی کام میں لگ گئی۔ تھک کر ایسا ہوا ہوگا۔''

لبنیٰ کا ذہن غنودگی میں جارہا تھا پھر فرقان تب تک وہیں بیٹھا رہا جب تک لبنیٰ سو نہیں گئی۔

امن نے بیگ سے کپڑے نکال نکال کر الماری میں رکھے۔ خالی بیگ کو الماری کے اوپری خانے میں رکھا۔ ہنزلا و حذیفہ بھی سو رہے تھے کچھ کھائے بے بنا سو گئے تھے۔ ناشتا نہیں کیا تھا۔ اب امن سوچ میں غلطاں کہ کیا کرے ناشتا بنائے کہ کھانا۔

''بابا ناشتا بناؤں۔'' فرقان ابھی تک لبنیٰ کے پاس متفکر سا بیٹھا ہوا تھا۔

''نہیں بیٹا، بہت وقت لگ جائے گا۔ اماں کی تیمارداری کے لیے جانا ہے۔ ناشتا میں بازار سے لے آتا ہوں، تم اپنی مما کا خیال رکھنا۔'' فرقان نے اپنے والٹ کو کھول کر پیسے دیکھے اور بازار چلا گیا۔

امن شرمندہ شرمندہ سی لبنیٰ کے پاس بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھیں بھرآئیں۔ آنسو گالوں پر لڑھک آئے۔ وہ نادم تھی۔ اُس کا دل کٹ رہا تھا۔ وہ اپنی ناک اور آنکھیں مسلے جارہی تھی۔

فرقان نان چھولے لے آیا تھا۔ دودھ کے ڈبے بھی ساتھ لایا تھا چائے بنانے کے لیے۔

فرقان اور امن نے مل کر ناشتا کیا مگر بے دلی سے، امن کچن میں چائے بنانے گئی، مگر فرقان کے رونے کی آواز سن کر ساس پین اُس کے ہاتھ سے گر گیا، چینی پتی بکھر گئی۔

''اماں مرگئی میری اماں مرگئی۔ مجھے معافی مانگنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ او میرے اللہ! مجھے معافی مانگنے کا موقع نہیں ملا۔ میں بہت بدقسمت انسان ہوں۔ اپنے گناہوں کی معافی نہیں مانگ سکا۔ اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا نہیں کرسکا۔ اپنی خطاؤں کا ازالہ نہیں کرپایا۔ مجھے معافی مانگنی تھی۔ مجھے مداوا کرنا تھا۔'' فرقان دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ پچھتاووں کے ناگ اُسے ڈس رہے تھے۔

ہنزلا، حذیفہ اور لبنیٰ جاگ گئے تھے۔ فرقان کیسے پچھاڑیں کھا کھا کر رو رہا تھا۔ کھونے پر رو رہا تھا یا ماں کے ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو جانے پر رو رہا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا کوئی اُس کے منہ پر تھپڑ مار رہا تھا کسی نے اُسے بہت بلندی سے نیچے پاتال میں دھکا دے دیا ہو۔

لبنیٰ بھی آنسو بہا رہی تھی مگر اُس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ سکے۔ بچے اپنے ماں باپ کو دیکھ کر رو رہے تھے۔ جب کوئی زندہ ہوتا ہے ہم پروا نہیں کرتے، پھر اب پچھتائے کیا ہوت جب

چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اب کوئی لاکھ واویلا مچائے جانے والے چلے گئے سب درد جھیل کر۔

☆......☆......☆

فرقان رحمان کی باتوں میں آ کر اپنے بھائی سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ جب بھی کسی بات پر فاخرہ کو زدوکوب کرنا ہوتا، ذلیل کرنا ہوتا۔ رحمان فرقان کو اشارہ کرتا فرقان بغیر سوچے سمجھے رحمان کا ہم نوا بن جاتا۔

فرقان لبنیٰ کو ساتھ نہیں لایا تھا، امن اور حنزلا حذیفہ کو وہ ساتھ لے آیا تھا۔ سفید چادر میں لپٹا وجود کسی غیر کا نہیں اُس کی ماں کا تھا۔ پیدا کرنے والی ماں کا۔ فرقان چارپائی سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ بہت سا وقت گزر گیا۔

''چاچو...... بابا......'' صبا پاس کھڑی تھی۔ زمان کو سہارا دیے کھڑی تھی۔ دونوں بھائی گلے مل کر رونے لگے۔ روتے رہے، صبا، فضا، اسد اور اسوہ بھی باری باری سب سے مل کر روتے رہے تھے۔

فاخرہ سفید دوپٹا اوڑھے آنسو بہا رہی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگائے وہ آج بھی اتنی ہی خاموش اور سوبر لگ رہی تھی جیسی ہمیشہ سے تھی۔ فرقان نے نظریں جھکا کر بیٹھی فاخرہ کو دیکھا۔

رحمان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ فرقان زمان کو ساتھ لیے باہر نکلا اور گلی میں بچھی دریوں پر فرقان کو بٹھایا۔ لوگ اکٹھے ہو رہے تھے، جنازے کا پوچھ رہے تھے۔ فرقان نے نیہات کو دوسری بار دیکھا تھا۔ وہ ہر کام میں آگے آگے تھا۔ سلجھا ہوا کم گو سا لڑکا۔ وہ منفرد تھا آج کل کے لڑکوں سے، ذمہ داری کا احساس کرنے والا۔

رحمان آ گیا تھا اور اُس نے آتے ہی ایسی دھما چوکڑی مچائی کہ حد نہیں، دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے اماں کا مردہ وجود اٹھایا اور اپنے گھر لے گیا۔ فاخرہ کے بدن میں جنبش بھی نہیں ہوئی تھی۔ زمان رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔ اُس کے بچے اُس کے اطراف گھیرا ڈال کر بیٹھے تھے۔ زمان ماں کے بہت قریب تھا، شخصی طور پر بہت کمزور قوتِ ارادی کا مالک تھا۔ اپنی بیوی کے بارے جو بھائیوں اور ماں نے کہہ دیا زمان نے مان لیا۔ اب وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

فرقان نے فاخرہ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور چلا گیا جنازے میں شرکت کے لیے تو جانا ہی تھا ورنہ اُسے رحمان پر بہت غصہ تھا مگر اُس نے اپنے ضبط کو آزما کر خود پر کنٹرول رکھا۔ ماں کی خدمت تو کر نہ سکے اب وہ اپنی ماں کی میت خراب کر کے تماشا بنانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ میت صرف قبر کی ملکیت ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

لبنیٰ اور فرقان رحمان کے گھر جاتے رہے، جنازے پر، قل خوانی پر، مگر اُن سب کے منہ پھولے ہوئے تھے۔ کسی نے بھی ڈھنگ سے بات نہیں کی تھی۔ رحمان اور عائشہ کا رویہ تو اتنی بے گانگی اور اجنبیت لیے ہوئے تھا کہ حد نہیں۔ فاخرہ اور اُس کے بچوں میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔

فرقان اور لبنیٰ اُداس اور دلگرفتہ سے تھے۔ لبنیٰ نے امن سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ پوچھنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ اماں کی موت نے حواس معطل کر ڈالے تھے۔ اوپر سے رحمان کی بے اعتنائی و بے رخی۔

فرقان دل سے شرمندہ تھا اور فاخرہ سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ خدا نے اُسے بروقت نہ سہی دیر سے ہی سہی بالآخر ہدایت کا راستہ دکھا تو دیا تھا نا، اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے وہ اپنے بھتیجے بھتیجیوں کے سر پر دستِ شفقت رکھنا چاہتا تھا اور اُس کی دلی تمنا تھی کہ

فاخرہ اُسے معاف کردے۔

لبنیٰ کچن کی تفصیلی صفائی کررہی تھی۔ مسالا جات کے ڈبے بکھرے ہوئے تھے، وہ ہر ڈبہ دھودھو کر خشک کررہی تھی۔ تبھی فرقان کی بائیک رکنے کی آواز آئی۔ لبنیٰ نے کچن سے جھانک کر دیکھنا چاہا کہ واقعی فرقان ہی ہے۔ فرقان اِدھر اُدھر جھانکتا آوازیں لگاتا کچن میں ہی آ گیا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام!'' لبنیٰ نے استفہامیہ انداز میں فرقان کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر نا قابلِ فہم قسم کی تاثرات تھے۔

''مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' فرقان نے لبنیٰ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ باہر لے آیا۔

''جی۔''

''تمہارا دل نہیں کرتا فاخرہ سے ملنے کو۔''

''آپ لوگوں نے ہی تو مجھے منع کیا تھا۔''

''لبنیٰ میں فاخرہ سے ہاتھ جوڑ کر، پاؤں پکڑ کر معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں بہت شرمسار ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو میری سفارش کروگی تو وہ مجھے ضرور معاف کردے گی۔''

فرقان ملتجی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اُس کا دل پسیج گیا تھا اُس کے دل میں پڑی ساری گرہیں خدا نے اپنی رحمت سے ایک ایک کرکے کھول دی تھیں۔ ساری بدگمانیاں خود بخود دھل گئی تھیں۔

''فاخرہ بہت بڑے دل والی ہے۔ اعلیٰ ظرف، وہ معاف کردے گی، مجھے یقین ہے۔ میں ساتھ چلتی ہوں مگر پہلے دو نفل شکرانے کے ادا کرلوں اُس مالک دوجہاں کے سامنے جس نے آپ کی رہنمائی فرمائی اور آپ کے دل سے ساری کثافتیں دھل گئیں۔''

☆......☆......☆

آج کل پولیس والے بہت متحرک تھے۔ بہت سارے مجرم انہوں نے پکڑ لیے تھے اور اُن مجرموں نے اقرارِ جرم بھی کرلیا تھا کہ شہر سے بچے انہوں نے اغواء کیے ہیں۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ وہ بچوں کو اغواء کرکے آگے بیچ دیتے ہیں۔ خریدنے والے اُن بچوں کا کیا کرتے ہیں ہمیں خبر نہیں۔ پولیس نے اُن مجرموں کے ساتھ وہاں وہاں چھاپے مارے جہاں جہاں وہ بچے فروخت کرنے جاتے تھے۔ مگر پولیس والوں کو ناکام لوٹنا پڑا۔ اُن کے ہاتھ کوئی بھی قابلِ ذکر ثبوت نہیں لگ پایا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ بچوں کے اغواء کی وارداتوں میں کمی ہوتے ہوتے یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ شہر میں پہلے کی سی امن کی فضا قائم ہوگئی۔ شہریوں کی زندگی پُرسکون ہوگئی۔ لوگ خوف کے حصار سے نکل آئے مگر جن کے بچے اور عورتیں غائب تھے اُن کو کسی پل قرار نہیں تھا وہ ہر تیسرے دن تھانے پہنچ جاتے تھے۔

اس کے ہاتھ میں مقامی اخبار تھا۔ وہ سرسری سا دیکھ رہی تھی۔ تبھی اُس کے دل میں خیال آیا بابا اور مما آنٹی فاخرہ کے گھر گئے ہیں کیوں نہ سجاد کو کال کروں۔ اُس نے اپنا سیل فون الماری سے نکال کر آن کیا اور چھت پر چلی آئی۔ اُس نے سجاد بلوچ کا نمبر ملایا۔ نمبر بزی جارہا تھا۔ اُس نے دس منٹ انتظار کیا پھر کال کی نمبر پھر بزی تھا۔ امن کو بہت کوفت ہوئی وقت کم تھا۔ وہ انتظار کرنے لگی ٹھیک پینتالیس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد اُس کا نمبر فری ہوا تھا۔

''ہیلو سجاد۔''

''آ گیا خیال، اتنے دن سے نمبر آف کیا ہوا ہے۔'' وہ پھاڑ کھانے کو دوڑا۔

''دادی فوت ہوگئی تھی، مما کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

''بتا نہیں سکتی تھی، میں اتنا پریشان رہا۔'' وہ اب

کچھ مدھم پڑ گیا۔ اُسے اپنے لہجے کی تندی کا اندازہ ہو گیا تھا اس لیے نرم پڑ گیا۔

"میری مما کو ہم دونوں کے تعلق کا پتا چل گیا ہے۔ انہوں نے اُس دن مجھے روتے دیکھ لیا تھا، جب تم نے پھر کال کی میں نے کاٹ دی تم نے پھر کی تو مما نے پک کرلی۔ انہوں نے تمہاری باتیں سنیں تو اُن کا بی پی لو ہو گیا تھا بہت، اسی لیے میں نے سیل آف کر دیا تھا۔ میں ناراض نہیں تھی پھر اُسی دن دادی کا انتقال ہو گیا۔" وہ ساری تفصیل بتاتی چلی گئی۔

"تمہاری مما نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں۔"

"نہیں ابھی تو کچھ نہیں کہا، کیونکہ دادی کی ڈیتھ ہو گئی تو ماحول سوگوار ہو گیا، خاموش سی ہیں مما۔"

"تم پریشان نہیں ہونا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔" سجاد نے نہایت محبت و لگاوٹ سے کہا۔ امن رونے لگی۔ سجاد کو اُلجھن ہو رہی تھی۔ اسے ہر وقت روتی بسورتی لڑکیاں بہت چیپ لگتی تھیں، احمق اور جذباتی۔ مگر اس وقت امن کو چپ تو کروانا تھا، پھر وہ اُسے بہلاتا رہا، مطمئن کرتا رہا، اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُس کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتا رہا۔

"ریلیکس جان، اچھا ایسا کرو کل میں تمہیں کالج سے اٹھاتا ہوں، ایک بھی کلاس مت لینا، بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں، دیکھو انکار مت کرنا۔"

"مگر سجاد......" وہ ہچکچائی وہ ملنا نہیں چاہتی تھی اور ایسے حالات میں تو قطعاً نہیں۔

"پلیز جان۔" وہ اک جذب سے التجا کر رہا تھا۔

"او کے۔"

"بائے...... ملتے ہیں کل۔"

☆......☆......☆

لبنیٰ اور فاخرہ ایک دوسرے سے لپٹی نجانے کون کون سے دکھ رو رہی تھیں۔ کس کس دکھ کے آنسو اُن کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ کون جانے رنج و الم کی کیا کیفیت تھی۔

صبا بہت خوش تھی وہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔ زمان کی بے نور آنکھیں بھی مارے خوشی کے چمک اٹھی تھیں۔ صبا نے چائے سب کو سرو کی اور پھر فرقان سے جڑ کر بیٹھ گئی۔ سب اُن کے گھر آئے تھے تو صبا کو بہت اچھا لگا تھا۔ فاخرہ اور لبنیٰ اب ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وفورِ جذبات سے ایک دوسرے کو دیکھے جا رہی تھیں۔ جیسے برسوں کی پیاس بجھا رہی ہوں۔ وقت کیسے بدل گیا تھا۔ کہاں تو وہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کو ترستی تھیں اور اب اللہ نے کیسا کرم کر دیا تھا کہ فرقان خود لبنیٰ کو اُس کے گھر لے کر آیا تھا۔ اللہ نے فرقان کے دل میں رحم ڈال دیا تھا اور وہ پلٹ گیا تھا۔ فاخرہ اور اُس کی اولاد کی طرف۔ یہ اچھا قدم تھا۔ دل خوشی سے لبریز تھا۔

"فاخرہ میری بہن، میں تمہارا گنہگار ہوں۔ میں نے تمہاری بہت حق تلفی کی۔ تمہارا دل دکھایا۔ مجھے معاف کر دو۔" فرقان نے نیچے بیٹھ کر سر، جھکا کر فاخرہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ انگشت بدنداں اُسے دیکھ کر رہ گئی۔ فاخرہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہے بس فرقان کے اس اقدام کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار نہیں تھی اسی لیے ششدر سی بھونچکی رہ گئی۔

"ایسے مت کہیں فرقان بھائی۔" لفظ ٹوٹ پھوٹ گئے ایک عرصہ ہو گیا تھا لفظ 'بھائی' کو فاخرہ کے لبوں نے نہیں چھوا تھا۔ اب اُسے تامل سے کام تو لینا ہی تھا، زمان نے لڑکھڑاتا تو تھا ہی۔"

"فاخرہ مجھے 'خدا' کے لیے معاف کر دو۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا۔" فرقان رو دیا۔

"پلیز...... میں ناراض نہیں ہوں اور آپ نے میرے ساتھ کچھ برا نہیں کیا۔" فاخرہ نے فرقان کے جڑے ہوئے کپکپاتے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ 'لفظ خدا کے لیے' نے فاخرہ کو اندر سے ہلا ڈالا تھا۔ جب فرقان نے خدا کا واسطہ ہی دے دیا تو باقی کیا بچا تھا۔ فاخرہ اب تک اللہ کی رضا کے لیے ہی تو 'بھلائی' کرتی آئی تھی ورنہ عام انسان کا دل کہاں اُن لوگوں کے ساتھ بھلائی پہ مائل ہوتا ہے جنہوں نے 'برا' کیا ہوتا ہے۔

"میں نے برا کیا یا نہیں مگر برائی کا آنکھیں بند کر کے ساتھ دیتا رہا۔ کیا میں اندھا تھا مجھے نظر نہیں آتا تھا جو میں رحمان کی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ کیا میرا دماغ کام کرنے کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا جو میں گدھوں کی طرح رحمان کی پیروی کرتا رہا۔ اُس کا ساتھ دیتا رہا۔ ظالم کا ساتھ دینے والا، اُس کی ہاں میں ہاں ملانے والا بھی ظالم ہی ہوتا ہے۔ فاخرہ میں نے جب جب تم سے بدتمیزی کی مجھے بڑا بھائی سمجھ کر معاف کر دو۔ تم میرے بڑے بھائی کی بیوی ہو۔ مجھے تمہاری بے ادبی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" وہ خود کو کوس رہا تھا۔ اپنا محاسبہ کر رہا تھا۔

"زندگی سے بڑی بے ادبی تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میری تو پوری زندگی گزر گئی کچھ گزر جائے گی۔ آپ صبا سے ملے، اُس کی تعریف کی اُسے تحفہ دیا۔ میں نے صبا کی آنکھوں میں خوشی دیکھی، اُس نے فخر و انبساط سے چھلکتی جذبوں سے معمور لہجے میں مجھے بتایا رشتے زندگی میں ہوا اور پانی کی طرح ہوتے ہیں۔ جیسے ہوا اور پانی کے بنا انسان کا دم گھٹتا ہے اسی طرح رشتوں کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔ آپ کا بہت شکریہ، آپ نے میری اولاد کو اُن کا ٹوٹا ہوا رشتہ دوبارہ دے کر پُر اعتماد بنا دیا۔"

"صبا تو میری بہت پیاری بیٹی ہے۔ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔" فرقان اٹھا اور اُس نے اپنی خفت اور جھینپ مٹانے کے لیے صبا کو گلے لگا لیا۔ اُس نے فاخرہ کو کافی حد تک منا لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ برسوں کا تکلف درمیان کھڑا ہے۔ تکلف، بے گانگی و اجنبیت کو وقت تو لگے گا، اُنسیت لگاؤ اور محبت میں تبدیل ہونے میں۔ اور فرقان پُر عزم تھا۔ اُس کا ارادہ اٹل تھا۔ وہ پہلے ہی اپنی ناعاقبت اندیشی کی بدولت اماں کو کھو چکا تھا اب مزید کچھ کھونے کی سکت نہیں تھی۔

☆......☆......☆

فروا کی بہت دنوں سے اریز سے بات نہیں ہوئی، پے در پے صدمات نے فروا کو نڈھال سا کر دیا تھا۔ اُس کے پاس آج کل سیل فون بھی نہیں تھا۔ دوبارہ نیا سیل فون لینے اور سم دوبارہ نکلوانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ گھر میں مہمانوں کا تانتا سا بندھا ہوا تھا۔ فروا مارے اُکتاہٹ کے تلملاتی پھر رہی تھی۔ وہ اریز سے بات کرنا چاہ رہی تھی مگر کیسے...... عروہ کا سیل فون چارجنگ پر تھا۔ فروا کی نگاہوں میں چمک اُبھری۔ عروہ کہاں تھی...... کوئی خبر نہیں تھی۔

فروا نے سیل فون سے چارجر نکالا، کریڈٹ چیک کیا اور اپنے بیڈ روم میں گھس گئی۔ فروا نے اریز کو کال کی۔ ذرا سے توقف سے کال اٹھا لی گئی۔ ہیلو ہائے کے بعد باتوں کا لامتناہی سلسلہ چل نکلا۔ وہ دونوں اپنی اپنی بے چینیوں بے تابیوں کی داستان سناتے رہے۔ پیار کی باتیں، سرگوشیاں، دبے دبے قہقہے، پھر فروا بتانے لگ گئی کہ اُسے کیسے راہ گیر لٹیروں نے لوٹا۔ کیسے ہوا، کیا ہوا سب بتاتی رہی۔ اریز تاسف و افسردگی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ افسوس کا اظہار کرتا رہا۔ اُس کے لب و لہجے میں آزردگی ایسے

گھل گئی جیسے وہ فرداً کے غم میں برابر کا حصہ دار ہو۔ انہوں نے پورے دو گھنٹے بات کی پھر جیسے ہی وہ بند کرنے لگی وہ بولا۔

''جان یہ کس کا نمبر ہے۔''

''میری چھوٹی اکلوتی بہن عروہ رحمان کا ہے۔ جناب آپ کی سالی صاحبہ کا۔''

''او کے ٹیک کیئر میں پھر خود ہی رابطہ کروں گی بائے۔''

''بائے ٹیک کیئر۔''

☆......☆......☆

عروہ آج کل کالج نہیں جارہی تھی۔ صبح سے موسم ابر آلود سا تھا۔ امن کالج جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ لبنیٰ ناشتا بنا رہی تھی۔ لبنیٰ آج امن سے تفصیلی بات کرنا چاہ رہی تھی۔ لبنیٰ امن کو پیار سے سمجھانا چاہ رہی تھی۔ وہ سخت رویہ اپنا کر امن کو باغی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جوانی کا دوسرا نام بغاوت ہے اور لبنیٰ اُسے محبت سے باندھ لینا چاہتی تھی۔ غصہ کا اظہار کر کے امن کو اپنے روبرو کھڑا نہیں کر سکتی تھی۔

''کیا کھاؤ گی۔'' لبنیٰ نے محبت سے امن سے پوچھا۔ امن نے ذرا سا سر اُٹھا کر لبنیٰ کی آنکھوں میں جھانکا۔ خفگی کا کوئی تاثر نہیں تھا اُن کی آنکھوں میں۔ پہلے کی سی کیفیت تھی گرم جوش، محبت بھری۔

''صرف چائے۔'' امن نے مدھم آواز میں کہا تو لبنیٰ نے چائے کا کپ اُس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ایک عجیب سی بھید بھری خاموشی اُن دونوں کے درمیان حائل ہو رہی تھی۔ خوفناک خاموشی ڈرانے والی۔

امن جیسے ہی کالج گیٹ پر اتری سجاد آن پہنچا۔ امن دنگ سی ٹھٹھک کر اُسے دیکھنے لگی۔ کیا وہ کہیں اردگرد ہی تھا۔ امن کا دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ اُس کا دل سجاد کے ساتھ جانے کو نہیں مان رہا تھا مگر سجاد نے اُسے کہاں موقع دیا۔ سنبھلنے کا یا تکرار کرنے کا، جواز پیش کرنے کا۔

''بیٹھو......'' سجاد نے امن کی کلائی تھامی اور اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کچھ کہنے کے لیے اُس کے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے تھے مگر سجاد نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔ وہ گم صم سی بائیک پر سجاد کے پیچھے بیٹھ گئی۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی، خالی ذہن وہ اپنے اطراف میں شور لوگوں کا جم غفیر، ٹریفک کا اژدھام دیکھتی رہی مگر غائب دماغی سے۔ بائیک اُڑی جارہی تھی۔ سجاد اسے لے کر کہاں جارہا تھا۔

''اُترو......آؤ۔'' بائیک رُکی تو وہ اچھل کر چونکی اور اچنبھے سے سجاد کو دیکھا۔

''کہاں۔''

''اوہ یار ڈونٹ وری کیا ہو گیا ہے۔ ڈرومت، ایک دوست کا گھر ہے۔ آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

سجاد نے امن کا ہاتھ تھاما، وہ تھرا کر رہ گئی۔ وہ تو فون پر بھی بہت مشکل سے سجاد سے فرینک ہو پاتی تھی اور اب تو روبرو اُسے پا کر نروس ہو رہی تھی اور یوں اکیلے میں ملنا......بہت مشکل فیصلہ تھا۔

بہت کٹھن گھڑیاں تھیں دشوار ترین۔ بارش کی بوندا باندی نے اُن کو اچھا خاصا بھگو ڈالا تھا۔

''اطمینان سے بیٹھو میری جان، میرے ہوتے ہوئے تمہیں پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ تم جیسے کہو گی تمہارا سجاد ویسے ہی کرے گا۔ تم کہو تو میں اپنی مما کو تمہارے گھر بھیجوں۔'' وہ ایک سادہ سا بیڈ تھا جس پر سجاد نے امن کو شانوں سے تھام کر بٹھایا اور پھر امن کے گود میں دھرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر کہا تو وہ بری طرح پزل ہو گئی اور نفی میں سر ہلانے لگی۔

''اچھا میں کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں تب تک تم اپنی حالت ٹھیک کرو، اپنے حواس بحال کرو۔'' سجاد کہتا کمرے سے نکل گیا تو امن نے جھجکتے ہوئے ارد گرد دیکھا۔ کمرے میں ایک سنگل بیڈ تھا، دو لکڑی کی کرسیاں، ایک چھوٹی سی ٹیبل، کمرے کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔

امن نے اپنا دوپٹا اُتارا اور بیڈ کی کراؤن پر پھیلا دیا اور خود کھڑی ہو کر اپنے کپڑے جھاڑنے لگی صد شکر کہ بارش تیز نہیں ہوئی تھی ورنہ تیز بارش میں وہاں رُکنا اور پھر بارش کے رکنے کا انتظار کرنا مشکل اور صبر آزما ہوتا۔ اُس کی سوچیں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ پھر اُس کے دھیان میں لبنیٰ کا چہرہ آیا۔ ستا ہوا غمگین بھیگی پلکوں والا چہرہ۔ امن یہاں کب آنا چاہتی تھی۔ وہ پشیمان تھی۔

سجاد نے اُس کی سدھ بدھ ہی بھلا دی تھی۔ وہ گنگ سی، سن سی ہو گئی تھی اور منہ اُٹھا کر بائیک پر بیٹھ گئی۔ کچھ کہہ ہی نہیں سکی، انکار کر ہی نہیں پائی۔ اُس سے لاپروائی اور نادانی سرزد ہو گئی تھی۔ وہ اب دل سے نادم تھی۔ تفکر نے اُس کی پیشانی پر شکنوں کا جال بنا دیا تھا۔

''مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی۔ وہ خود کلامی کرتی اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

''ارے واہ، لگتا ہے تم 'ریلیکس' ہو چکی ہو اب تک۔'' سجاد نے قریب آ کر کہا تو وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ خوفزدہ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی پیچھے ہٹی۔ اُس کے گیلے کپڑے بدن سے چپکے سب نشیب و فراز واضح کر رہے تھے۔ اُس کے نم بالوں سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔

''امن تم اتنی پُرکشش ہو مجھے پہلے پتا نہیں تھا۔'' سجاد نے قریب آ کر اُسے شانوں سے تھاما اور اپنا چہرہ امن کے چہرے پر جھکا دیا۔

''چھوڑو، پیچھے ہٹو، مجھے گھر جانا ہے۔'' امن نے زور لگا کر کہا اُس کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ اپنے ہونٹ کچل رہی تھی۔ یک دم اُسے اپنا خون اُبلتا اور تن بدن میں ٹھوکریں مارتا محسوس ہوا تھا۔ سجاد نے اُس کے شانوں سے ہاتھ اٹھا لیے۔ امن کو اپنی بے خبری پر جی بھر کر خفت ہو رہی تھی۔ وہ ننگے سر تھی۔ اُس نے لپک کر اپنا دوپٹا اٹھایا اور سر پر اچھی طرح اوڑھ لیا۔ اُسے سجاد بلوچ کی سانسوں کی حدت اپنے چہرے پر ابھی تک جھلستی نظر آ رہی تھی۔

''مجھے جانا ہے سجاد۔'' وہ غصے کو ضبط کر رہی تھی۔ اندرونی کرب و اذیت نے امن کی آنکھیں نم کر دیں۔

''ذرا رک جاؤ، ابھی تو ہم نے کوئی بات بھی نہیں کی جان۔'' اُس نے آگے بڑھ کر عروہ کے گال کو چھوا۔ بہت نرمی و ملائمت سے مگر امن مضطرب سی ہو گئی اور انتہائی طیش و غضب کے ساتھ سجاد کا ہاتھ تلخی سے جھٹک دیا۔ ناگواری سے ابرو اچکائے امن قہر بھری نظروں سے سجاد کو دیکھ رہی تھی، دیکھے جا رہی تھی۔

سجاد کا مضبوط بازو ہوا میں لہرایا، سجاد کے بازو پر بندھی سنہری ڈائل والی قیمتی گھڑی فرش پر گر گئی، ٹوٹ کر بکھر گئی سجاد نے ایک نظر گھڑی کو دیکھا اور دوسری نظر گہری تشویش اور شاک کی سی تھی جو امن کے شدید ردعمل کے نتیجے میں اُس کے چہرے پر گڑ کر رہ گئی تھی۔ تنفر بھری حقارت سے لبریز نظر۔

''کیوں کر رہی ہو ایسے۔ اتنا ہی میرے کھا جانے کا ڈر تھا تو آتی ہی نا۔'' امن نے اُس کا ہاتھ جھٹکا ایسی سبکی و تحقیر کا وہ کہاں عادی تھا۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے امن کو دیکھتا رہا۔ وہ اپنی بے عزتی پر زخمی شیر جیسا ہو رہا تھا۔ توہین کا احساس رگ و پے

میں سرایت ہو رہا تھا۔

''ذرا سا چھو ہی لیا نا کون سا کوئی ظلم کر ڈالا جو تم نے ایسے ری ایکٹ کیا۔ دنیا کہاں کی کہاں پہنچ گئی مگر تم وہی دبو کی دبو رہنا، سب کچھ بدل گیا مگر تم نے، بتاؤ میں نے ایسا کیا وحشیانہ قدم اٹھایا۔ کیا درندگی کر ڈالی جو تم نے......''

وہ لہجے میں زمانے بھر کا درد سمو کر بولا حالانکہ اُس کا رواں رواں اس ہتک پر تڑپ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سامنے کھڑی اُس معمولی سی لڑکی کو اپنے قدموں تلے دبا کر چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دے۔

''کاش میں تمہیں نہ لے کر آتا یہاں، میں تو پریشان تھا کہ تمہاری مما کو پتا چل گیا ہے تو مل کر بیٹھ کے اطمینان سے بات کرتے ہیں، مگر اب مجھے پچھتاوا ہو رہا ہے کہ مجھے تمہیں لے کر ہی نہیں آنا چاہیے تھا۔'' سجاد نے یک دم پینترا بدلا اور بات کو اور ہی رُخ دے ڈالا جیسے وہ بہت مضطرب ہو، پچھتا رہا ہو۔

''ایسی بات نہیں ہے سجاد، وہ دراصل میں تمہارے چھونے سے ڈر گئی تھی۔'' طویل دورانیے میں شاید پہلی بار امن نے سجاد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں۔ التجا و بے کسی کا عکس تھا نگاہوں میں۔

''بات تو ساری اعتماد کی ہے نا جو تمہیں مجھ پر نہیں ہے۔'' اُس کے لہجے میں درد اور یاسیت اُتر آئی۔ امن کے دل کو کچھ ہوا۔ بھٹکتی سوچیں صرف 'سجاد' پر رُک گئیں، جو اُس کے لیے فکر مند تھا۔ آزردہ تھا گھر، بابا اور مما، اور مما سے متعلق جذبات سب مغلوب ہونے لگا۔ سجاد بلوچ غالب آ گیا۔ سجاد بلوچ جسے دیکھ کر اُس کی دھڑکن رُک جاتی تھی۔ وہ اپنے اطراف سے یکسر بے نیاز ہو جایا کرتی تھی۔ سب کچھ مغلوب ہو کر پس منظر میں کہیں دور چلا گیا، سجاد بلوچ نمایاں نظر آنے لگا۔ منفرد ہو کر چھانے لگا۔

''سوری سجاد میں شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسا رویہ اپنا کر تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''ارے رونے کیوں لگ گئیں۔ میں ساری زندگی تمہارے ساتھ بتانے کی آرزو رکھتا ہوں، تمہیں اپنی ہم سفر چنا ہے، میری چاہ کو غلط رنگ مت دو، میرا مقصد 'وہ' نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔'' وہ اب پھر امن کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر ایک بات اُس کے ذہن میں ڈال رہا تھا۔ ایسی لڑکیاں شادی کے نام پر بہل ہی جایا کرتی ہیں۔ خوش رنگ خواب آنکھوں میں بسا لیتی ہیں۔

''مجھے بار بار مت چھوؤ سجاد۔'' وہ ملتجی انداز میں بولی۔ لہجے کی کاٹ اور برہمی غائب تھی۔ سجاد کے اندر بیٹھے شیطان نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس کے پاس ہزار رنگ تھے۔ وہ رنگ بدل بدل کر کچی عمر کی تتلیوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا تھا۔ کتنے ہی پاپڑ بیلنے پڑیں، لڑکی لاکھ نخرے دکھائے بالآخر ہوتا وہی تھا جو سجاد کے اندر پلتا ابلیس چاہتا تھا۔ سجاد مکار ہی نہیں چالباز بھی تھا۔

وہ روئے جا رہی تھی روئے جا رہی تھی۔

''مت رو، مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔'' وہی مردانہ گھسا پٹا جملہ بلکہ پٹا پٹایا۔

پھر وہی امن جو سجاد کے چھونے سے اتنی برفروختہ ہوئی تھی اب وہی سجاد بلوچ' اپنے ہاتھوں کی نرم پوروں سے امن کے آنسو صاف کر رہا تھا۔ حوا کی بیٹی، بے وقوف خوش فہم، چار لفظوں کی مار 'محبت' کے نشے میں موم کی طرح پگھل جانے والی۔ شادی کا وعدہ کرنے والے کو اپنا سب کچھ مان لیتی ہے۔ سجاد

نے امن کے آنسو صاف کیے، گال چھوئے، بالوں کو اپنی انگلیوں سے سنوارا۔
پھر جیت شیطان کی ہوئی وہ بہک گئی تنہائی تھی دو دھڑکتے دل اکیلے تھے۔ تیسرا وہ بھی تھا جو ہاتھ پکڑ کر نفس کا غلام بنا دیتا ہے۔
وہ دونوں ایک دوسرے کے وجود میں گم تھے۔ شیطان بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ غلاظت میں لتھڑ جاتے سجاد کے نمبر پر کال آ ئی تھی۔ سجاد نے چیخ کر امن کو خود سے الگ کیا تو شیطان منہ بسور کر مایوس سا دور جا بیٹھا۔ سجاد کال پک کر کے باتیں کرنے لگا چند منٹ کی کال تھی۔
''تم کون ہو عروہ رحمان یا امن فرقان۔'' اُس کے چہرے پر کرختگی کہاں سے امڈ آئی تھی۔
''مم...... میں۔'' وہ ہکلائی۔
''صرف سچ۔'' اُس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی تھی اُس کا لہجہ کھردرا تھا۔
''امن...... فرقان۔'' وہ اٹکی۔
''جھوٹی دھوکے باز میں تمہیں عروہ رحمان سمجھتا رہا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' سجاد نے اپنے ہاتھ میں اُس کا چہرہ دبوچ لیا اور اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا، وہ لڑھک کر نیچے گری۔
''فراڈ لڑکی! میرا اتنا وقت تم نے خود پر برباد کروایا۔ تم ہو کیا، تمہاری اوقات کیا ہے۔ جنرل اسٹور چلاتا ہے نا تمہارا باپ۔ تم نے اپنی شکل کبھی آئینے میں دیکھی ہے۔ نہ شکل نہ عقل اوپر سے ٹٹ پونجیے باپ کی بیٹی۔''
وہ اُسے مار رہا تھا، رگید رہا تھا۔ فرش پر گھسیٹ رہا تھا۔ امن کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ اُسے ذلیل کر رہا تھا۔ اُس کا انگ انگ چھور رہا تھا۔ اُسے اذیت دے رہا تھا۔ سجاد بلوچ نے امن کے منہ پر تھوکا تھا۔ اُسے زدوکوب کیا۔ اُس کی تحقیر کی اُس کی عزت تار تار کر ڈالی۔ شیطان قہقہے لگاتا رہا۔ وہ روتی رہی، تڑپتی رہی۔ وہ سنگ باری کرتا رہا۔ طعنے تشنے دیتا رہا۔
''مجھے دھوکا دیا سالی، میں تمہیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا، تمہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ موت کے سوا ہاہاہا۔'' شیطان اور وہ دونوں بلند و بانگ قہقہے لگا رہے تھے۔
نیکو کار بنتی ہے، پارسائی کا ڈھونگ رچاتی ہے۔ لے سجاد بلوچ نے آج تمہیں میلا کر دیا۔ کون تمہیں اپنائے گا بتاؤ۔'' سجاد نے اُس کے منہ پر زور کی ٹھوکر ماری۔

☆......☆......☆

امن کیسے گھر پہنچی تھی اور کس طرح پہنچی تھی خدا بہتر جانتا تھا۔ کالج ٹائم سے پہلے ہی وہ آ گئی تھی مگر کیسی حالت میں تھی یہ کوئی لبنیٰ کے دل سے پوچھتا۔ اُس کا دل اتنا بڑا صدمہ سہار نہیں پایا تھا کسی بھی ماں کا دل اپنی بیٹی کے گلے پر پڑے سرخ نشان، چیتھڑوں میں بنے ملبوس اور گٹی پٹی لڑکھڑاتی چال سے سب جان جاتا ہے۔ بیٹی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی، ماں کا دل آگاہ ہوتا ہے کہ بیٹی کتنے بڑے حادثے کا شکار ہو چکی تھی۔ کتنا درد کتنی اذیت اٹھا آئی ہے۔ اپنی زندگی کی سب سے انمول چیز گنوا آئی ہے۔ لبنیٰ کا دل بھی آگہی پا گیا تھا کہ امن کسی کے بھوکے ندیدے نفس کا شکار ہو گئی ہے۔ کسی وحشی نے اُسے اپنی درندگی کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ کسی نے اپنی ہوس کا نشانہ امن کو بنا کر رگید ڈالا تھا۔ لبنیٰ کا دل تکلیف کی زد میں آ گیا۔ اتنی تکلیف اتنی تکلیف کہ لبنیٰ کو انجائنا کا اٹیک ہو گیا۔ گھر میں صرف امن اور لبنیٰ اکیلی تھیں۔
امن کچھ دیر سہمی ہوئی لبنیٰ کو دیکھتی رہی وہ عجلت میں اپنے بابا کو فون کرنے لگی، پھر کچھ خیال آنے پر

کمرے میں گھس گئی۔ اُس نے نہا کر کپڑے بدلے اور اپنے پھٹے کپڑے الماری میں لاک کے اندر چھپا دیے۔

اُس کا سارا بدن زخمی تھا۔ جگہ جگہ خراشیں تھیں۔ اُس ظالم بے رحم نے اتنی سفاکی اور بے دردی کا مظاہرہ کیا کہ امن کا بدن ہی زخموں سے چور نہیں تھا بلکہ اُس کی روح پر بھی شگاف سے پڑ گئے تھے۔ امن نے اچھی طرح دوپٹا اُوڑھ کر اپنی گردن چھپالی۔ فرقان کو فون کیا، وہ بھاگا چلا آیا۔ فرقان نے فاخرہ کو فون کر کے گھر آنے کا کہا تھا اور لبنیٰ کی بابت بتایا تھا۔

لبنیٰ ICU میں تھی بروقت طبی امداد مل گئی تھی۔ اُس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ فرقان نے امن اور فاخرہ کو فون کر کے بتایا تھا۔ فاخرہ اور صبا اپنے گھر سے کھانا پکا کر لائی تھیں۔ مگر امن نے ایک نوالا بھی نہیں لیا تھا۔ ہنزلا اور حذیفہ کو زبردستی فاخرہ نے تھوڑا سا کھانا کھلایا تھا۔

فاخرہ پوری رات اُن کے پاس رہی تھی۔ فاخرہ خود بھی رو رہی تھی مگر روتے ہوئے بچوں کو ساتھ لپٹا لپٹا کر دلاسا بھی دے رہی تھی۔

”بیٹا دعا کرو بس اپنی مما کے لیے۔ دعا تقدیر بدل دیتی ہے۔ فرقان بھائی کا فون آیا ہے نا۔ لبنیٰ ٹھیک ہے۔ خدا کا شکر ہے اُس کی جان بچ گئی۔“ وہ امن کو ساتھ لگائے کہہ رہی تھی۔ رحمان کے گھر فاخرہ کے آنے کی خبر نہ جانے کس نے پہنچا دی تھی۔ اب اگر انہوں نے آنا بھی تھا تو وہ نہیں آئے تھے۔ منہ پھلا کر بیٹھ گئے۔ ابھی تو پچھلا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا کہ فاخرہ کے میل جول نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ رہی تھی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس گھر کے مکینوں پر کیسی افتاد آن پڑی تھی کہ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔

کیسا گھاؤ ڈال دیا تھا سجاد بلوچ نے۔ اپنا بن کر بہت کاری ضرب لگائی تھی۔ امن کا وقار، اُس کی نسوانیت کی اتنی تذلیل، کیا وہ اتنی ارزاں اور ہلکی تھی۔ وہ جلتے الاؤ میں دہک رہی تھی۔ مجبور اتنی کہ کسی سے اپنا دکھ بانٹ بھی نہیں سکتی تھی۔

"بیٹا ماں سے بڑھ کر کوئی غمگسار اور مخلص نہیں ہوتا۔ مجھ سے کچھ مت چھپایا کرو۔" لبنیٰ کی آواز کی بازگشت امن کے دل کو چیر رہی تھی۔ اُس نے باہر کے لوگوں پر بھروسا کیا تھا لٹ پٹ گئی۔

"مما......" امن باآواز بلند چیخی۔ اُس کی چیخ اتنی دلسوز تھی کہ فاخرہ بے اختیار رو دی۔

"بیٹا حوصلہ کرو مما ٹھیک ہو جائیں گی۔ بس دعا کرو۔" فاخرہ نے اُس کا سر اپنے شانے سے ٹکا لیا۔

اُس نے اپنے اوپر خوش نصیبی کے سارے در اپنے ہاتھوں بند کر دیے تھے۔ اب رو رہی تھی، تڑپ رہی تھی۔ وہ بہت سارے دکھوں کا بوجھ اٹھائے بیٹھی تھی۔ روح کے اندر ماتم ہو رہا تھا۔ وہ گلٹی فیل کر رہی تھی۔ وہ اپنی تباہی کی ذمہ دار خود کو گردانتی تھی۔ کون تھا اتنا دردشناس ماں کے سوا جو ماتم کناں روح کے غم جان سکتا۔ امن کا رونا کرلانا، اُس کی دلسوزی، روح میں پھیلے سناٹے کون دیکھ سکتا تھا۔ صرف مما، صرف مما مگر وہ نہیں تھیں۔ کسی کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ امن کے ساتھ بیتے درد کو جان سکتا۔ سمجھ سکتا۔ کیسی انہونی ہوئی تھی، کیسا کرب جھیلا تھا۔ کیسی ہولناکی چھائی تھی امن کے تن بدن پر، صرف ماں جانتی تھی۔ ماں ہی جان سکتی تھی۔

"مما...... مما میں مر جاؤں گی۔" وہ پھر دھاڑیں مار کر روئی تھی، جیسے کوئی مر گیا ہو کوئی مر ہی تو گیا تھا۔ جیتے جی مر گئی تھی امن فرقان، نہ زندوں میں رہی نہ مُردوں میں۔

سجاد بلوچ نے محبت کا دانہ ڈال کر اُس کا تن من گھائل کر دیا تھا۔ زخم زخم وجود لیے وہ روتی کرلاتی تڑپتی، پچھتاوا اُس کی سانس روک دیتا، زخم خوردگی اُسے بلبلانے پر مجبور کر رہی تھی۔ جب جب زخموں سے ٹیسیں اٹھتیں اُس کا دم گھٹتا، درد ہی درد لامتناہی درد، اندر باہر پھیل گیا تھا...... زہر ہی زہر۔

☆......☆......☆

فاخرہ نے چائے دم پر رکھی حذیفہ اور ہنزلا کو ناشتے کے لیے جگانے اُن کے کمرے میں گئی۔ بچے فوراً اُٹھ بیٹھے مگر بسورنے لگے کہ اسکول نہیں جانا، مما کے پاس جانا ہے۔ مگر فاخرہ نے اُن کو بہلا پھسلا کر چپ کروایا اور اُن کو اٹھا کر واش روم میں بھیجا۔ اور خود بریڈ الماری سے نکالنے لگی۔ امن کو اُس نے نہیں جگایا تھا۔ وہ رات دیر تک روتی رہی تھی۔ فاخرہ چاہ رہی تھی کہ وہ آرام کر لے۔

فاخرہ بچوں کو تیار کروا کے ناشتے سے فارغ ہو کر اسکول کے رکشے کا انتظار کرنے لگی۔ فاخرہ نے بچوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ شام میں اُن کو ساتھ لے کر ہوسپٹل اُن کی مما سے ملوانے ضرور لے کر جائے گی۔

رکشہ آ گیا تھا۔ بچے چلے گئے تب دوبارہ کچن میں چلی گئی۔ اور اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

صبا کو صبح صبح بشیراں آ کر لے گئی تھی، فاخرہ کو اُمید تھی کہ لبنیٰ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ شکر ہے بشیراں کا بہت آسرا تھا کہ اُس نے فاخرہ کے بعد بھی گھر کو سنبھال رکھا تھا۔ فاخرہ نے سوچا کہ کیوں نہ امن کو بھی جگا دیا جائے تاکہ اکٹھے ناشتا ہو سکے یہی سوچ کر وہ امن کے کمرے میں چلی آئی۔

"امن بیٹا اٹھ جاؤ۔" فاخرہ نے امن کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو امن ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس کا دوپٹا بیڈ کے نیچے لٹک رہا تھا امن کا ستا ہوا چہرہ، بے اختیار فاخرہ کی نظریں امن کے چہرے سے

گردن اور گردن سے نیچے تک...... فاخرہ کی سانسیں تھم گئیں۔

''اوہ...... بیٹا یہ نشان کیسے ہیں؟'' فاخرہ امن کے پاس بیٹھ گئی، امن تھرا کر اپنا آپ سمیٹنے لگی اور اِس نے جیسے وحشت بھرے خوف میں گر کر اپنا دوپٹا اوڑھا فاخرہ دھک سے رہ گئی۔

''بیٹا......'' فاخرہ سے بولا ہی نہیں گیا۔ امن کی مشکوک حرکات نے اسے خطرے کا سگنل دیا کہ امن کے ساتھ کچھ برا ہوا ہے یا برا ہوتے ہوتے بچت ہوگئی ہے۔

''بیٹا کیا ہوا ہے مجھے بتاؤ میری جان، میں بھی تمہاری ماں جیسی ہوں۔'' فاخرہ کا اتنا کہنا تھا کہ امن کے اپنی ذات پر بندھے ہوئے سارے بند کھل گئے۔ اُسے اس وقت جذباتی سہارے کی ضرورت تھی اور وہ میسر آ گیا تھا۔ بہت بوجھ تھا امن کے دل پر سانس بوجھل تھی۔

''آنٹی اُس نے مجھے بہت مارا، میرے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا۔ بہیمانہ جانوروں جیسا، وہ درندہ تھا اُس نے میری عزت تار تار کردی۔'' امن اپنے گھٹنوں پر سر رکھ کر رو دی۔ اُس کے سوز میں آہیں تھیں نوحے تھے۔

''کک...... کون تھا...... وہ ذلیل......''

''پتا نہیں۔''

''کیا مطلب وہ تمہیں جانتا نہیں تھا۔''

''میں اُسے جان نہیں پائی، اُس نے محبت کا جھانسا دے کر مجھے لوٹ لیا، مجھے کنگال کردیا۔'' امن کی دبی دبی سسکیاں کمرے کی ساکت فضا میں اُبھرتی رہیں۔ فاخرہ کو اپنے سامنے بیٹھی لڑکی پر بہت ترس آیا۔ اُس کا دل اُس کی حالتِ زار پر کٹ رہا تھا۔ فاخرہ نے اُسے اپنے ساتھ لگالیا دونوں تادیر روتی رہیں۔

''میری مما کو اٹیک میری وجہ سے ہوا ہے۔ اُن سے میری اُجڑی حالت دیکھی نہیں گئی۔ میں مما سے کیسے نظریں ملا پاؤں گی۔ میں مر کیوں نہیں گئی۔ مجھے تو مرجانا چاہیے تھا۔'' امن بلک بلک کر کہہ رہی تھی۔ اُس کے الفاظ فاخرہ کے دل کی دنیا تہہ و بالا کر رہے تھے۔ اُس کا وجود جھٹکوں کی زد پر تھا۔ امن کا لرزتا کانپتا کامنی سا سراپا فاخرہ کی گرفت میں تھا۔ امن کا بدن آگ کی مانند جل رہا تھا۔

''بیٹا تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔'' فاخرہ کے پاس ان گنت سوال تھے مگر وہ خاموش تھی۔ گہرے سمندر کی طرح۔ وہ کیا کہتی امن سے، جانتی تھی کہ امن احساسِ جرم میں مبتلا بے سکون ہے، کسی کل چین نہیں ہے اُسے، پھر ایسے میں وہ کیا کہتی۔ طنز کے تیر برساتی، اِس کا جگر چھلنی کرتی مگر کس برتے پر، ایسی بے تکلفی تو کبھی بھی نہیں رہی اُن دونوں کے درمیان، ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کی باوجود اک اجنبیت سی محسوس ہوتی تھی۔ اور ایسے حالات میں کوئی نصیحت بھی کس کام کی، تباہی تو ہوچکی تھی۔

''آنٹی بہت آگ لگی ہے میرے اندر، بھانبھڑ جل رہے ہیں۔ سب کچھ جل کر خاکستر ہوگیا۔ امن لٹ گئی، برباد ہوگئی۔ اندھے نفس کا طوفان سب کچھ بہا کر لے گیا۔''

''بیٹا میں کچھ کھانے کے لیے لے کر آتی ہوں پھر ٹیبلیٹ لے لو۔'' فاخرہ کیا کہتی وہ تو خود درد کی انتہا پر تھی۔

''مجھے کچھ نہیں کھانا۔ مجھے تڑپ تڑپ کر مرجانے دیں۔ میری موت بہت اذیت ناک ہونی چاہیے۔ مجھے مرجانا چاہیے۔'' امن نے مٹھیوں میں اپنے بال جکڑ کر نوچ ڈالے، فاخرہ کو رحم آ رہا تھا، ترس آ رہا تھا۔ امن کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی اور

فاخرہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

فاخرہ نے زبردستی امن کو تھوڑا سا سلائس کھلایا تھا پھر ٹیبلیٹ دے کر ایک کپ چائے بنا کر دی۔ امن نے چند گھونٹ بھر کے کپ واپس پکڑا دیا۔ وہ رو رہی تھی تڑپ رہی تھی، اپنا سر شدت سے نفی میں ہلا رہی تھی۔ پھر وہ اپنا سر تکیے پر پٹخنے لگی، چیختی رہی۔ وہ نظروں سے گر گئی تھی۔ وہ بھی اپنی ماں کے، وہ ذمہ دار تھی لیتی کے ہارٹ اٹیک کی۔ اس کا سانس ایسے اکھڑ رہا تھا جیسے وہ جاں کنی کے عالم میں ہو۔

فاخرہ ساکت سی یک ٹک امن کو دیکھے جا رہی تھی۔ امن کی گریہ زاری اس کا ذہن اس وقت ایک ٹھٹھری سی کیفیت میں گم تھا۔ وہ امن کو کیا طفل تسلیاں دیتی۔

فاخرہ اس کے پاس تھی بے دھیانی سے امن کو دیکھے جا رہی تھی امن کی آنکھوں کے نیچے ایک ہی دن میں کیسے حلقے پڑ گئے تھے۔ چہرہ برسوں کے مریض جیسا، فاخرہ کے دل سے ہوک نکلی۔ فاخرہ ڈر گئی۔ زندگی کے سب تلخ و شیریں رنگ دیکھ چکی تھی، جانتی تھی کہ ابھی امن نے بہت عرصہ رونا ہے آنکھوں سے خون کے آنسو بہنے تھے۔ اس کے ہونٹوں کے نازک آبگینے چکنا چور ہوئے تھے۔ امن ہچکیاں بھرتے بھرتے سو گئی، فاخرہ نے ہولے سے دروازہ بند کیا اور باہر نکل گئی۔

"کیا مجھے امن کے بخار کے متعلق فرقان بھائی کو بتانا چاہیے۔" فاخرہ نے خود سے سوال کیا اور اپنے سیل فون پر فرقان کا نمبر ڈھونڈنے لگی مگر پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔

"نہیں وہ پہلے ہی پریشان ہیں، مجھے نہیں بتانا چاہیے۔ امن کی طرف سے پریشان ہیں اور اس کی ذہنی حالت بھی ٹھیک نہیں۔ خود اذیتی کا شکار ہے وہ۔ مجھے امن کے زخم مندمل کرنے چاہئیں، سب خود دیکھنا چاہیے۔ کسی کو خبر نہ ہو فرقان بھائی کو بھی نہیں۔"

"بازار جاتی ہوں۔ وہاں سے کریم لے کر آتی ہوں اور امن کے زخموں پر لگاتی ہوں، آتے ہوئے سبزی بھی لیتی آؤں گی۔" وہ خود سے ہی باتیں کرتی کمرے میں گئی۔ امن بے سدھ سو رہی تھی۔ فاخرہ نے پیار سے اس کے گال کو تھپتھپایا اور پرس لے کر باہر نکلی۔ فاخرہ نے گلی کا دروازہ لاک کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی آگے بڑھتی رہی۔ اس کا رخ بازار کی طرف تھا۔

☆......☆......☆

"ہیلو عروہ کیسی ہیں آپ۔" نایاب لودھی اچانک ہی سامنے آ گیا۔ عروہ ایک لمحے کے لیے گھبرا گئی۔ نایاب سے اس کی کچھ خاص بے تکلفی تو نہیں تھی۔ بس کبھی کبھار دعا سلام ہو جاتی تھی۔

"جی ٹھیک ٹھاک، آپ سنائیں۔" عروہ مدہم لہجے میں بولی۔ سنا تھا نایاب لودھی کسی وڈیرے کا بیٹا ہے۔ بڑی سی جیپ میں کالج آیا کرتا تھا۔ کچھ لوگ مرعوب تھے اور کچھ اس سے خائف، وجہ اس کی حرکتیں تھیں۔

"میں بھی ٹھیک ہوں، اتنے دن سے کالج نہیں آ رہی تھیں، خیریت۔" عروہ جو اپنی کلاس میں جانے کے لیے پر تول رہی تھی نایاب کی بات پر ٹھٹکی، اس نے عروہ کی غیر حاضری کو محسوس کیا۔ مگر کیوں۔

"میری دادی کی ڈیتھ ہو گئی تھی تو......" اس نے قدم آگے بڑھائے۔ مگر اسے رک جانا پڑا۔

"اوہ ویری سیڈ، بہت دکھ ہوا۔" عروہ چڑ گئی۔ نایاب اسے کیوں اہمیت دے رہا تھا بلاوجہ۔

"بس......" عروہ نے بس کو لمبا کھینچا اور جان چھڑانی چاہی۔

"امن بھی نظر نہیں آ رہی۔" عروہ نے حیرت

سے اپنے پاس کھڑے نایاب کو دیکھا۔ یہ آج اسے کیا ہو گیا۔

"پتا نہیں۔" عروہ نے اُکتاہٹ سے کہا اور بھاگ کھڑی ہوئی نایاب نے متبسم نگاہوں سے جاتی ہوئی عروہ کو دیکھا اور پھر اپنی پاکٹ سے سیل فون نکال کر کوئی نمبر پریس کرنے لگا۔

ضویا عروہ کو دیکھ کر لپک کر آئی اور اِس کے گلے لگ گئی۔ امن کا پوچھا تو عروہ نے کندھے اُچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔ ضویا نے اُس کی دادی کا افسوس کیا۔ عروہ ہوں ہاں کرتی رہی۔ حیرت ہے سارے زمانے کو اُس کی دادی کا افسوس ہے مگر اُسے نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں نہیں تھا۔ ذرا بھی نہیں تھا۔

"امن بھی نہیں آ رہی تھی، تم بھی نہیں، وقت گزارے نہیں گزر رہا تھا۔" عروہ اور ضویا کی کلاس لے کر ابھی کلاس روم سے نکلی تھیں اور ہری بھری گھاس والے گراؤنڈ میں آ کر بیٹھ گئیں۔ جاتی گرمیوں کے دن تھے درمیانہ سا موسم تھا۔

"بس یار تم تو سارے واقعہ کی چشم دید گواہ ہو، جس طرح فرقان چاچو نے صبا کو اپنی پدرانہ شفقت سے پی سی کے ہال میں نوازا، وہ میرے بابا سے برداشت نہیں ہوا اسی لیے۔"

"کیا اسی لیے۔"

"اسی لیے۔ اس بات کو وجہ بنا کر بابا نے فرقان چاچو سے قطع تعلق کر لیا اب ہم ایک دوسرے کے گھر نہیں جاتے، میں خود بچپن سے امن کے ساتھ کی عادی ہوں مگر۔"

"تمہارے بابا نے ایسا کیوں کیا۔" ضویا نے تاسف سے ابرو اُچکا کر پوچھا۔

"پتا نہیں یار، میرے بابا صبا کی مما کو ناپسند کرتے ہیں۔"

"مگر کیوں، فاخرہ آنٹی تو بہت اچھی خاتون ہیں سراپا محبت۔" ضویا کو کرید لگ گئی۔

"ضویا مجھے کچھ نہیں پتا، بس ہم بچپن سے یہی سنتے آئے ہیں کہ وہ اچھی عورت نہیں ہیں میرے بابا نے اُن کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ جب تک فرقان چاچو بھی میرے بابا کے حامی تھے مگر اب صبا کو دیکھ کر اُن کا دل پلٹ گیا مائل ہو گیا۔"

"تمہارے بابا ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا فاخرہ آنٹی سے۔"

"پتا نہیں یار، مجھے تو تائی فاخرہ اور اُن کے بچے بہت پیارے لگتے ہیں۔ میرا بہت دل کرتا ہے اُن سے ملنے کو، بات کرنے کو مگر بابا نجانے کیوں خار کھاتے ہیں اُن سے۔"

"تمہارا دل کرتا ہے صبا زمان سے ملنے کو۔" ضویا نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ہاں بہت......" عروہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ٹھیک ہے میں تمہیں صبا زمان سے ملواؤں گی۔"

"رئیلی...... آر یُو شیور......" عروہ کی آنکھوں کی چمک کئی گنا اور بڑھ گئی۔

"مگر کیسے......؟"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو ڈارلنگ۔" ضویا نے عروہ کے گال پر چٹکی کاٹی۔

"ہاں یاد آیا ضویا جب ہم لاہور گئے تو بابا نے فروہ کی ضد پر اُسے مرسڈیز دلوائی مگر اگلے ہی دن وہ اکیلی لاہور گھومنے نکل کھڑی ہوئی راہ گیر ڈاکوؤں نے اُس سے گاڑی چھین لی۔ اب اُس نے رٹ لگائی ہوئی ہے کہ اُسے دوبارہ گاڑی چاہیے۔" عروہ غصے سے بولی اور نخوت سے سر جھٹکا۔

وہ یک ٹک چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں دھندلا سا تاثر تھا۔ ہراساں سا کسی نادیدہ نقطے پر نگاہیں ٹکائے، بے جان سا لیٹا تھا۔

اُس کی دونوں ٹانگیں سیدھی پڑی تھیں۔ اُس کے دونوں بازو کٹے ہوئے شہتیر کی مانند پہلو میں گرے پڑے تھے اُس کا لاغر سا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثرات سے عاری تھا خالی اور سپورٹ' کمزور سا چہرہ۔

''کیا صورتِ حال ہے ڈاکٹر۔'' کسی نوجوان مرد کی آواز قریب سے ابھری تھی اُس چت لیٹے وجود میں خفیف سی جنبش ہوئی آواز مانوس سی تھی۔ کس کی تھی۔ پتا نہیں۔

''اب بہتر ہو رہے ہیں آہستہ آہستہ۔'' ڈاکٹر کی شفیق آواز بالکل پاس سے سنائی دی تھی۔ اُس کا خوابیدہ سا ذہن نیند کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ مگر دل میں طلب اُٹھ رہی تھی، دیکھنے کی' اس نوجوان کو۔ جس کی آواز سی سنی لگ رہی تھی مگر کہاں۔ یہ اُس کا ذہن اُسے نہیں بتا رہا تھا۔ وہ اب ہلکی آواز میں ڈاکٹر سے کچھ پوچھ رہا تھا یا بتا رہا تھا کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی اُس نوجوان اور ڈاکٹر کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ ہلکی سی بھنبھناہٹ ہو جیسے۔ اور اُس کا ذہن نیند کی وادیوں میں اُترتا جا رہا تھا پُرسکون میٹھی نیند۔

☆......☆......☆

فاخرہ نے امن کے زخموں پر مرہم لگایا۔ وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ پھر فاخرہ نے کدو گوشت بنایا۔ وہ اُس وقت روٹیاں پکا رہی تھی، جب ہنزلا اور حذیفہ بھی آ گئے۔ فاخرہ نے روٹیاں ہاٹ پاٹ میں رکھیں اور الماری سے ہنزلا حذیفہ کے کپڑے نکالنے لگی۔

تبھی دروازے پر دستک ہوئی، فاخرہ نے دروازہ کھولا صبا، فضا، اسوہ اور اسد سامنے کھڑے تھے۔ فاخرہ کا دل خوش ہو گیا۔ بچے جھجکتے ہوئے اندر آ گئے۔ برسوں کی دوری، قربت بنی تھی تو جھجک جاتے جاتے ہی جاتی، فاخرہ نے دروازہ بند کیا تو باری باری سارے بچے فاخرہ سے لپٹے اور 'مس یو مما' کہا۔

فاخرہ اپنے دونوں بازوؤں کے گھیرے میں لے کر اُن کو ٹی وی لاؤنج میں لے آئی۔ ہنزلا حذیفہ فریش ہو چکے تھے۔ دونوں جھینپے جھینپے سے آگے بڑھے اور سب سے باری باری ملنے لگے۔

سب نے مل کر اکٹھے کھانا کھایا۔ بچے ابھی آپس میں بے تکلف نہیں تھے صبا بڑی بہنوں کی طرح سب سے پیش آ رہی تھی۔ بشیراں اُن کو چھوڑ کر گئی تھی دروازے تک، جیسے ہی وہ اسکول سے آئے کپڑے بدلتے ہی مما، مما کرنے لگے اس لیے بشیراں اُن کو چھوڑ گئی تھی۔

''مما امن آپی کہاں ہیں۔'' صبا نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے اُس کی، لبنیٰ کی وجہ سے ڈپریس ہے۔''

''مما میں دیکھوں امن آپی کو۔'' صبا نے اجازت طلب نظروں سے فاخرہ کو دیکھا۔

''نن......نہیں بیٹا۔ امن ساری رات کروٹیں بدلتی رہی ہے اُسے تھکن اور بے آرامی کی وجہ سے بخار ہو گیا ہے، دوائی کھا کر سوئی ہے اُسے آرام کی ضرورت ہے۔''

''جی مما۔'' صبا نے تابعداری سے کہا فاخرہ کا دل بھر آیا نجانے کیوں۔

''چائے بناؤں آپ کے لیے۔'' صبا نے فاخرہ کے کندھے دباتے ہوئے کہا۔

''ہاں بنا دو اور فضا بیٹا تم ہنزلا حذیفہ کے یونی فارم سرف میں بھگو دو، میں برتن سمیٹ کر یونی فارم دھوتی ہوں۔'' فاخرہ نے کہا تو دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''مما میں کچن سمیٹ لیتی ہوں فضا یونی فارم دھو دیتی ہے آپ آرام کرلیں۔'' صبا نے کہا تو فاخرہ نے باری باری اپنی بچیوں کو دیکھا یہ فاخرہ کی بیٹیاں

تھیں سعادت مند، احساس سے بھرا دل رکھنے والی اللہ تعالیٰ نے اُن کو ہدایت سے نواز دیا تھا تو پھر جسے اللہ صراطِ مستقیم پر چلا دے اُسے کون گمراہ کر سکتا ہے۔

چھوٹے چاروں بچے کارٹون لگا کر بیٹھ گئے۔ فاخرہ آرام کی غرض سے امن کے پاس جا کر لیٹ گئی۔

فضا نے ٹب میں کپڑے بھگوئے پھر اچھی طرح دھو کر پھیلا دیے۔ صبا نے چائے بنا کر فاخرہ کو دی۔ پھر سنک میں پڑے سارے برتن دھو کر خشک کیے، گیلے کپڑے سے سلیب صاف کیے کچن میں جھاڑو لگا کر پوچا لگایا۔ اسی دوران ہنزلا حذیفہ کے قاری صاحب آ گئے۔ ہنزلا حذیفہ کے ساتھ ہی اسوہ اور اسد بھی ڈرائنگ روم میں چلے گئے جہاں قاری صاحب بیٹھے تھے۔

بچوں نے کمرے کی حالت ابتر کر ڈالی تھی۔ صبا نے بیڈ سے نیچے لڑھکتی چادر کو کھینچا جھاڑا اور پھر بیڈ پر بچھا دیا۔ صوفوں کو جھاڑا کشن برابر کیے کمرے میں جھاڑو لگا کر پوچا لگا دیا۔

سارا کام ہو چکا تھا دونوں بہنیں چھت پر چلی گئیں۔ چند ثانیہ بعد ہی اُن کو قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر کوئی اوپر آ رہا تھا مگر آہستہ آہستہ۔ پھر آہٹ قریب ابھری۔

''امن آ...... پی...... کیسی طبیعت ہے اب آپ کی۔'' دونوں نے آگے بڑھ کر محبت سے پوچھا۔

''بس ٹھیک...... مما کی وجہ سے......'' وہ سسکی۔

''آنٹی ٹھیک ہو جائیں گی انشاء اللہ، آپ فکر مت کریں۔'' اپنے سے دو تین سال بڑی لڑکی کو صبا اتنی عزت سے بلا رہی تھی، امن حیران تھی اور حیرت سے صبا کو دیکھتی رہی، اتنی مکمل حسین لڑکی، چہرے پر بلا کی نرمی، اونچی لمبی، گوری چٹی، بولتی پُرکشش آنکھوں والی۔

''فضا میرا خیال ہے کپڑے سوکھ گئے ہیں۔''

''نہیں ابھی نمی سی ہے کپڑوں میں۔''

''فضا کپڑے نم ہوں تو بہت اچھے پریس ہوتے ہیں، جاؤ لے جاؤ آ اُو پریس کر کے رکھ دو۔''

''جی اچھا۔'' صبا کے کہتے ہی فضا تار سے ہنزلا حذیفہ کے کپڑے اُتار کر نیچے چلی گئی۔ امن پھر حیرت زدہ رہ گئی صبا کا انداز حکمیہ نہیں تھا مگر فضا نے فوراً بات مانی تھی۔ بغیر ناک بھوں چڑھائے بغیر بحث و تکرار کیے۔ اور وہ...... وہ تو مما کی بات پر بھی چوں چرا کرتی تھی حیلے بہانے بناتا۔ تاویلیں گھڑنا اور یہ بہن ہو کر بہن کی اتنی بات مانتی ہے۔

''آپی آپ پریشان نہ ہوں دعا کریں آنٹی کی صحت کے لیے۔'' صبا نے ساکن کھڑی امن کا ہاتھ پکڑا۔

''دعا......'' امن کے لب پھڑپھڑائے اور وہ واضح لڑکھڑائی صبا نے اُسے تھام کر پاس رکھی کرسی پر بٹھایا۔ امن نے آسمان کی طرف دیکھا۔ شام کے دھندلکے میں پرندوں کی چہچہاہٹیں سنائی دیں۔

پرندے قطار در قطار محو پرواز تھے اپنے آشیانوں کی طرف، اتفاق و یگانگت قطار ٹوٹنے نہیں دے رہی تھی۔ امن دونوں ہاتھوں میں سر گرا کر سسکنے لگی۔ اُس نے بھی تو اتنی اونچی اُڑان بھری تھی اور جب بے دم ہو کر گری تو زمین کا بوجھ بن چکی تھی۔

وہ ایسے سفر پر گامزن ہو کر پاؤں فگار کر بیٹھی جس کی کوئی منزل ہی نہیں تھی۔ انسان جب خاص طور پر لڑکیاں ماؤں سے بڑھ کر باہر کے لوگوں پر بھروسہ کرتی ہیں تو آبلہ پائی اُن کا مقدر بن جاتی ہے۔ نارسائی کا درد تمام عمر پشیمانی اور رنج و الم میں مبتلا رکھتا ہے۔ لاحاصل خواہشیں، خوردوح اب، بے مقصد محبت کا سفر، ناکامی و بدنامی۔

''ہاں امن آپی آپ دعا کریں۔'' امن چونکی

کسی خواب سے بے دار ہوئی۔
''میری دعا قبول نہیں ہوگی، اچھی لڑکیوں کی دعا قبولیت کا درجہ پاتی ہے۔''
''آپ تو بہت اچھی ہیں امن آپی۔'' امن نے ہنکارا بھرا جیسے خود اپنا مضحکہ اُڑایا۔
''صبا تم نے کبھی اپنی مما سے جھوٹ بولا۔''
''نہیں کبھی نہیں، اور نہ ہی کبھی بولوں گی انشاء اللہ۔'' صبا نے مضبوط لہجے میں کہا تبھی صبا کے سیل فون کی مدھری بیل ہوئی۔ نیہات ضمیر کی کال تھی۔ صبا کچھ دیر اُس سے بات کرتی پھر خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ صبا نیہات کی اکیڈمی میں جاب کرنا چاہ رہی تھی۔ اسی سلسلے میں بات ہوئی تھی۔
''صبا تم اپنی مما سے چوری بات کرتی ہو نیہات سے۔''
''ارے میں چوری بات کیوں کروں گی چوری تو چھپ کر وہ کام کیا جاتا ہے جو غلط ہو۔'' وہ پُر اعتماد تھی۔ اچھی بھی ذہین تھی، اپنی قابلیت کی دھاک بٹھا چکی تھی۔ حد سے زیادہ خوبصورت و دلکش، توجہ کھینچ سکتی تھی۔ کتنی بلندی پر کھڑی تھی صبا زمان۔ صبا زمان فاخرہ کی جیت تھی۔ کامیابی کا راستہ تھی۔ فاخرہ کا مان تھی، ناز تھی وہ اپنی ماں جیسی تھی۔ لوگوں کا، زندگی کا ادب کرتی تھی تو بھلا زندگی صبا زمان کی بے ادبی کیسے ہونے دیتی، کچھ لوگوں نے فاخرہ کی زندگی کی بے ادبی کا گناہ کیا تھا اور اللہ بے نیاز ہے عزت دینے والا، ڈھک لینے والا۔
''ارے میں سارے گھر میں تم لوگوں کو ڈھونڈ رہی ہوں تم لوگ یہاں بیٹھے ہو۔'' فاخرہ بھی اوپر چلی آئی تھی۔ صبا اُسے نیہات کی کال کے بارے میں بتانے لگی۔
''بیٹا تمہاری پڑھائی کا حرج ہوگا تم رہنے دو پڑھانا وغیرہ۔''
''مما میں پڑھائی دل لگا کر کروں گی، آپ انکار نہ کریں نہ پلیز۔'' صبا فاخرہ کے گلے لگی ملتجی لاڈ بھرے لہجے میں بولی تو فاخرہ ہونٹ بھینچ کر اثبات میں سر ہلانے لگی اور صبا نے فرطِ جذبات سے فاخرہ کے گال چوم لیے۔ امن پھر انگشت بدنداں ساکت سی رہ گئی۔ کہاں دیکھے تھے اُس نے ایسے محبت کے مظاہرے، لبنیٰ کی بات کو درخوار اعتنا نہ جاننا، ایک کان سے سُن کر دوسرے سے اُڑا دینا، ہر نصیحت و سرزنش پر بے توجہی سے بات سننا اور بے زار ہو کر سر جھٹکنا امن کا وتیرہ رہا تھا۔
''صبا میں ہنزلا اور حذیفہ کو ہاسپٹل لے کر جا رہی ہوں میں نے اُن دونوں سے وعدہ کیا تھا۔ تم آٹا گوندھ لینا میں آ کر روٹیاں بنالوں گی۔''
''جی مما ٹھیک ہے۔'' امن پھر سسکیاں بھرنے لگی اُسے اپنا ہر جھوٹ یاد آ رہا تھا۔ اپنی سازشیں اپنی دھوکا بازی جو وہ اپنی مما سے کرتی رہی تھی۔ خسارہ ہی خسارہ، ایک بار پھر وہ ٹوٹ ٹوٹ کر رو دی صبا اُسے ایک ماں کی طرح سنبھالتی رہی۔ امن خود کو بہت میلا گندا اور ارزاں محسوس کر رہی تھی۔ کم مائیگی کا جان لیوا احساس اُسے کچوکے لگا رہا تھا۔ پچھتاوا ایک کسک ایک چبھن بن کر امن کو کاٹ رہا تھا۔ اندر اندر بہت گہرائی میں۔

☆......☆......☆

ضویا اور عروہ کینٹین میں ایک ہاتھ میں برگر اور دوسرے ہاتھ میں پیپسی کا ٹن تھامے بری طرح باتوں میں مگن تھیں تبھی اُن کو کچھ عجیب سا شور سنائی دیا۔ اُن دونوں نے ناسمجھی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اپنی باتوں میں گم ہو گئیں، پھر کچھ آوازیں اُبھریں تو دونوں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ویسے بھی اُن کا کھانے پینے کا شغل ختم ہو چکا تھا۔ ابھی کینٹین میں رش نہیں تھا۔ کلاسز ہو رہی تھیں۔ وہ

دونوں اپنی کلاس بنک کر کے اِدھر آ نکلی تھیں وہ دونوں لمبی راہداری عبور کرنے کی بجائے دوسری طرف کو نکل پڑیں۔ سامنے نایاب لودھی سیل فون کان سے لگائے کھڑا تھا اور سامنے نیہات ضمیر کھڑا تھا۔

''نایاب آپ کلاس میں چلو۔'' نیہات مؤدب سا کھڑا کہہ رہا تھا۔

''اور اگر نہ جاؤں تو۔'' وہ تنک کر بولا۔

''پلیز آپ فون بند کریں آپ جانتے ہیں کہ کالج میں اجازت نہیں ہے کالز کرنے کی۔''

''میں کروں گا کال، کون روک سکتا ہے مجھے۔'' وہ برہم ہوا۔

''ٹھیک ہے میں پھر سر کاشف سے کہہ دیتا ہوں کہ آپ ڈسپلن کا خیال نہیں رکھتے۔ کلاس ٹائم میں فون پر بزی رہتے ہیں۔ ظاہر ہے جب آپ مجھے، سی آر کو جھٹلا رہے ہیں تو مجبوری ہے۔''

''اوکے ڈونٹ ڈسٹرب می، مداخلت کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے میری ذاتیات میں۔ مسٹر سی آر اپنی اوقات میں رہو تو زیادہ بہتر ہے۔'' نایاب نے چبا چبا کر سلگتے لہجے میں کہا اور نگاہیں گویا گڑ کر رہ گئیں تھیں نیہات ضمیر کی آنکھوں میں۔ ضویا اور عروہ واپس پلٹ آئیں تھیں۔

''مجھے تو بہت برا لگتا ہے نایاب لودھی، بدتمیز، چھچھورا، خبطی۔'' ضویا نے کہا۔

''ہاں بس ہر وقت سیل فون کو کان سے چپکائے رہتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں گرل فرینڈز بنا رکھی ہیں۔ فلرٹ کہیں کا، وڈیرے کا بیٹا ہے من مانی کرنا اپنا حق سمجھتا ہے جیسے یہ کوئی کالج نہیں بلکہ اس کے باپ کی جاگیر ہو، جہاں وہ اپنی مرضی سے دندناتا پھرے کوئی پوچھے گا نہیں۔'' عروہ نے بھی تنفر سے کہا۔

''بگڑا ہوا امیر زادہ۔'' ضویا نے اپنی ناک غصے سے پھیلا کر ہنکارا بھرا ابھی انہوں نے نیہات ضمیر کے ساتھ سر کاشف کو دیکھا وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

نیہات ضمیر سُلجھا ہوا ٹھنڈی طبیعت کا لڑکا تھا۔ بدتمیزی کرنا لڑائی جھگڑے اُس کی فطرت کا حصہ نہیں تھے۔ اس لیے وہ نایاب جیسے لوگوں کے منہ نہیں لگتا تھا۔ سی آر ہونے کی وجہ سے اپنی کلاس پر اُس کا ہولڈ تھا۔ سب بوائز اور گرلز اُس کی بات مانتے تھے۔ بس نایاب لودھی کبھی کبھی اکڑتا تھا مگر آج تو حد ہوگئی تھی۔

نایاب لودھی نے سر کاشف کے ساتھ بھی مس بی ہیو کیا تھا اور اُن کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ہٹ دھرمی کی انتہا ہوگئی تھی کہ نایاب کسی کو خاطر میں ہی نہیں لا رہا تھا، پرنسپل کو بھی نہیں۔

سر کاشف نے نایاب کو تھپڑ جڑ دیا وہ جو پہلے ہی ہٹیلے پن کا مظاہرہ کر رہا تھا اب تو ہتھے سے ہی اکھڑ گیا۔ مشتعل ہو کر گالی گلوچ بکنے لگا۔ گرلز اور بوائز نے دانتوں میں انگلیاں داب لیں۔

ایسی بے شرمی اور ڈھٹائی پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

اس لیے ٹیچرز کو بھی شاک لگا تھا۔ شدید قسم کا احتجاجی رویہ نایاب نے اپنا رکھا تھا۔ وہ انتہائی غیض وغضب کی تصویر بنا بکواس کیے جا رہا تھا۔ جو منہ میں آرہا تھا کہے جا رہا تھا۔

سر کاشف نے مجمع کی صورت اکٹھے ہوئے طلبہ وطالبات کو اپنی اپنی کلاسز میں جانے کا اشارہ کیا سب نے فوراً ہی کلاسز کی طرف دوڑ لگادی مجمع چھٹ گیا۔

(اس خوب صورت ناولٹ
اگلی قسط آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

افسانہ

نیر شفقت

ایک ...... دو اور یہ تین...... اور یہ گئی تمہارے پاپا کی گوٹ اپنے گھر۔'' اس نے کھلکھلاتے لہجے میں کہا۔ ''واہ مما، کیا بات ہے آپ کی۔ پاپا کی گوٹ ماردی آپ نے۔'' بیٹی کے لہجے میں ستائش تھی۔ اس نے کچھ فخریہ انداز میں سر ہلا دیا۔ ''لگتا ہے یہ......

عورت کی زندگی سے جڑا، ایک خاص رنگ، افسانے کی صورت

''اوہ چھ آ گئے......'' عورت نے خوشی سے نعرہ لگایا اور دوسری بار چھکا پھینکنے کے لیے اسے ہلانے لگی۔

''واہ بھئی بڑی اچھی قسمت ہے تمہاری پہلی باری میں چھ آ گئے۔'' مرد نے کمنٹس دیے۔ عورت فخریہ مسکرانے لگی۔ چاروں فریقوں میں سے کسی کی گوٹ نہیں نکلی تھی سوائے اس کے۔

''زیادہ خوش نہ ہوں آپ مما۔ آپ ہار بھی سکتی ہیں۔'' بیٹے نے اس کی خوشی پر پانی ڈالنا چاہا۔

''اوں ہوں......'' اس نے کہا اس کے لہجے میں دور دور تک ہار کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔

''پھر چھ......'' اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔

☆......☆......☆

صائمہ کا رشتہ کیا آیا فائزہ کی تو لاٹری لگ گئی۔ خاندان کا سب سے امیر اور ہینڈسم لڑکا اور اس کا طلبگار۔ وہ ہکا بکا تھی تو اس کے والدین ششدر۔ اور تو اور رشتہ داروں نے بھی انگلیاں منہ میں داب لی تھیں۔

صائمہ کی امی فائزہ کی امی کی کوئی سیکنڈ یا تھرڈ کزن لگتی تھیں۔ بڑے امیر گھرانے میں بیاہی گئی تھیں۔ امیروں کی بہو بن کر ان میں غرور تو نہیں آیا تھا۔ البتہ کچھ سسرالی مصروفیات اور کچھ دور پار کی رشتے داری کی وجہ سے دونوں گھرانوں کے بیچ کافی فاصلے رہے۔ خوشی یا غمی میں دونوں کا آمنا سامنا ہو جاتا تھا اور ایسے میں صائمہ کی امی بڑی محبت سے فائزہ کی امی سے ملتی تھیں اور نہ صرف انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دیتیں بلکہ خود آنے کا وعدہ بھی کرتیں تھیں مگر یہ وعدہ ہمیشہ وعدہ ہی رہا اور فائزہ کی امی بھی ان کے گھر جانے کی ہمت نہ کر پائیں۔

وہ ایک کلرک سے بیاہی گئیں تھیں۔ ان کے شوہر حق حلال کی کمائی پر یقین رکھتے تھے۔ سو تین بچوں کے ہمراہ وہ سفید پوشی سے زندگی

گزار رہے تھے۔

ایسے میں اگر صائمہ کی امی اپنے لائق فائق بیٹے کا رشتہ فائزہ سے کرنا چاہ رہی تھیں تو حیرت تو ہونا ہی تھی۔ نا صائم نے فائزہ کو خاندان کی ایک شادی میں پسند کیا تھا۔ اس کے والدین کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا کہ وہ کھلے دل کے مالک تھے۔ فائزہ کے والدین نے حیرت کو پسِ پشت ڈال کر اپنے خدشات سے نظریں چراتے ہوئے فائزہ کی شادی کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

وہ اپنے خدشات کو مدنظر رکھتے تو شاید یہ رشتہ کبھی نہ ہو سکتا تھا۔

فائزہ نے سسرال میں قدم یوں رکھا گویا آسمان پہ قدم دھرے ہوں۔ ہاں صائم اور اس کا گھر فائزہ کے لیے آسمان ہی تو تھا۔

تین کنال کی بڑی سی کوٹھی اور اس میں کام کرنے والے نوکر۔ فائزہ کا شوہر اور اس کا سسر اپنے بزنس کو بڑھانے کے چکر میں کوشاں رہتے۔ ساس کو آئے گئے سے فرصت نہ ملتی۔ ایک نند یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔ دیور بھی کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ فائزہ بڑی بہو بن کر آئی

تھی۔ مہینہ بھر تو ساس نے اسے کچن میں گھسنے نہ دیا۔ وہ بھی دعوتوں اور سیر سپاٹوں، ہنی مون، وغیرہ میں مصروف رہی تھی میاں بھی اِس کا دیوار کا پھر اِسے کیا ضرورت تھی کہ کسی اور کو خاطر میں لائے۔

ویسے بھی گھر میں کام کاج کرنے کے لیے نوکر تھے۔ لیکن ہنڈیا کا کام اس کی ساس خود سر انجام دیتی تھیں کہ اس کے سسر کو نوکروں کے ہاتھ کا بنا ہوا سالن پسند نہ تھا۔ ویسے بھی اس کی ساس کا کہنا تھا گھر کی عورت اپنے بچوں اور شوہر کے لیے ہاتھ سے کھانا بنائے تو نہ صرف آپس میں محبت بڑھتی ہے بلکہ برکت بھی ہوتی ہے۔

اور یہی سب کچھ فائزہ سے بھی چاہتی تھیں۔ فائزہ کو اعتراض بھی کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے گھر میں بھی بہت اچھا کھانا بنا لیتی تھی۔ کھیر میں ہاتھ ڈلوانے کے بعد یہاں بھی اس نے کھانا بنانا شروع کیا تو سب ہی سے تعریفیں سمیٹیں۔

☆......☆......☆

ایک...... دو اور یہ تین...... اور یہ گئی تمہارے پاپا کی گوٹ اپنے گھر۔'' اس نے کھلکھلاتے لہجے میں کہا۔

''واہ مما...... کیا بات ہے آپ کی۔ پاپا کی گوٹ ماردی آپ نے۔'' بیٹی کے لہجے میں ستائش تھی۔ اس نے کچھ فخریہ انداز میں سر ہلا دیا۔

''لگتا ہے یہ گیم تو مما ہی جیتیں گی۔'' بیٹے نے کمنٹس پاس کیے تو وہ مسکرادی۔

☆......☆......☆

اس نے گویا ضد ہی پکڑ لی تھی۔ ساس نندوں کے ساتھ اس کا گزارہ نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ ساس نندیں کیا صرف ایک نند کے ساتھ اس کا گزارہ نہیں ہو رہا تھا۔ ملیحہ یونیورسٹی میں ایم ایس سی

کر رہی تھی اور اپنی بیسٹ فرینڈ سونیا کو اپنی بھابی بنانا چاہتی تھی۔ سونیا بھی صائم کو بہت پسند کرتی تھی۔ بلکہ یہ دونوں تو ان آفیشلی ایک دوسرے کو نند بھاوج مان چکے تھے۔

مگر برا ہوا فائزہ کا جو وہ صائم اور سونیا کے بیچ میں آ گئی۔ اور آفیشلی بنتے بنتے وہ ان آفیشلی رشتہ بھی گیا۔ ملیحہ کو اس کا بہت قلق تھا اور وہ فائزہ کو نہ دلی طور پر قبول کر رہی تھی اور نہ ہی ذہنی طور پر۔ اس سلسلے میں اس کی ماں اور صائم سے لڑائی بھی ہوئی تھی اور اس نے سونیا کو بھابی بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگایا تھا مگر ماں نے یہ کہہ کہ بات ختم کردی کہ زندگی صائم کی ہے اسی نے گزارنی ہے۔ لہٰذا میں سونیا کو لا کر صائم کی زندگی اور خراب نہیں کر سکتی۔

اور اب اسی بات کو لے کر وہ اٹھتے بیٹھتے فائزہ کے ہر عمل میں کیڑے نکالتی رہتی۔

''فائزہ چھوٹے سے گھر سے آئی ہے۔ اسے کیا پتا بڑے گھروں میں کیسے رہا جاتا ہے۔''

''سستے کپڑے پہننے والوں کو کیا پتا ورائٹیز کس بلا کا نام ہے۔''

''سستے پلاسٹک اور سٹیل کے برتنوں میں کھانا کھانے والوں کو کیا پتا کراکری کیسے استعمال کی جاتی ہے۔ اور ایسی کتنی ہی باتیں تھیں جنہوں نے فائزہ کا جینا محال کر رکھا تھا۔ شادی کے شروع دنوں میں تو وہ مروت میں خاموش رہتی تھی۔

پھر یہ سوچ اسے بولنے سے روکتی کہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ رخصت ہو کر اپنے گھر چلی جائے گی تو سکون ہو جائے گا۔

تعلیم مکمل ہوئی تو اس نے ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں جاب کر لی۔ اب مزید پانچ سال تک اس کا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لامحالہ

فائزہ کے صبر کا پیمانہ لبریز تو ہونا ہی تھا۔ ویسے بھی وہ اب تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ دو بیٹوں نے اس کی حیثیت بلند کر دی تھی اور وہ اس پوزیشن میں تھی کہ صائم سے اپنی بات منوا سکے۔ پھر وہ اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتی۔

بیٹی کے دل میں فائزہ کے لیے جو کہنا تھا اس سے ماں بھی اچھی طرح واقف تھی۔ اور وہ بہو کے صبر کی داد بھی دیتی تھیں۔ مگر کب تک۔ بالآخر انہیں ہتھیار ڈالنے ہی پڑے اور فائزہ اپنی راجدانی کی بے تاج ملکہ بن گئی۔

☆......☆......☆

یہ ضروری تو نہیں ہے...... تمہاری مما ہار بھی تو سکتی ہیں...... '' شوہر نے مسکراتے ہوئے بیٹے کو مخاطب کیا۔

'' نہیں جناب...... میں نہیں ہوں ہارنے والی۔ '' اس نے فخر سے کہا۔ '' دیکھ لینا جیتوں گی'' اچھا شوہر...... نے دانے پھینکتے ہوئے کہا۔

'' تو یہ لو پھر اپنی پکی گوٹ...... ایک دو اور تین۔ ''

☆......☆......☆

صائم کے متعلق آج کل اسے نئی نئی خبریں مل رہی تھیں۔ وہ کسی لڑکی میں انٹرسٹڈ ہے۔ ساری دنیا کو پتا لگ چکا تھا مگر ایک وہی بے خبر تھی۔ وہ تو ایک دن اس کا دیور گھر آیا تو اس سے فائزہ کو پتا لگا۔

'' بھابی...... بھائی پر نظر رکھیں۔ ''

'' کیوں بھئی...... کیا ہوا ہے؟ '' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ دیور اس کا ہمدرد تھا۔ اسے ترحم سے دیکھتے ہوئے بولا۔

'' آپ کو نہیں پتا بھابی...... '' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ '' بھائی کسی لڑکی کے چکر میں ہیں۔ ''

'' ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ '' کتنی دیر گم صم رہنے کے بعد اس کے منہ سے نکلا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس کی خواہش پر وہ اس گھر میں آئی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کی خواہش کرنے لگا ہے۔

'' ایسا ہو رہا ہے بھابی...... آپ بھائی پر نظر رکھا کریں۔ ''

اس کے بعد وہ کتنی دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا اور کیا کیا باتیں کرتا رہا۔ اس نے چائے پلائی یا کولڈ ڈرنک سے خاطر تواضع کی، اسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو بس گم صم ہو کر رہ گئی تھی۔

'' صائم آئیں گے تو میں خود اُن سے پوچھوں گی۔ '' دیور کے جانے کے بعد اس نے سوچا۔

'' مگر کیا پوچھوں...... اگر صائم نے اس خبر کی تردید کر دی تو کیا میں یقین کر پاؤں گی۔ ''

'' مجھے خاموشی سے جائزہ لینا چاہیے۔ ''

ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔

بالآخر سوچ سوچ کر وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔ اس نے صائم کے روز و شب کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ تک سک سے تیار ہو کر وہ تو ہمیشہ ہی سے جاتا تھا کہ اپنے لباس اور تیاری کے معاملے میں وہ بہت کانشس تھا اور بیوی بچوں کے لیے بھی ایسا چاہتا تھا۔ اور اب بھی وہ ایسے ہی آفس کے لیے تیار ہوتا تھا۔

مگر شام کی تیاری تھوڑی مختلف ہو گئی تھی۔ شام میں دوبارہ شیو بنائی جاتی، بڑے سلیقے اور محنت سے جیل لگا کر بال جمائے جاتے۔

ڈھیروں ڈھیر پرفیوم انڈیلا جاتا۔ ساتھ ساتھ گنگناہٹیں بھی جاری رہتیں۔ تو گویا عمیر ٹھیک

کہہ رہا تھا مجھے اس سے پوچھنا چاہیے۔ ویسے بھی اب بات تو کنفرم ہوگئی ہے۔ اس نے صائم کی تیاری کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ ویسے بھی عمیر کے علاوہ اور بہت سے خیر خواہوں نے بھی فائزہ کو وارن کیا تھا۔

اب اگر میں نے اس بات سے صرف نظر کیا تو یہ میرے ساتھ زیادتی ہوگی۔'' فائزہ نے سوچا اور بات کرنے کے لیے تمہید باندھی۔

''کہاں جارہے ہیں؟''

''ہوں؟'' وہ اپنی تیاری میں کچھ زیادہ ہی مگن تھا۔

''ہاں......'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔''

''ایک دوست سے بڑے عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے اسی کو ڈنر پر انوائیٹ کیا ہے۔''

''میں بھی چلوں آپ کے ساتھ......؟'' اس نے محض چیک کرنے کے لیے جانے کا شوشہ چھوڑا۔ ویسے بھی ان کی سوسائٹی میں بیوی کا شوہر کے ساتھ ڈنر وغیرہ پر جانا کوئی بات معیوب نہیں تھی اور فائزہ جانتی تھی کہ وہ اپنی شام خراب تو نہیں کرے گا۔

''پاگل ہوئی ہو۔'' دوست کی فیملی کو انوائیٹ کرتا تو تمہیں ضرور لے کر جاتا اور ویسے بھی صرف وہی دوست نہیں ہیں بلکہ چند اور پرانے دوست بھی ہیں۔ کچھ پرانی یادوں کو تازہ کریں گے۔'' اس کے بعد فائزہ کے لیے کوئی گنجائش بھی نہیں تھی کہ وہ جانے کے لیے ضد کرتی۔

''اچھا......'' اس نے گویا منہ لٹکا کر کہا۔

''صائم......'' وہ اپنے اوپر پرفیوم کی بارش کر رہا تھا جب فائزہ نے اسے پکارا۔

''ہوں......''

''یہ...... صدف...... کون ہے؟'' اس نے گویا دھماکہ کرنے والے انداز میں پوچھا۔

''صدف...... کون صدف......؟'' اس کے چہرے کا رنگ واضح طور پر اڑا تھا۔ میں کسی صدف کو نہیں جانتا۔ پپ پتا نہیں تم...... کس کی بات کررہی ہو۔

''میں اس صدف کی بات کر رہی ہوں۔ جس کے ساتھ تم ڈنر کرنے جا رہے ہو۔ اس نے چبا چبا کر جملہ بولا۔ یوں جیسے صدف کو چبا رہی ہو۔

اور کل رات جسے میں نے تمہارے ساتھ ڈولمن مال میں شاپنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

''ہوں......'' صائم بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھا گویا راز کھل چکا تھا۔ اب کیا پردہ رکھنا۔'' اس نے سوچا پھر کہنے لگا۔

''ہاں میں جانتا ہوں صدف کو اور تمہارا خیال درست ہے میں اسی کے ساتھ ڈنر کرنے جا رہا ہوں۔

محبت ہوگئی ہے مجھے اس سے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

فائزہ کی سب گوٹیاں ایک ایک کر کے مر رہی تھیں۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں گویا ختم ہوچکی تھیں۔

''اب تسلی ہوگئی تمہیں صدف کے بارے میں جان کر۔''

''صدف میں ایسا کیا ہے جو تمہیں مجھ میں نہیں ملا، اس کے وجود سے جیسے مری مری سی آواز نکلی تھی۔

فائزہ تم ہر لحاظ سے ایک بہت اچھی بیوی اور ایک اچھی ماں ہو اور مجھے تم سے آج بھی بہت محبت ہے کہ بہرحال تم میری زندگی میں آنے والی پہلی عورت ہو۔ مگر مجھے صدف سے محبت ہوگئی

ہے۔اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔
''مرد تو دریافت کا پرندہ ہوتا ہے۔'' اسے کسی رسالے میں پڑھا ہوا جملہ یاد آ گیا۔ایک جزیرہ دریافت کر لیتا ہے تو اگلے جزیرے کو دریافت کرنے نکل کھڑا ہوتا ہے۔
اگر میں آپ کو دوسری شادی کی اجازت نہ دوں تو......؟'' اس کا لہجہ اب بھی ہارا ہوا تھا۔مگر کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے کیا خبر ہارتے ہارتے جیت ہو جائے۔
''فائزہ......تم مجھے اجازت دو یا نہ دو۔مجھے یہ شادی ہر حال میں کرنی ہے۔میں اسے یہاں نہیں لاؤں گا بلکہ الگ گھر میں رکھوں گا۔یہ گھر تمہارا ہے تمہیں میری طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔میں آتا جاتا رہوں گا کہ بہر حال میرے بچے یہاں رہتے ہیں۔
صدف کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا نہ وہ تمہارے سامنے آئے گی نہ ہماری فیملی میں شامل ہوگی۔بس وہ صرف میری بیوی ہی ہوگی۔اس سے زیادہ میں تمہارے لیے اور کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔''
وہ اپنے شوہر سے ہار گئی تھی۔بلکہ بری طرح پٹی تھی۔اس کی پکی گوٹ مار دی تھی۔اس نے۔دو گوٹیں پہلے ہی گھر میں تھیں۔
''کوئی بات نہیں۔'' اس نے سوچا۔'' بچے ابھی کھیل رہے ہیں نا۔اور ہیں تو وہ بچے ہی۔انہیں ہرانا تو بہت آسان ہے۔

☆......☆......☆

ماما...... میں شادی کروں گی تو صرف ایاز سے ورنہ......''
''ورنہ......؟'' ورنہ کیا کرو گی تم۔گھر سے بھاگ جاؤ گی یا پھر کورٹ میرج کر لوں گی۔فائزہ کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔عالیہ کا بہت اچھا رشتہ آیا تھا۔لڑکا سول اسپتال کا سینئر سرجن تھا اور ان لوگوں نے بڑی چاہ سے عالیہ کا ہاتھ مانگا تھا۔فائزہ اور صائم کچھ ہی دنوں میں ہاں کرنے والے تھے۔
صائم نے صدف سے شادی کر لی تھی۔شروع شروع میں تو اس نے پورا وقت صدف کو دیا گھر کا چکر بھی وہ کبھی کبھار لگایا کرتا تھا۔مگر اب اس نے از خود ہی باری مقرر کر لی ایک دن صدف کا اور ایک دن فائزہ کا۔پہلے تو صائم کی دوسری شادی سے فائزہ بہت ہرٹ ہوئی تھی۔مگر سمجھوتے کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی نہ تھا۔والدین کے گھر پہ بھائیوں اور بھابیوں کا قبضہ تھا۔بچوں کو لے کر کہاں جاتی سو صبر شکر سے سمجھوتے کی راہ اپنا لی۔دل کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر اب وہ تقریباً نارمل تھی۔سب کچھ پہلے کی طرح ہو گیا تھا۔صائم کے ساتھ بات چیت بھی ہوتی تھی اور صلاح مشورے بھی۔اور یہ رشتہ بھی صائم اور فائزہ کی صلاح مشورے کے بعد طے پانے جا رہا تھا۔مگر عالیہ کا دل تو ایاز کی محبتوں میں اٹک گیا تھا۔
فائزہ ان ماؤں میں سے ہرگز نہیں تھی۔جو اولاد کی خوشیوں کی راہ میں حائل ہوتی مگر ایاز کا کچھ بیک گراؤنڈ تو ہوتا۔پیچھے کہیں سے اس کے والدین کسی گاؤں کے مزارع تھے۔وہ شہر میں لکھنے پڑھنے آیا تو شہر کا ہی ہو کر رہ گیا۔چلو یہ بھی گوارہ تھا اگر ایاز کا حال اچھا اور مستقبل روشن ہوتا۔سمپل بی اے کر کے اونچی پوسٹ کے خواب دیکھنے والا ایاز نہ فائزہ کو پسند آیا نہ صائم کو۔وہ اپنی بیٹی کو خوش دیکھنا چاہتے تھے اور ایاز کے ساتھ وہ کبھی خوش نہ رہ پاتی۔یہ ان کا

تجربہ کہتا تھا جب ہی تو سرجن کا رشتہ آیا تو انہوں نے بے چوں چراں کیے اسے قبولیت کی سند دے دی اور اب چند ہی دنوں میں ہاں کر کے شادی کی تاریخ بھی دینی تھی اور اب عالیہ یہ پھڈا کھڑا کے بیٹھ گئی۔

''ہاں میں بھاگ بھی سکتی ہوں اور کورٹ میرج بھی کر سکتی ہوں۔''

فائزہ کی آنکھوں سے جو شعلے نکلے تھے اس میں حدت کی کچھ کمی تھی کہ کچھ تو وہ ماں تھی اور کچھ عمر کا تقاضا مگر عالیہ کی آنکھوں سے جو شعلے نکل رہے تھے وہ پوری طرح ظاہر کر رہے تھے جو کچھ وہ کہہ رہی ہے وہ کر گزرے گی۔ اب پتا نہیں یہ ایاز کی محبت کی گرمی کے شعلے تھے یا اس کی جوانی کے۔ مگر جو بھی تھے دوسرے کو بھسم کر دینے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔

ایک دفعہ تو فائزہ ڈر گئی کہ عالیہ جو کچھ کہہ رہی ہے واقعی کر نہ گزرے۔ پھر اس نے خود کو تسلی دی کہ عالیہ ان کی اولاد ہے وہ یقیناً والدین کا مان رکھے گی۔ یہی سوچ کر اس نے منگنی کے بجائے ڈائریکٹ شادی کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس دن اس نے عالیہ کے سسرال والوں کی دعوت کی ہوئی تھی۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ ہاں کر کے جلد شادی کا تقاضا کر دیں گے۔ یقیناً وہ مان بھی جائیں گے۔

''ماما میری بات سنیں۔'' وہ کچن میں اپنی نگرانی میں کُک سے ڈشز بنوا رہی تھی۔ جب عالیہ نے کچن کے دروازے پر کھڑے ہو کر اسے پکارا۔

''ہاں بولو......'' وہ مصروف انداز میں بولی۔

کمرے میں چل کر میری بات سنیں۔ فائزہ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ مگر وہ اسے ساتھ لیے اس کے کمرے میں آ گئی۔

''ہاں بولو......'' اس کا انداز روکھا سا تھا مگر دل اتھل پتھل ہو رہی تھی۔

''بہتر ہوگا آپ یہ سب تماشا بند کر دیں۔'' عالیہ کا لہجہ ماں سے بڑھ کر روکھا تھا۔

''پتا نہیں میری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی۔ اس نے سوچا یا پھر میری بے جا آزادی کا نتیجہ ہے۔''

''کون سا تماشا۔'' اس نے بالآخر پوچھا۔

''یہ میری شادی کا۔'' اس نے کچھ لمحے توقف کیا پھر بالآخر دھماکہ کر ہی دیا۔

''میں نے ایاز سے نکاح کر لیا ہے۔''

فائزہ کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو گئیں تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔ پھر خاموشی سے بنا کچھ کہے نے باہر آ گئی۔ اور اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی۔ کمرے میں جانے سے پہلے وہ فائزہ کے متوقع سسرال والوں میں فون کر کے اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر دعوت سے معذرت کرنا نہیں بھولی تھی۔

☆......☆......☆

بیٹی نے بڑے آرام سے اُسے ہرا دیا تھا۔ اس کا منہ کچھ لٹک سا گیا تھا۔

''واہ......'' اس کے شوہر نے بیٹی کی حوصلہ افزائی کی۔ ''اب دیکھتے ہیں ماں بیٹے میں سے کون جیتتا ہے۔''

'دیکھ لینا پاپا...... میں ہی جیتوں گا۔'' بیٹے نے فخریہ لہجے میں کہا۔

باپ بیٹی سے ہار جانے کے بعد عورت کا اعتماد اب کچھ ڈگمگا سا گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی باری لینے لگی۔

☆......☆......☆

''ماما! میں اور رامین، گلبرگ شفٹ ہو رہے ہیں۔''

''گلبرگ......؟ مگر کیوں......؟'' فائزہ نے سوالیہ انداز میں بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی گلبرگ...... رامین کی ممی کے ہاں۔'' اسد نے وضاحت کی۔

''کیوں ......؟'' یہاں کوئی پرابلم ہے تم لوگوں کو۔'' انہوں نے استفسار کیا۔

''نہیں ماما...... ہمیں کوئی پرابلم نہیں ہے یہاں۔ بلکہ رامین تو آپ کے اور آپ کے Behaviour کی بہت تعریف کرتی ہے مگر۔''

''مگر کیا......'' فائزہ نے بے تابی سے پوچھا۔

ابھی تین ماہ پہلے ہی اسد کی شادی بہت دھوم دھام سے کی تھی۔ شادی تو انہوں نے عالیہ کی بھی دھوم دھام سے کی تھی کہ اپنی عزت تو بچانی تھی۔ مگر وہ رونق اور خوشی مفقود تھی۔ بس ایک فرض تھا۔ جو فائزہ اور صائم نے ادا کیا۔ اشعر باہر پڑھنے گیا تو وہیں کا ہی ہو کر رہ گیا۔ اس نے شادی بھی وہیں ایک آسٹریلین لڑکی سے کر لی تھی۔''

اب لے دے کے اسد کی ہی رہ گیا تھا۔ جس کی شادی فائزہ نے اپنی مرضی سے کی تھی اور بہت دھوم دھڑ کے سے کی تھی۔ اپنے دل کے وہ سارے ارمان نکالے تھے۔ جو بیٹے کے پیدا ہوتے ہی مائیں اپنے دل میں پالنے شروع کر دیتی ہیں۔

اور اب صرف تین ماہ بعد ہی بیٹا علیحدہ شفٹ ہونے کا کہہ رہا تھا۔

''مگر...... رامین اپنی ممی کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ یونو وہ اپنی ممی کی بہت لاڈلی ہے۔ پھر نسرین اور نگین دونوں ہی اسٹیٹس میں ہوتی ہیں اور رامین کی شادی کے بعد ممی بہت اکیلی ہو گئی ہیں۔ اس لیے وہ چاہتی ہے کہ ہم دونوں ان کے پاس رہ لیں۔'' اسد نے تفصیل بتائی۔

''تمہارے چلے جانے کے بعد میں بھی تو اکیلی ہو جاؤں گی اسد......'' فائزہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''تمہیں رامین کی ممی کا خیال تو ہے لیکن اپنی ماں کا تو کوئی احساس نہیں ہے۔''

''اوہ ماما! کیسی بچوں والی باتیں کر رہی ہیں آپ۔''

پاپا ہوتے ہیں نا آپ کے پاس۔ اور اگر زیادہ تنہائی فیل کریں تو عالیہ اور ایاز کو اپنے ساتھ رکھ لیں۔ وہ جو کرائے کے گھروں میں رُل رہی ہے اُسے بھی سکون مل جائے گا۔'' اسد نے آسان ساحل ماں کو بتایا۔

''ہم بہرحال فیصلہ کر چکے ہیں۔'' اس نے دوٹوک کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

فائزہ کے لیے اب بحث کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔''

☆......☆......☆

جتنی تیزی سے اس نے جیتنا شروع کیا تھا۔ اتنے ہی آرام سے اسے مات ہو گئی تھی۔ اور وہ زندگی سے بہت بری طرح ہار رہی تھی۔

عورت کو بالآخر ہارنا ہی پڑتا ہے۔ چاہے وہ بیوی بن کر شوہر سے ہارے یا ماں بن کر اولاد سے۔ ہار عورت کا ہی مقدر بنتی ہے۔ شاید اس لیے کہ ہر رشتہ عورت سے ہی منسوب ہوتا ہے۔

☆☆......☆☆

اگر کچھ نہ دیا تو ہمیں اور ہمارے بچوں کو نہ دیا۔ اب دیکھو گاؤں کی زمین پر مہرو کے لیے ہسپتال تعمیر کیا جائے گا۔ دادو نے نصیب رشتہ کرتے ہوئے بچی کی کو میری بیٹیاں نظر نہ آئیں۔ محبت ماں بیٹی نے مہرو۔ تنگ نہ کیہ کرنے کے لیے۔ جانے آمنہ نے۔۔۔

محبت کے مدوجزر لیے، ایک خوب صورت مکمل ناول

"مہرو۔۔۔مہرو۔" اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے کے درمیان سندس آپی کھڑی تھیں۔

"جی۔۔۔۔" ہاتھ میں پکڑی کنگھی واپس بیڈ پر رکھتے ہوئے وہ ان کی جانب متوجہ ہوئی۔

"تمہیں نیچے دادی بلا رہی ہیں۔" اطلاع دے کر وہ بنا جواب سنے ہی واپس پلٹ گئی۔ یہ اس وقت دادی کو میں کیوں یاد آ گئی۔

اس نے سامنے لگی دیوار گیر گھڑی پر ایک نظر ڈالی جو دوپہر کے تین بجا رہی تھی اس کا ارادہ ابھی نہا کر کچھ دیر سونے کا تھا کہ دادی کا بلاوا آ گیا۔

پاؤں میں سلیپر پھنسائے وہ نیچے اتر آئی، سیڑھیوں کے بالکل ساتھ ہی وہ کمرہ تھا جہاں آج کل دادی رہائش پذیر تھیں۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ جانے وہ اپنا باکس کھولے کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔

"دادی آپ نے بلایا مجھے۔"

نیند سے بند ہوتی آنکھیں بمشکل کھولتی وہ دادی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"نہیں تو۔"

اس کی آواز سنتے ہی دادی نے سر اوپر اٹھایا۔

"میں نے تو صابرہ کو بلایا تھا آ کر میرا سامان الماری میں رکھنے میں میری مدد کرے۔ یہ تمہیں کس نے بھیج دیا۔" اُسے اپنے سامنے کھڑے جمائیاں لیتے دیکھ کر دادی نے خیریت سے سوال کیا۔ "سندس آپی نے۔" آہستہ سے جواب دیتی وہ وہیں بیٹھ گئی۔

"ارے تم جاؤ جا کر سو، غضب خدا کا! بچی صبح سے داخلے کے لیے خوار ہو رہی ہے! ابھی گھر پہنچی اور بھگا دیا میرے کام کے لیے۔" انہوں نے غصے سے کہتے قریب رکھا چشمہ اٹھایا، آنکھوں پر جمایا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ضرور تمہاری تائی نے صابرہ کو اپنے کسی کام میں الجھا رکھا ہوگا۔ جب سے میں یہاں آئی ہوں صابرہ کی شکل دیکھنے کو ترس گئی۔"

صابرہ دادی کی ملازمہ خاص تھی۔ جس کے بنا گاؤں میں ان کا ایک پل نہ گزرتا تھا۔ یہی وجہ تھی جو وہ اسے شہر میں بھی اپنے ساتھ ہی لے آئیں۔ لیکن

یہاں آتے ہی تائی نے اُسے اپنے کاموں میں الجھایا کہ وہ دکھائی ہی نہ دیتی۔ دادی واویلا کرتی رہ جاتیں، ہمیشہ مہرو کو آگے بڑھ کر ان کی مدد کرنا پڑتی

جبکہ گاؤں میں تو کبھی مہرو نے خود اٹھ کر اپنے ہاتھ سے پانی نہ پیا تھا۔

بیٹھ جائیں دادی اتنا غصہ مت کریں۔ میں

دیکھتی ہوں وہ کہاں ہے۔''

بمشکل مہر النساء نے کندھوں سے تھام کر دادی کو واپس بستر پر بٹھایا اور پھر بنا ان کی کوئی بات سنے باہر نکل آئی۔ پورا لاؤنج خالی پڑا تھا۔ شدید گرمی کے باعث گھر کا ہر فرد غالباً اپنے اپنے کمرے میں موجود اے سی کی سہولت سے حتی الامکان فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچن کا دروازہ بھی بند تھا۔ وہ باہر نکل آئی جالی کے دروازے سے اُس نے باہر جھانکا بڑے سے صحن میں کپڑوں کی مشین لگائے صابرہ دھڑا دھڑ دھلائی کرنے میں مصروف تھی۔ مہرو نے دروازہ کھولا گرم لُو کے تھپیڑے اُس کے چہرے سے ٹکرائے۔

''صابرہ تمہیں دادی بُلا رہی ہیں، انہیں اپنے کپڑے سیٹ کرنے ہیں، جا کر اُن کی مدد کرو۔''

وہ وہیں کھڑے کھڑے چلائی۔ گرمی کی شدت نے اُسے ایک قدم باہر نکالنے نہ دیا۔

''اچھا جی! صحن دھو کر جاتی ہوں۔''

گیلے لباس کے ساتھ اُس نے بڑے مزے سے صحن دھوتے ہوئے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''جلدی چلی جانا، دادی سخت ناراض ہو رہی ہیں۔''

اسے ہدایت دیتی وہ واپس اوپر اپنے کمرے میں آ گئی جلدی جلدی کھڑکی بند کر کے اے سی آن کیا اور بنا نہائے ہی سو گئی۔ وہ ہمیشہ سے ہی نیند کی کچی تھی اور نیند کے آگے اسی طرح ہار جایا کرتی تھی۔

☆......☆......☆

وہ جیسے ہی کالج سے واپس آئی صحن میں موجود چارپائی پہ بکھرا سامان دیکھتے ہی سمجھ گئی گاؤں سے کوئی آیا ہے۔ بڑا سا اچار کا مرتبان چارپائی کے قریب ہی دھرا تھا۔ مہرو نے آگے بڑھ کر بڑے بڑے تھیلوں کے اندر جھانکا۔ دیسی گھی کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی، چاول کے آٹے کی پنیاں بھی موجود تھیں۔ ڈھیر سارا میوے والا گڑ تو اُسے ہمیشہ سے ہی بہت پسند تھا۔ ایک ڈبے میں اخروٹ کا حلوہ تھا جو یقیناً خود اماں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے بنا کر بھیجا ہوگا۔ سارا سامان دیکھتے ہی گھر والوں کی محبت یک دم ہی اس کے دل میں عود آئی۔

''دادی یہ سب کون لایا ہے؟''

اس نے سامان سے کچھ دور کرسی پر بیٹھی دادی کو پکارا۔ عام طور پر گاؤں سے ہر ہفتہ بابا اس کے لیے کچھ نہ کچھ بھیجتے تھے جو زیادہ تر اللہ بخش لے کر آتا تھا۔ اللہ بخش اُن کا خاندانی ڈرائیور تھا، جسے سب چاچا کہہ کر پکارتے تھے لیکن جب بھی ایسا ہوتا اللہ بخش اس سے ملے بنا واپس نہ جاتا۔ تین ماہ میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ آج سامان موجود تھا مگر چاچا اللہ بخش غائب، یہ ہی وجہ تھی جو اُس نے دادی سے سوال کیا۔

''کبیر آیا ہے۔ اُسی کے ہاتھ سلامت علی نے سامان بھیجا ہے۔''

کبیر کی آمد کی خوشی دادی کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔

''اچھا......''

مہرو نے ہاتھ میں پکڑا تھیلا واپس چارپائی پہ رکھ دیا۔ کبیر اُس کی بڑی پھوپو کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جس سے مہرو کی نسبت اُس وقت طے ہوئی تھی جب وہ صرف دو سال کی تھی۔ مگر اتنے سالوں کی طے شدہ نسبت بھی اسی مہرو کے قریب لانے میں ناکام رہی۔ وجہ شاید کبیر کا رویہ تھا۔ جو مہرو کو کبھی بھی دوستانہ محسوس نہ ہوا۔ وہ ایک غصیلہ اور اکھڑ مزاج شخص تھا۔ جس سے خاندان کی تمام لڑکیاں بات کرتے ہوئے گھبراتی تھیں۔ ایسا بھی نہ تھا کہ وہ کوئی جاہل شخص

تھا۔ وہ ایک مقامی یونیورسٹی میں زراعت کی تعلیم حاصل کررہا تھا۔ جبکہ مہرو کے تعلیم حاصل کرنے پر بھی اسے کوئی اعتراض نہ ہوا بلکہ پھوپو کی تو ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ ان کی بہو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو۔ ان کی اس خواہش کے پیش نظر مہر النساء اپنے پیارے گھر والوں سے دور اپنے تایا ابو کے گھر رہ رہی تھی۔ جہاں دو ماہ قبل ہی اس کا ایک مقامی میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا تھا۔ بابا تو چاہتے تھے کہ وہ چار سال تعلیمی مدت ہوسٹل میں پورے کرے مگر تایا ابو کو یہ پسند نہ تھا کہ ان کی موجودگی میں مہرو ہوسٹل کی زندگی گزارے اسی سبب وہ دادی اور صابرہ کے ساتھ ان کے گھر آ گئی۔ تایا ابو کے گھر کبیر سالوں میں ایک بار چکر لگاتا تھا، وہ بھی تب جب پھوپو ساتھ ہوتیں۔ مہرو کے خیال میں اُس کی سندس آپی یا سلویٰ کے ساتھ زیادہ دوستی نہ تھی کیوں کہ مہرو نے اُسے کبھی ان سے زیادہ بات کرتے نہ دیکھا تھا ان ہی سوچوں میں گم وہ برآمدے کا دروازہ دھکیلتی اندر داخل ہوئی تھی کہ اچانک باہر نکلتی شخصیت سے بری طرح ٹکرا گئی۔

''آنکھیں کھول کر چلنے کی عادت ڈالو ہر وقت سوتی پھرتی ہو جو آگے پیچھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔''

کبیر کی غصیلی آواز اس کے کانوں سے ٹکراتے ہی چودہ طبق روشن کر گئی۔

''سوری۔''

مارے گھبراہٹ کے حلق سے اس ایک لفظ کے علاوہ کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔

''نہ سلام نہ دعا شہر آتے ہی ساری تمیز بھول بھال گئیں۔'' اس نے سر اٹھا کر دیکھا کبیر سینے پر دونوں ہاتھ باندھے اس کے عین سامنے کھڑا بری طرح اُسے گھور رہا تھا۔

کیا مصیبت ہے ویسے تو کبھی زندگی میں اس شخص نے مجھ سے بات نہیں کی اور آج اگر غلطی سے کرلی ہے تو مسلسل ڈانٹے جارہا ہے۔

کبیر کے ماتھے پر پڑی تیوریوں سے خائف ہوتے ہوئے اس نے سوچا۔

''یہ دل ہی دل میں مجھے گالیاں دینا بند کرو اور ہٹو دروازے کے آگے سے تاکہ میں باہر نکل سکوں۔

یہ اندازہ شاید اسے مہرو کے چہرے کے تاثرات سے ہوا۔

''اوہ......''

مہرو کو جیسے ہی یہ احساس ہوا کہ وہ دروازے کے عین درمیان اس کا راستہ روکے کھڑی ہے۔ وہ یک دم شرمندہ سی ہو گئی۔

''سوری۔''

نہ چاہتے ہوئے بھی پھر منہ سے وہی لفظ نکلا۔ مارے گھبراہٹ وہ دروازے سے کئی کوس دور ہو گی۔ دندناتا کبیر اس کے پاس سے گزرتا ہوا باہر نکل گیا۔

''شکر الحمد اللہ۔''

دل ہی دل میں شکر ادا کرتے ہی بے اختیار اس کی نگاہ سامنے پڑی جہاں سب سے اوپر والی سیڑھی پر سندس آپی کھڑی تھیں، جن کے ہونٹوں پر چھائی مسکراہٹ دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ ساری گفتگو سن چکی ہیں۔ مہرو نہایت ڈھٹائی سے انہیں مکمل نظر انداز کرتی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

''تمہیں یاد ہے جب تم چھوٹی سی تھیں تو بہت ہی موٹی اور کالی تھیں، چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں والی مہرو۔''

اس نے سر اٹھا کر دیکھا سامنے موجود یحییٰ کے چہرے پر نہایت ہی نرم سی شرارتی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''اور ہاں یاد آیا تمہاری ناک بھی ہر وقت بہتی

رہتی تھی۔ اور جب تم روتی تھیں تو کانوں کے پردے پھاڑ دیتی تھیں۔‘‘

وہ مسلسل اُسے چڑا رہا تھا۔

’’اور خود تو جیسے کوئی بہت بڑے ہیرو تھے، جیسے کالے سوکھے بچپن میں تھے ویسے ہی ابھی بھی ہو ذرا نہیں بدلے۔‘‘

اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے پورا مقابلہ کیا۔

’’ایک تو تم دونوں لڑتے بہت ہو۔‘‘

سلوئی نے اُس کے قریب رکھے کشن پر بیٹھتے ہوئے لقمہ دیا۔ لو میں بھلا کب لڑ رہا ہوں میں تو یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ بڑی ہو کر مہرو بہت خوبصورت ہو گئی ہے پہچانی ہی نہیں جا رہی ہے، مگر میری پوری بات کوئی سنے تب نہ۔ یہاں تو بنا کچھ سنے ہی لڑائی شروع۔‘‘

یحییٰ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ وہ پچھلے ایک ماہ سے اپنے دوستوں کے ساتھ پاکستان ٹور پر گیا تھا جہاں سے اُس کی واپسی آج صبح ہوئی تھی۔ وہ سندس سے چھوٹا اور سلوئی سے بڑا تھا اور ان دونوں کی نسبت اس کی دوستی مہرو سے زیادہ تھی۔

’’پلیز اب تم یہ مت سمجھنا کہ میں بھی جوابی طور پر تمہاری تعریف کروں گی۔ میرا ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔‘‘

مہرو نے صوفے پر رکھا اپنا کوٹ اٹھاتے ہوئے اسے جتلایا۔ کچھ دیر قبل کالج سے واپس آئی تھی اور یحییٰ کو دیکھ کر وہیں لاؤنج میں بیٹھ گئی۔

’’کہاں جا رہی ہو بیٹھو یار؟‘‘

وہ جیسے ہی جانے کے لیے اٹھی، تو یحییٰ نے آواز دے کر اُسے روکنا چاہا۔

’’سوری مجھے بہت سخت نیند آ رہی ہے۔ اب انشاء اللہ شام میں ملاقات ہو گی۔ بائے اینڈ اللہ حافظ۔‘‘

اُسے جواب دیتی وہ اپنی کتابیں اٹھائے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی کیونکہ نیند کے معاملے میں وہ کوئی کمپرومائز نہیں کر سکتی تھی۔

☆......☆......☆

وہ جیسے ہی فوڈ سینٹر سے باہر نکلی بے خیالی میں نگاہ سامنے سے گزرتی جیپ پر پڑی اُسے لگا جیسے فرنٹ سیٹ پر کبیر بیٹھا ہے۔ جس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی موجود تھی۔ یقیناً وہ گاڑی کبیر کی تھی۔ جس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر کوئی اور نہیں سندس آپی تھیں۔ ان دونوں میں سے کسی کی توجہ بھی مہرو پر نہ تھی۔ آہستہ آہستہ چلتی جیپ اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اُسے حیرت ہوئی سندس آپی کبیر کے ساتھ، اُس نے تو کبھی ان دونوں کو آپس میں بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اُسے کوئی کتاب چاہیے تھی جس کے لیے وہ اپنی دوست کے ساتھ کالج کے قریبی بازار آئی تھی جہاں سے واپسی پر وہ دونوں ایک فوڈ سینٹر چلی گئی تھیں اور وہاں سے نکلتے ہی جو منظر اُس نے دیکھا اس نے مہرو کی بھوک بالکل ختم کر دی تھی ہاتھ میں پکڑا لنچ باکس اُس نے خاموشی سے پاس گزرتے پھول بیچنے والے لڑکے کے حوالے کر دیا، اور بیدھیانی میں قریب سے گزرتے رکشہ کو ہاتھ دے کر روک لیا۔

’’تم کالج پوائنٹ میں گھر واپس نہیں جاؤ گی؟‘‘

اس کی دوست نے اسے رکشہ میں بیٹھتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

’’نہیں مجھے ایمرجنسی میں کام یاد آ گیا ہے۔ اگر تم مائنڈ نہ کرو تو آ جاؤ۔ تمہیں راستے میں چھوڑتی جاؤں گی۔‘‘

اس نے عائشہ کو آفر دی۔

’’نہیں مجھے لائبریری میں کام ہے تم جاؤ۔‘‘

رکشہ اسٹارٹ ہونے سے قبل ہی عائشہ روڈ کراس کر کے کالج جانے والی سڑک کی جانب مڑ گئی۔

کبیر کب آیا؟ اور یہ سندس آپی کے ساتھ کہاں جارہا تھا؟

ان سوچوں میں گھری وہ کب گھر پہنچی اسے پتا ہی نہ چلا۔

گیٹ کے سامنے اترتے ہی یہاں وہاں دیکھا، کبیر کی جیپ کہیں نہ تھی شاید وہ ابھی تک واپس نہ آئے تھے۔ ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئی سامنے صوفے پر بیٹھی سلویٰ ٹی وی پر اپنا پسندیدہ شو دیکھنے میں مصروف تھی۔

''السلام وعلیکم۔''

اندر داخل ہوتے ہی اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے سلویٰ کو مخاطب کیا۔

''وعلیکم السلام۔''

سلویٰ نے گردن گھما کر اس پر ایک نگاہ ڈالی۔

''خیریت آج تم اتنی جلدی کیسے آگئیں۔''

مہرو نے گھڑی دیکھی ابھی صرف دو بجے تھے۔ وہ اگر پوائنٹ سے آتی تو تین کے بعد ہی گھر پہنچتی۔

''طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو آٹو سے آئی ہوں۔''

اُسے جواب دیتی وہ وہیں بیٹھ گئی۔

''پلیز سلویٰ ایک کپ چائے بنا دو۔ میرا سر بے حد دکھ رہا ہے۔''

اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی سندس آپی اُسے حیران کر گئیں۔ انہیں دیکھ کر کہیں سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ابھی کچھ دیر قبل گھر واپس آئی ہوں گی۔ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کیا درست ہے کیا غلط۔

''بہت گرمی ہے آپ صابرہ سے کہیں وہ بنا دے۔''

بڑی بہن کو صاف جواب دے کر سلویٰ چینل سرچ کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اُس کا اس طرح انکار کرنا مہرو کو ذرا اچھا نہ لگا اور وہ فوراً اسے بیشتر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ آرام کریں آپی میں صابرہ کو بھیجتی ہوں۔''

ان کے غصہ سے سرخ چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے وہ دادی کے کمرے میں آ گئی جہاں سامنے ہی صابرہ ان کے سر میں تیل ڈال کر مالش کر رہی تھی۔

''تمہیں سندس آپی بلا رہی ہیں انہیں ایک کپ چائے بنا دو۔''

اس کا مقصد صابرہ کو کمرے سے باہر نکالنا تھا۔ ورنہ وہ کبھی بھی دادی کے کام میں مصروف صابرہ کو باہر نہ بھیجتی۔

''اچھا جی۔''

دانت نکالتی صابرہ نے شاید دادی سے گلو خلاصی ہونے پر شکر ادا کیا اور فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''کیا بات ہے مہرو بچہ۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔''

دادی کو شاید اُس کے چہرے پر چھلکتی پریشانی نظر آ گئی۔

''کچھ نہیں دادی ہلکا سا سر میں درد ہے۔''

وہ ان کی گود میں سر ڈالے وہیں لیٹ گئی دادی دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

''دادی جی......'' کچھ سوچتے ہوئے اس نے آہستہ سے انہیں پکارا۔

''ہاں بچہ بولو۔'' دادی کے چلتے ہاتھ رک گئے۔ وہ مکمل طور پر اُس کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"ایک بات پوچھوں۔" وہ تھوڑا سا جھجکتے ہوئے بولی۔

"سو باتیں پوچھو۔" دادی نے ایک پیار بھری نگاہ اُس پر ڈالی۔

"آج کبیر آیا تھا۔" اس کے سوال میں ہچکچاہٹ موجود تھی۔

"نہیں تو کیوں......"

مہرو کے سوال نے دادی کو بھی حیران کر دیا۔ کیونکہ اتنے سالوں میں آج تک اس نے کبیر کی بابت اس طرح سوال نہ کیا تھا۔

ویسے ہی پتا نہیں کیوں مجھے لگا شاید وہ آیا ہوا ہے۔"

"اُسے سمجھ میں نہ آیا کہ وہ دادی کو کیا جواب دے۔

"ہائے جھلی لڑکی تجھے بھلا بیٹھے بٹھائے کبیر یاد آ گیا۔ مجھے لگتا ہے تُو اُسے روز دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی۔ اب جو وہ اتنے دنوں سے نظر نہیں آیا تو، تُو پریشان ہونے لگی ہے۔

خوشی چہرے کے ساتھ ساتھ ان کے لہجے میں بھی آ گئی۔ جانے مہرو کے اس طرح استفسار سے انہوں نے کیا نتیجہ نکالا۔

"اُفوہ دادی! آج کالج میں ایک لڑکا دیکھا بالکل کبیر جیسا۔ میں سمجھی وہ آیا ہوا ہے۔ آپ پتا نہیں کیا سمجھ رہی ہیں۔"

کبیر کے متعلق کیا جانے والا استفسار اُسے اب شرمندہ کر گیا۔ اور وہ فوراً ہی دادی کی گود سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لو! بھلا اس میں برا ماننے والی کون سی بات ہے۔ اب تم اُس کا نہیں پوچھو گی تو بھلا بتاؤ کون پوچھے گا؟"

انہوں نے شیریں لہجے میں مہرو کو سمجھایا۔

"اتنی فارغ نہیں ہوں جو اُس جیسے شخص کے بارے میں پوچھتی پھروں۔ بدتمیز اور بد دماغ انسان خود کو نجانے کیا سمجھتا ہے۔"

اُس دن والے کبیر کے الفاظ مہرو کو یاد آتے ہی تپا گئے دادی نے بے اختیار ہی پل میں تولہ پل میں ماشہ ہونے والی لڑکی کے سرخ چہرے پر ایک نظر ڈالی جو جانے غصہ سے سرخ تھا یا باہر کی گرمی سے وہ کچھ سمجھ نہ پائیں۔

"بری بات بچہ اس طرح نہیں بولتے۔"

وہ بنا جواب دیے پیچھے پلٹی جہاں دروازے میں تائی کھڑی تھیں۔ شاید وہ اُس کی اور دادی کی کچھ گفتگو کا حصہ سن چکی تھیں جس کا اندازہ ان کے چہرے کے تاثرات سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ مہرو کو لگا تائی اور سندس آپی کو کوئی کام نہیں ہے سوائے لوگوں کی جاسوسی کرنے کے۔ کوئی اور ہوتا تو وہ کہہ بھی دیتی لیکن انہیں کچھ کہہ کر وہ بلاوجہ کا فساد ڈالنے کے موڈ میں بھی نہیں تھی۔ اس لیے خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ سوتے میں بھی اُس کا ذہن جاگتا رہا۔ جو اسے بار بار یہ احساس دلا رہا تھا کہ دوپہر میں آج اس نے جو کچھ بھی دیکھا ہے وہ اس کا وہم نہ تھا جس کی تصدیق شام میں اٹھتے ہی اس وقت ہو گئی جب اُس نے فریج میں کیریوں کا ڈھیر دیکھا۔ یہ کیریاں یقیناً پھوپو کے گھر کی تھیں۔

"یہ اتنی ساری کیریاں کون لایا ہے؟"

اُس نے کچن میں کام کرتی صابرہ سے سوال کیا، فریج میں کیریوں کی موجودگی کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہ تھی جس کی وہ تحقیق کرتی، اصل مسئلہ تو کبیر کی آمد کا تھا جس نے اُسے الجھا رکھا تھا۔ اگر کبیر آیا تھا تو اُسے لا علم کیوں رکھا جا رہا تھا۔ یہ ہی اس کی الجھن کا سبب تھا۔

"یہ جی کبیر صاحب لائے تھے۔...... صبح جب

آپ کالج گئی ہوئی تھیں۔ انہیں یہاں شہر میں کوئی کام تھا جس میں صرف کھڑے کھڑے آئے اور آپ کے لیے کچھ سامان بھی دے گئے ہیں جو آپ کی تائی کے پاس رکھا ہے۔"

صابرہ نے دبے دبے لفظوں میں اطلاع فراہم کی۔ اس کے لیے اہم خبر کبیر کی آمد تھی۔

"سندس آپی ان کے ساتھ باہر گئی تھیں۔"

دل میں موجود ہر الجھن وہ سلجھا دینا چاہتی تھی۔

"ہاں جی انہیں شاید اپنی یونیورسٹی جانا تھا تو کبیر صاحب نے کہا آجاؤ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔"

"اس وقت دادی اماں کہاں تھیں؟"

صابرہ کی دی جانے والی ساری خبریں خلاف توقع تھیں۔

"وہ تو جی نماز اور قرآن پڑھ کر سو گئی تھیں اور تائی جی نے جگانے سے منع کر دیا تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

اچھا برتن دھو کر مجھے ایک کپ چائے بنا دو۔"

صابرہ کو ہدایت دیتی وہ کچن سے باہر چلی آ گئی۔

☆......☆......☆

آج اس کے فرسٹ سمیسٹر کا آخری پیپر تھا۔ وہ کل سے بہت خوش تھی کیونکہ رات ہی اُس کی بابا سے بات ہوئی تھی انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ شام سے پہلے چاچا اللہ بخش اسے واپس گاؤں لے آئے گا۔ گاؤں کے تصور کے ساتھ ہی اماں کی یاد نے دل میں بسیرا کر لیا، کئی دنوں سے اُسے پنکی اور ٹیپو بھی بہت یاد آ رہے تھے جو اُس کے بڑے بھائی شاہنواز کے بچے تھے اور مہرو سے بے حد محبت کرتے تھے اور مہرو کا تو یہ حال تھا کہ جب وہ نئی نئی شہر میں آئی تھی، کئی دن ان دونوں کی یاد اُسے سونے ہی نہ دیتی تھی۔ کل سلوی کے ساتھ بازار جا کر اُس نے سب کے لیے شاپنگ کی اور رات کو ہی اپنی تمام پیکنگ مکمل کر لی، دادی تو اپنا بیگ رات کو ہی دروازے پر رکھی بیٹھی تھیں۔ شہر کی تمام سہولیات میں بھی انہیں گاؤں کی یادیں چین نہ لینے دیتیں اوپر سے ان کے سفارتی تعلقات تائی سے بھی کچھ خاص اچھے نہ تھے۔ تائی کی ہر بات کا مقابلہ وہ مہرو کی امی سے کرتیں جو تائی جی کو بالکل پسند نہیں تھا۔ اسی بات پر دونوں میں اکثر ہی تکرار ہو جایا کرتی اور ایسے موقع پر فوراً ہی دادی واپسی کے لیے بضد ہو جاتیں جنہیں مہرو بڑی مشکل سے منایا کرتی اور اب تو اتنے ماہ بعد واپسی کی خوشی ان کے چہرے پر جگمگا رہی تھی مہرو، چاچا اللہ وسایا بخش کے انتظار میں بیگ پیک کیے لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی جب دروازہ کھول کر یحییٰ اندر داخل ہوا۔

"ارے یہ آج تم کیسے یہاں بیٹھی نظر آ رہی ہو وہ بھی اس وقت؟"

عام طور پر یہ ٹائم مہرو کے سونے کا ہوتا تھا اس لیے اُسے حیرت ہوئی۔

"چاچا اللہ بخش کا انتظار کر رہی ہوں۔ اب تک تو انہیں آ جانا چاہیے تھا۔ پتا نہیں کیوں اتنا لیٹ ہو گئے۔"

اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے یحییٰ کو جواب دیا۔

"ارے بیٹا تم سو جاتیں اللہ بخش آتا تو ہم تمہیں جگا دیتے۔ لو بھلا اب اس کے انتظار میں تم ساری دوپہر یہاں بیٹھی رہو گی۔"

کمرے سے باہر نکلتی تائی جی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

تائی جی میں تو کالج سے ہی تین بجے آئی تھی اور اوپر اپنے کمرے میں تھی یہاں بیٹھے ہوئے بمشکل

پچیس منٹ ہوئے ہوں گے۔ خیر کوئی بات نہیں اب تو بس وہ پہنچنے والے ہوں گے اور یہ تم اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟''

تائی کو جواب دے کر اس نے یحییٰ کو مخاطب کیا۔

''آنہیں رہا جارہا ہوں۔ تم نے بھی چلنا ہے تو آجاؤ۔''

یحییٰ ابھی ابھی لاؤنج کے داخلی راستے کے نزدیک ہی کھڑا تھا۔

''کہاں جارہے ہو؟'' اس کے بولنے سے قبل ہی تائی بول اٹھیں۔

''قریبی پارک میں واک کرنے جارہا ہوں آپ نے چلنا ہے تو آجائیں۔''

''نہیں تم مہرو کو لے جاؤ اگر اللہ بخش آگیا تو میں تمہیں فون کردوں گی۔ ویسے بھی اس نے کون سا آتے ہی واپس جانا ہے آکر چائے پانی تو پیے گا نہ اوراس میں لازمی بات ہے کچھ ٹائم تو لگے گا۔ جاؤ بیٹا! یحییٰ کے ساتھ چلی جاؤ دیکھو گرمی کس قدر ہورہی ہے، تھوڑی فریش ہوجاؤ گی۔''

تائی کے خلوص کے آگے وہ انکار نہ کرسکی اور خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یحییٰ کی تقلید میں وہ گیٹ سے باہر نکل آئی اور پھر پارک کی ٹھنڈی ہوا میں واک کرتے ہوئے کتنا ٹائم گزر گیا اُسے اندازہ ہی نہ ہوا اور نہ ہی گھر سے کسی نے فون کرکے چاچا کی آمد کی اطلاع دی۔ مغرب کی اذان کی آواز جیسے ہی کان میں پڑی اُسے تیزی سے گزرتے وقت کا احساس ہوا۔

''یحییٰ...... یحییٰ۔''

اس نے ٹریک پر تیزی سے چلتے یحییٰ کو آواز دے کر روکا۔ ''گھر چلو مغرب ہوگئی ہے مجھے نماز پڑھنا ہے۔''

''پارک میں ہی پڑھ لو۔ میں اک چکر لگا کر آتا ہوں۔'' تیز تیز کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔

مہرو نے دیکھا وہاں کچھ دور چند خواتین نماز کی تیاری کررہی تھیں۔ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اکیلے میں بڑھتا اندھیرا اُسے خوف زدہ کرگیا۔ اس لیے قبل وہ اُسے فون کرکے پوچھتی وہ سامنے سے آتا نظر آگیا۔

''یہ لو۔'' پیپسی کا ٹن اس نے مہرو کی جانب بڑھایا۔

''اور آجاؤ گھر سے فون آیا ہے دادی تمہارا انتظار کررہی ہیں۔''

یقیناً چاچا آگیا ہوگا۔'' اس خیال کے ساتھ ہی وہ خوش ہوگئی۔ گھر جانے کے تصور نے ہی قدموں میں روانی بھردی۔ یحییٰ کے کندھے سے کندھا ملائے وہ خوش کن احساس کے ساتھ گیٹ کھولتے ہی اندر داخل ہوئی اور اپنی جگہ ساکت ہوگئی۔ بڑے سے صحن میں کرسیاں ڈالے تایا ابو کے ساتھ کبیر بیٹھا تھا۔ اس نے یہاں وہاں دیکھا۔ چاچا اللہ بخش کہیں نہ تھے۔ اس کا مطلب اُسے لینے کبیر آیا تھا۔

''السلام وعلیکم۔''

ست روی کے ساتھ وہ آگے بڑھی۔

''وعلیکم السلام بیٹا! آگئیں تم کبیر کب سے تمہارا انتظار کررہا ہے۔''

سلام کا جواب صرف تایا نے دیا جبکہ کبیر اسے یکسر نظر انداز کیے ٹانگ پہ ٹانگ دھرے بیٹھا تھا۔

''میں نے تو منع کیا تھا تم مت آنا کل یحییٰ نے اپنے کام سے گاؤں جانا تھا وہی مہرو کو چھوڑ دیتا۔''

تائی جی نے فراہم کردہ اطلاع اس کے لیے بالکل نئی تھی۔ وہ حیران رہ گئی۔ شام تک وہ چاچا کا انتظار کررہی تھی تب تو اُسے تائی نے یحییٰ کا پروگرام نہ بتایا تھا اب اچانک یہ پروگرام اُسے کچھ سمجھ نہ آیا۔

''میں نانو کو لے جاتا ہوں۔ یہ بے شک یحییٰ کے ساتھ آ جائے جب اس کا دل چاہے۔''

کبیر کا انداز عجیب جتاتا ہوا سا تھا شاید اس نے محسوس ہوا۔

''لو اب آئے ہو تم وہ بھی رات کے نو بجے تو صبح چلے جانا۔ سندس کھانا تیار کر رہی ہے کھائے بنا گئے تو بچی کا دل بڑا دکھے گا۔''

اُس کی وہاں موجودگی قطعی غیر اہم تھی۔ یہ احساس ہوتے ہی اس نے اندر جانے کے لیے قدم اٹھایا کہ یحییٰ کی آواز کان سے ٹکرائی۔

''پلیز مہرو یار میرے لیے ایک کپ چائے بنا دو۔ سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔''

وہ وہیں کبیر کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ مہرو نے پلٹ کر دکھا کبیر کے ماتھے پر بچھا شکنوں کا جال مزید گہرا ہو گیا۔

'پتا نہیں یہ شخص ہنسنے سے اتنا ڈرتا کیوں ہے۔ جو ہر وقت اسی طرح تنا ہوا نظر آتا ہے۔'

کبیر کے بارے میں سوچتی وہ کچن میں داخل ہوئی تو سامنے ہی پسینہ پسینہ ہوئی سندس آپی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''یہ بریانی آپ نے بنائی ہے؟''

دیگچی کا ڈھکن اٹھا کر اُس نے اندر جھانکا۔

''نہیں جی یہ تو میں نے......''

''صابرہ امی سے پوچھو جیلی کا پیکٹ کہاں رکھا ہوا ہے۔''

دودھ میں چمچ چلاتی صابرہ کا جملہ درمیان میں ہی ادھورا رہ گیا۔ اُسے سندس آپی نے اس بڑی طرح گھورا کہ بیچاری فوراً ہی کچن سے باہر نکل گئی۔ ساری بات مہرو کی سمجھ میں آ گئی۔ مگر وہ کچھ بولی نہ اور قریب ہی رکھا ساس پین اٹھا کر چائے بنائی اور ایک کپ میں انڈیلی اور باہر نکل آئی۔ اُسے کچھ سمجھ نہ آیا ایسی کیا مجبوری تھی جو سندس آپی کچن میں گھسی ہوئی تھیں۔ ورنہ عام طور پر تو وہ کچن کے دروازے کے قریب سے بھی گزرنا پسند نہیں کرتی تھیں اور ان کی یہ مجبوری رات مہرو کی سمجھ میں اُس وقت آئی جب سب کھانے کی ٹیبل پر جمع ہوئے، تائی بڑی محبت سے ایک کے بعد ایک ڈش کبیر کی خدمت میں پیش کر رہی تھیں۔

''یہ بریانی کھا کر دیکھو کس قدر لذیذ ہے۔''

انہوں نے بریانی کی ڈش اس کے سامنے رکھتے ہوئے تعریف کی، کبیر کو بریانی کچھ خاص پسند نہیں تھی اور یہ بات مہرو اچھے طریقے سے جانتی تھی۔

''ویسے تو سندس کے پاس بالکل ٹائم نہیں ہوتا کوکنگ کا لیکن جب بھی کچھ بناتی ہے ایسی لگن اور محبت سے پکاتی ہے کہ بندہ انگلیاں چاٹتا رہ جائے۔''

تائی نے سندس آپی کی تعریف میں مبالغہ آرائی کی انتہا کر دی۔ جس کا بہرحال کبیر پر اثر ضرور ہوا اس نے اپنے سامنے رکھی پلیٹ میں بریانی نکال کر کھانا شروع کر دی کہ دادی کی اچانک کان سے ٹکرانے والی آواز نے کھانے کے تسلسل کو توڑ دیا۔

''اے لو! یہ بریانی تو صابرہ نے پکائی ہے۔ ساری دوپہر بچی کچن میں کھپتی رہی اور تعریفوں کا سہرا اپنی بچی کو پہنا دیا۔''

الفاظ کے ساتھ ساتھ دادی کے چہرے کے تاثرات بھی کچھ ایسے تھے کہ بے اختیار مہرو کو ہنسی آ گئی۔ ہنستے ہوئے اُس کی نظر جو کبیر پر پڑی تو وہ اُسے ہی گھور رہا تھا۔ مہرو کی ہنسی کو بریک لگ گیا، کبیر کی خوں خوار نگاہوں سے گھبرا کر اس نے اپنے سامنے رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

''نا تو میں نے صابرہ کے ہاتھ کی بریانی اکثر کھائی ہے اس کا ذائقہ اُس سے کافی مختلف ہوتا

ہے۔
کبیر کی پیش کردہ رائے نے ماحول کو پھر سے بدل دیا۔ تائی اور سندس کے چہرے کی اڑی ہوائیاں واپس لوٹ آئیں۔
"اماں صابرہ نے صرف سبزی وغیرہ کاٹنے میں مدد کی تھی ورنہ پکایا سب کچھ سندس نے ہی ہے اور ویسے بھی آپ کو کیا پتا آپ تو سارا دن اپنے کمرے سے باہر نہ نکلیں۔"
اطمینان سے وضاحت کرتے ہوئے تائی جی کھانا کھانے میں مصروف ہوگئیں۔ مہرو نے دیکھا کبیر نے سوائے بریانی کے کسی اور چیز کو ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ پتا نہیں کیوں اُسے محسوس ہوا سامنے موجود سندس آپی کے چہرے پر ایک فاتحانہ تاثر ابھر آیا ہے۔ جب کہ دادی اپنے چشمہ کی اوٹ سے تائی کو گھور ضرور رہی تھیں مگر انہوں نے اس کے بعد دوبارہ کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

☆......☆......☆

باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، بھابی کچن میں مصروف پکوڑے تل رہی تھیں جس کی سوندھی خوشبو پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی مگر جانے کیوں اس کا دل اداس تھا۔ بارش اور خوشبو کچھ بھی مل کر اس کی اداسی کو دور نہ کر سکے۔ وہ اداسی جو اس وقت سے اپنے گھیرے ہوئے تھی جب سے وہ گل سے مل کر آئی تھی۔
گل اس کی بچپن کی سہیلی تھی جس کی کچھ سال قبل اپنی خالہ کے بیٹے سے منگنی ہوئی تھی۔ رات جتنا وقت مہرو نے اُس کے ساتھ گزارا وہ مہیب کے ذکر سے بھرا ہوا تھا۔ مہرو کو یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ صرف اپنے رابطے کے لیے مہیب نے اُسے ایک قیمتی موبائل بھی تحفے میں دیا تھا۔
مہیب، گل سے بہت محبت کرتا تھا جس کا اندازہ اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی خوشی کو دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ جب تک وہ وہاں رہی گل کی باتیں سنتی رہی کیونکہ خود اس کے پاس سنانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ کوئی ایسی بات نہیں تھی جو وہ اُسے کبیر کے حوالے سے بتاتی سوائے اس کے غصے کے جو ہر وقت اُس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی جو رات گل کے گھر سے واپسی سے لے کر ابھی تک اس کا موڈ خراب تھا، اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھی وہ ان سوچوں میں گم تھی جب اُسے ٹیپو بلانے آیا۔
"پھوپو آ جائیں آپ کو بے جی بلا رہی ہیں۔"
بڑی پھوپھو کو سب چھوٹے بچے بے جی کہہ کر بلاتے تھے۔
"بے جی کب آئیں؟" اُسے حیرت ہوئی اس نے کھڑکی سے باہر کسی کو گھر کے اندر داخل ہوتے نہ دیکھا تھا جب کہ اس کھڑکی سے سامنے بڑا سا صحن اور داخلی دروازہ سب صاف دکھائی دے رہا تھے۔
"کافی دیر ہوگئی پتر میں تو سمجھی تو نے مجھے دیکھ لیا ہوگا پر جب تُو ملنے نہ آئی تو میں خود ہی اندر تجھ سے ملنے آگئی۔"
پھوپو کا لہجہ ہمیشہ ہی اتنا شیریں اور میٹھا ہوتا تھا جس میں محبت گندھی ہوتی، جانے یہ کبیر کس پر چلا گیا تھا۔
"کیا بات ہے پتر تُو اتنی سست کیوں ہو رہی ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تیری۔"
اس کے سلام کے جواب میں پھوپو نے اُسے گلے لگا کر ماتھا چومتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا۔
"جی پھوپو ٹھیک ہوں آپ آئیں بیٹھیں۔"
"نا میں تو تجھے لینے آئیں ہوں باہر آ دیکھ کتنا اچھا مینہ برس رہا ہے۔ پتا نہیں تُو کیوں کمرہ بند کیے بیٹھی ہے۔"

پھوپو اُسے ہاتھ سے پکڑے باہر برآمدے میں لے آئیں جہاں سے برستی بارش کا منظر بہت حسین لگ رہا تھا۔ کبیر سامنے کرسی پر بیٹھا بھائی جی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا تب اچانک اس کا فون بج اٹھا۔ مہرو نے دیکھا وہ آہستہ آہستہ کسی سے مصروف گفتگو تھا۔ اُسے شک ہوا دوسری طرف سندس آپی ہیں۔ اس کے شک کی فوراً تصدیق بھی ہوگئی جب فون ہاتھ میں لیے اس نے اپنی ماں کو مخاطب کیا۔

''ماں جی سندس نے آپ سے بات کرنی ہے۔''

''کیوں خیر تو ہے؟''

مہرو جانتی تھی سندس کبھی بھی کسی سے اتنی سلام دعا کرنے کی عادی نہیں تھی۔ یہ ہی وجہ جو پھوپو کے لیے خیر خیریت کا باعث بنی۔

''پتا نہیں آپ خود پوچھ لیں۔''

ماں کو فون تھما کر وہ دوبارہ بھائی جی سے باتیں کرنے میں مصروف ہوگیا سندس کو پھوپو سے کیا کام پڑ گیا۔ یہ جاننے میں مہرو کو کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ وہاں سے خاموشی سے اٹھ کر کچن میں آ گئی تاکہ کھانا پکانے میں بھابی کی کچھ مدد کر سکے۔

شہرہ کر کچھ اور نہ سہی کم از کم اس نے نظر انداز کرنے کا گُن سیکھ لیا تھا۔ اب وہ کبیر کو یکسر نظر انداز کرنے لگی تھی۔ وہ کب آتا، سندس آپی اس سے کیا کیا باتیں کرتیں، کہاں گھومنے جاتیں اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے اپنی توجہ مکمل طور پر اپنی پڑھائی کی جانب مرکوز کر دی تھی، آج بھی اُس کی او پی ڈی میں ڈیوٹی تھی جب وہاں سے نکلی تو شام کے چھ بج چکے تھے اور پوائنٹ سارے جا چکے تھے۔ اتنی تھکن کے باوجود اُسے آٹو میں گھر واپس جانا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ تارکول کی لمبی سی سڑک کے کنارے چل رہی تھی۔ تب ہی اچانک ایک گاڑی اس کے قریب آ کر رُکی وہ ڈر کر فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔

''ارے کہاں بھاگ رہی ہو؟ یار آ جاؤ میں تمہیں ہی لینے آیا تھا۔''

گاڑی کا دروازہ تیزی سے کھول کر یحییٰ اس کے پیچھے ہی فٹ پاتھ پر آ گیا اُسے خدشہ تھا مہرو کہیں ڈر کے مارے بھاگنا شروع نہ کر دے۔

''اُفوہ حد ہے یحییٰ۔'' اس نے ایک لمبی سانس باہر خارج کر کے یحییٰ کو گھورا۔ ''کیا ضرورت تھی اتنی تیز رفتاری سے گاڑی میرے پیچھے لانے کی۔''

دور تک سنسان روڈ پر نظر دوڑاتے ہوئے وہ بولی۔

'یار' ایک ایسا لفظ تھا جس کے بنا یحییٰ کا جملہ کبھی مکمل نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اکثر تایا جی اور تائی کے لیے بھی یہ ہی صیغہ استعمال کرتا جس پر کئی بار اُسے دادی نے ٹوکا مگر وہ تھا کہ بولے بنا رہ ہی نہ سکتا تھا۔

''چلو جلدی سے آ جاؤ۔ اتنی گرمی میں یہاں کھڑا ہونا مشکل ہے۔'' اُسے ساتھ لیے وہ تیزی سے گاڑی میں آ بیٹھا۔ یہ شخص اپنے گھر والوں سے کس قدر مختلف ہے۔

گاڑی جیسے ہی مین روڈ پر آئی مہرو نے یحییٰ پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا شاید تایا جی پر چلا گیا ہے۔ وہ بھی ایسے ہی نرم مزاج اور حلیم فطرت کے مالک ہیں فرق صرف اتنا تھا کہ وہ خاموش طبیعت تھے۔ جب کہ یحییٰ خاصا شوخ مزاج، اور اُس کی یہ شوخی مہرو کو بہت اچھی لگی وجہ غالباً کبیر کی خشک مزاجی تھی، جس سے وہ نالاں تھی۔ ان ہی سوچوں میں وہ گاڑی کب رُکی اسے پتا بھی نہ چلا۔ ہوش تب آیا جب یحییٰ نے اُس کی جانب کا دروازہ کھولا۔

''آ جاؤ تمہیں آئسکریم کھلاؤں۔ گرمی میں کام

کر کے تھک گئی ہوگی۔"

اُسے آڈر دے کر بنا انتظار کیے وہ آئسکریم پارلر میں داخل ہوگیا، جب کہ مہرو کا دل بالکل نہ چاہا کہ وہ اس وقت تنہا یحییٰ کے ساتھ پارلر جائے مگر وہ اُس کے خلوص کو ٹھکرا کر اُسے ناراض نہ کرسکتی تھی یہاں ایک وہ ہی تو اُس کا واحد دوست تھا جسے کھونے کا رسک فی الحال تو وہ نہ لے سکتی تھی یہ ہی سوچتی وہ گاڑی سے باہر نکل کر یحییٰ کے پیچھے آگئی۔ جو اپنا آئسکریم کا کپ تیار کرا چکا تھا، اور مہرو کے انتظار میں کاؤنٹر پر ہی کھڑا تھا۔

"جو فلیور پسند ہے وہ لے لو۔" مہرو کو دیکھتے ہی وہ پکارا۔

اپنی پسند کے فلیور پر خوب ساری چاکلیٹ اور اوریو کی ٹاپنگ کر کے ابھی اُس نے ایک چمچ ہی انجوائے کیا تھا کہ بیگ میں رکھا سیل فون بج اٹھا۔ آئس کریم کا کپ یحییٰ کے ہاتھ میں تھما کر اس نے جلدی سے بیگ کھولا۔

یہاں وہاں ہاتھ مار کر فون باہر نکالا۔ اسکرین پر جگمگانے والا "کبیر" کا نام اُسے حیران کر گیا۔

پہلے تو دل چاہا کہ فون واپس بیگ میں رکھ دے مگر پھر جانے کیا سوچا، یس کا بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگالیا۔

"السلام وعلیکم......" اُس کے حلق سے مری مری سی آواز نکلی۔

"کہاں ہو تم؟" یہ اس کے سلام کا جواب نہ تھا۔ اس نے دیکھا یحییٰ اس کی جانب ہی متوجہ تھا۔ اگر وہ متوجہ نہ ہوتا تو اُس کا ارادہ کسی قسم کا جھوٹ بولنے کا نہ تھا۔

"میں یحییٰ کے ساتھ ہوں۔" نہایت اطمینان سے وہ جواب دے کر ہلکا سا مسکرائی جانتی تھی اس جواب نے کبیر کو تپا دیا ہوگا۔

"اچھا......" خلاف توقع کبیر کا جواب اور رویہ خاصا مختلف تھا۔

"جلدی گھر آنے کی کوشش کرو۔ آمنہ مامی میرے ساتھ آئی ہیں۔ تم سے ملنے تمہارے کچھ کپڑے وغیرہ دینے ہیں۔ دیر ہونے کی صورت میں ہم واپس گاؤں نکل جائیں گے کیونکہ آج کل حالات خراب ہیں اور ہمیں رات سے قبل واپس پہنچنا ہے۔"

اس کے جواب کا انتظار کیے بنا اس نے فون بند کر دیا۔

"امی آئی ہوئی ہیں اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔" سیل آف کرتے ہی وہ حیرت سے یحییٰ کی جانب پلٹی۔ پہلے اپنی آئسکریم تو لے لو ساری پگھل رہی ہے۔ پانی بن جائے گی۔

یحییٰ نے بے فکر انداز میں اُسے کپ تھماتے ہوئے کہا "اور اب تمہاری بات کا جواب یہ ہے کہ میں نہیں جانتا کہ کبیر کے ساتھ آمنہ چاچی بھی آئی ہیں اور نہ ہی مجھے کسی نے بتایا۔ میں تو صرف یہ سمجھا کہ کبیر اکیلا آیا ہے۔ اور اُس کا اکیلے آنا کوئی ایسی اہم خبر نہیں تھی جو میں تمہیں دیتا۔ یحییٰ کا کہنا بالکل درست تھا۔ مہرو کے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی وہ خاموشی سے کپ ہاتھ میں لیے گاڑی میں آن بیٹھی۔ سچ تو یہ تھا کہ کبیر کے لیے یہ قطعی غیر اہم تھا کہ وہ کب، کہاں اور کس کے ساتھ ہے؟ آج اُس کے فون کر کے پوچھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ کبیر کے ساتھ اس کی ماں آئی تھی۔ جس نے گاؤں سے شہر تک کا یہ سفر محض اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے طے کیا تھا۔ وہ یقیناً بہت مایوس ہوتی اگر وہ مہرو سے ملے بنا واپس چلی جاتیں۔

"کن سوچوں میں گم ہو؟" اُسے خیالوں میں کھویا دیکھ کر یحییٰ پوچھے بنا رہ نہ سکا۔ کبیر سے

ڈانٹ پڑ گئی ہے کیا جو اس وقت گم صم ہو۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا مہرو ایک دم خجل سی ہو گئی۔ سب ہی جانتے تھے کہ کبیر کا رویہ اس کے ساتھ ہمیشہ نپا تلا ہوتا اور ذرا سی غلطی پر اُسے جھاڑ دیا کرتا۔

''ابھی اتنا دماغ خراب نہیں ہوا جو اُس نفسیاتی شخص کی باتوں کو دل سے لگاؤں۔ میں تو صرف یہ سوچ رہی ہوں کہیں وہ اماں کو مجھ سے ملائے بنا واپس گاؤں نہ لے جائے۔''

''نہیں لے جاتا آمنہ چاچی آج رات رُکنے کے لیے آئی ہیں۔'' یحییٰ کی فراہم کردہ اطلاع قطعی نئی اور چونکا دینے والی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یحییٰ کو کیسے پتا، اور یہ سوال فوراً مہرو کی زبان پر بھی آ گیا۔

''تم تو امی سے ملے ہی نہیں پھر تمہیں کیسے پتا چلا وہ آج رات رکیں گی۔'' اس کا لہجہ شک سے بھرا ہوا تھا۔

''ابھی ابھی سلویٰ کا مسیج آیا ہے۔ اس نے بتایا آمنہ چاچی رکنے آئی ہیں۔'' اپنا موبائل یحییٰ نے فوراً ہی مہرو کی نگاہوں کے سامنے کر دیا وہ شرمندہ سی ہو گی۔ یقیناً یحییٰ اس کا شک بھانپ گیا تھا۔ اس کے بعد سارے راستے ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اگر یحییٰ سچا تھا تو کبیر نے جھوٹ کیوں بولا کہ وہ ابھی رات کو ہی واپس جا رہا ہے گھر پہنچتے ہی وہ جان گئی کہ دونوں میں سے کون سچا تھا یقیناً کبیر جھوٹ کہہ رہا تھا۔ اس رات وہ امی کے ساتھ تایا جی کے گھر میں ہی رُکا اور ساری رات مہرو یہ سوچ سوچ کر کڑھتی رہی کہ کبیر نے اس کے ساتھ جھوٹ کیوں بولا۔

☆......☆......☆

رمضان شروع ہو گئے۔ اس کی ڈیوٹی وارڈ میں لگ گئی۔ ساتھ ہی ساتھ اُس کا سمسٹر بھی شروع ہو گیا۔ دادی اُسے چھوڑ کر گاؤں واپس چلی گئیں کیونکہ وہ ماہ رمضان گاؤں میں گزارنا چاہتی تھیں جہاں ان کی سکھی ساتھیاں تھیں۔ ان کے بقول جو مزہ رمضان کا گاؤں میں تھا وہ شہر میں کہاں۔

مہرو کا بھی بہت دل چاہا کہ وہ دادی کے ساتھ گاؤں چلی جائے۔ مگر مجبوری تھی وہ نا جا سکتی تھی۔ سندس اور سلویٰ عید کی شاپنگ میں مصروف تھیں اسی چکر میں وہ دونوں رمضان کے روزے بھی نہ رکھتیں۔ جبکہ مہرو کام میں سارا دن مصروف رہ کر بھی روزہ نہ چھوڑتی اور یہ عادت اس کی بچپن کی تھی۔ اور آج تو وہ اتنی مصروف رہی کہ افطاری بھی ہاسپٹل میں ہی کی تھی۔ تھکن کے مارے آٹو میں بھی جانے کا موڈ نہ تھا۔ اسی سبب نہ چاہتے ہوئے اس نے یحییٰ کو فون کر دیا۔

''اگر تمہارے پاس ٹائم ہے تو پلیز مجھے ہاسپٹل سے پک کر لو آج بہت تھک گئی ہوں۔'' وہ صرف درخواست کر سکتی تھی۔

''ارے اس میں اتنی منت سماجت کرنے کی کیا ضرورت ہے یار صاف صاف کہو کہ مجھے آ کر پک کر لو۔'' یحییٰ نے ہنستے ہوئے اُسے چھیڑا۔

''ریڈی ہو جاؤ میں پندرہ منٹ تک آ رہا ہوں۔''

''تھینک یو یحییٰ۔''

اظہار تشکر سے اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ یحییٰ ہمیشہ اس کے کام آنے والا تھا جس کا احساس کئی بار مہرو کو ہوا۔ اور پھر آدھے گھنٹے میں وہ یحییٰ کے ساتھ گھر پہنچ گئی۔ ورنہ آٹو میں ہی کتنا ٹائم ضائع ہو جاتا اور تھکن بھی مزید بڑھ جاتی۔

☆......☆......☆

''مہرو یہ کیا بات ہوئی تم اس عید پر گاؤں کیوں نہیں آ رہیں۔''

فون کے دوسری طرف بھابی تھیں جنہیں اس بار مہرو کے شہر میں عید کرنے پر شدید اعتراض تھا۔

''کیا کروں بھابی صرف دو دن کی چھٹی ملی ہے پھر تیسرے دن وائیوا شروع، اب بتائیں بھلا میں گاؤں کس طرح آؤں۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''آپ کو پتا ہے میں تو خود یہاں عید کرنا نہیں چاہتی۔ مگر مجبوری ہے بس اب چند ماہ کی بات رہ گئی ہے۔ پڑھائی ختم ہوتے ہی واپس آ جاؤں گی۔ اور انشاء اللہ اگلی عید وہاں ہی کروں گی آپ سب کے ساتھ۔''

''انشاء اللہ'' بھابی نے خلوص دل سے کہا۔

فون بند کر کے وہ باہر صحن میں آ گئی سندس اور سلویٰ بازار گئی تھیں۔ جبکہ اُسے تو عید کی شاپنگ کا ٹائم ہی نہیں ملا لیکن پھر بھی مطمئن تھی، اُسے رمضان کے پورے روزے رکھنے کی خوشی نے وہ تسکین دی کہ وہ باقی سب کچھ بھلا بیٹھی، ویسے بھی جانتی تھی اماں اور بھابی نے اپنے ساتھ اس کی بھی تیاری پوری کی ہوگی اور پھوپو بھی ہر سال اُسے عید پر جوڑا بنوا کر دیتیں جو آج تک اماں نے کبھی نہ سلوانے دیا۔ بلکہ ہمیشہ بڑے ٹرنک کا تالا کھول کر اس میں ڈال دیا کرتیں اور اُس نے بھی کبھی یہ ضد نہ کی۔ جانتی تھی اس ٹرنک میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے ان سوچوں میں گم وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہی۔ جب اطلاعی گھنٹی زور سے بجی یقیناً سندس آپی لوگ واپس آ گئے ہیں وہ آہستہ سے اٹھی اور پاؤں میں چپل پھنسائی اور بنا پوچھے باہر کا دروازہ کھول دیا جہاں بالکل سامنے سفید شلوار قمیض میں ملبوس کبیر کھڑا تھا، جسے دیکھ کر وہ یکدم گھبرا گئی۔

''گھر میں کوئی نہیں ہے۔''

بے اختیار مارے گھبراہٹ یہ جملہ اس کے منہ سے پھسلا۔

''تو......'' وہ مسلسل اُسے گھورتا ہوا بولا۔

''تم یہ کہنا چاہتی ہو میں یہاں سے واپس چلا جاؤں کیونکہ اگر تم گھر پر اکیلی ہو یہ ہی نا؟'' اس کے کہنے کا وہ مطلب نہ تھا جو کبیر نے اخذ کیا۔ مگر اب کوئی وضاحت دینا بے کار تھی جانتی تھی کہ اب اس کی کسی بھی بات پر اسے یقین نہیں کرنا اس لیے خاموشی سے سامنے کھڑی انگلیاں چٹخاتی رہی۔ کبیر نے وہیں کھڑے کھڑے اپنا سیل فون نکالا اور کوئی نمبر ملانے لگا۔

''یہ کسے فون کر رہا ہے؟'' مہرو مزید گھبرائی کہیں بابا ماں کو فون کر کے میری شکایت نہ کر دے۔

''یہ آپ کسے فون کر رہے ہیں؟''

وہ اُسے دیکھتے ہوئے تیزی سے بولی۔

''کیوں......''

کبیر مزید حیران ہوا۔

''اب میرے فون کرنے پر بھی پابندی ہے۔ ایک تو گھر کے اندر آنے نہیں دے رہی ہو اوپر سے فون کرنے پر بھی اعتراض ہے۔ لگتا ہے شہر کی دنیا نے تمہیں کچھ زیادہ ہی ہوشیار کر دیا ہے۔'' کبیر کی بات نے اُسے شرمندہ کر دیا۔

میں نے آپ کو اندر آنے سے منع نہیں کیا۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''ہاں تو آنے کب دے رہی ہو اندر۔ شاید تمہیں احساس نہیں تم میرا راستہ روکے کھڑی ہو؟''

کبیر کے توجہ دلاتے ہی اُسے پتا چلا وہ دروازہ کے عین درمیان میں کھڑی تھی کہ کوئی بھی اُسے ہٹائے بنا اندر داخل نہ ہو سکتا تھا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہوگئی کبیر فون کان سے لگائے اندر داخل ہو گیا۔

''کتنی دیر میں آ رہے ہو تم لوگ؟''

دوسری طرف یقیناً سندس آپی تھیں۔ ''ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔''

جواب دیے کر اُس نے فون بند کر دیا۔
''چائے پئیں گے آپ۔'' مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق پوچھنا ضروری تھا۔
''بنانی آتی ہے؟''
وہ سینے پر ہاتھ رکھے سیدھا اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔
جانتی تھی اب اُسے بری طرح ڈانٹ پڑنے والی ہے۔
''میں آپ کی سندس نہیں ہوں جسے کچھ کرنا نہیں آتا۔''

''اچھا تمہیں یہ کس نے بتایا کہ سندس میری ہے۔''
سندس کے ذکر نے اس کے دل کو باغ باغ کر دیا تھا۔ اس سوچ کے آتے ہی مہرو کا دل جل کر کوئلہ ہوگیا۔
''بہت ساری باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں خود ہی پتا چل جاتی ہیں۔''
آج وہ کسی طرح ہار ماننے والی نہ تھی۔ پورا مقابلے کا ارادہ تھا۔
''اچھا ہوا تمہیں یہ سب ٹائم پر ہی پتا چل گیا۔''
اسے لگا کبیر اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوا وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔
پتا نہیں سمجھتا کیا ہے خود کو۔ راجہ اندر بنا پھر رہا ہے۔ شکل نہیں دیکھی کبھی اپنی۔ کبیر کی مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا، اس نے یہ سب کچھ دل میں سوچا ضرور مگر مارے خوف کے کچھ بول نہ سکی۔
''اب تم پھر مجھے دل میں گالیاں دے رہی ہو۔'' وہ صاف اسے چڑا رہا تھا۔
''میرا دماغ نہیں خراب جو آپ کو گالیاں دوں، اگر چائے پینی ہے تو بتا دیں ورنہ میں جا رہی ہوں۔''

نہیں ڈاکٹر صاحبہ مجھے آپ نے ان ہاتھوں کی چائے نہیں پینی جن سے آپ لال بیگ، چوہے اور نہ جانے کیا کیا ذبح کرتی رہی ہیں۔ سوری میں انتظار کرلوں گا۔ سندس چائے کافی اچھی بنالیتی ہے۔''
اتنا کہہ کر وہ وہاں رکا نہیں، بلکہ تیزی سے چلتا اندر لاؤنج کی جانب بڑھ گیا۔ اور مہرو وہیں اپنی جگہ کھڑی تکتی رہ گئی۔ اُسے رہ رہ کر اپنی بے وقوفی کا افسوس ہوا جو بلا سبب اس جاہل شخص سے چائے کا پوچھ بیٹھی اور خواہ مخواہ اپنا ڈھیروں خون جلایا۔

☆......☆......☆

'ہائے اتنا خوبصورت سوٹ اور یہ جیولری اف اتنی حسین۔''
سندس کبیر کا لایا ہوا بیگ اپنے سامنے رکھے ایک کے بعد ایک سامان نکال رہی تھی اور ہر دفعہ اُس کے منہ سے ایسی ہی آواز برآمد ہو رہی تھی۔ یہ سارا سامان مہرو کا تھا جو گاؤں سے اس کی عید کے لیے آیا تھا۔ اور یہ جوڑا تو خاص وہ تھا جو پھوپو نے عیدی بھیجی تھی۔ حیرت تو اس بات کی تھی اس دفعہ پھوپو نے سوٹ سلوا کر بھیجا تھا۔ سندس ابھی تک اس کا سوٹ ہاتھ میں تھامے بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مہرو کو اندازہ ہوا کہ اماں پھوپو کا لایا ہوا ہر جوڑا ٹرنک میں ڈال کر چھپا کیوں دیتی تھیں وہ صحیح کہتی تھیں شگن کے جوڑے پر ہائے نہیں پڑنی چاہیے۔ شاید میں شہر آ کر کچھ زیادہ ہی وہمی ہوگئی ہوں۔ اپنے دل میں آنے والی اس سوچ کو اس نے فوراً اسے بیشتر رد کرتے ہوئے سوچا۔ کسی کی ہائے سے قسمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔
''ہمیں تو پھوپو نے ایسے جوڑے نہیں بھجوائے اور میرے سوٹ کا تو کلر بھی اچھا نہیں جبکہ یہ جوڑا تو سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔''
ابھی تک سوٹ ہاتھ میں تھامے وہ کبیر سے

مخاطب تھی جو شاید موبائل پر کوئی گیم کھیلنے میں بری طرح مصروف تھا جس کا اندازہ ہر ایک سیکنڈ کے بعد فون سے ابھرنے والی میوزک کی آواز سن کر کوئی بھی لگا سکتا تھا یہ ہی وجہ تھی جو اس نے سندس کی بات نہ سنی۔

''افوہ کبیر کہاں گم ہو تم۔''

سندس نے آگے بڑھ کر کبیر کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا۔ مہرو حیران رہ گئی کہ خاندان کی کسی لڑکی میں اتنی جرأت نہ تھی جو ایسی حرکت کرتی جبکہ کبیر کی بہن تو بہت ڈرتی تھی۔ اُسے لگا کبیر ابھی غصے سے چلا اٹھے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا وہ خاموش بیٹھا سندس کی جانب دیکھ کر مسکراتا رہا۔

''مجھے بھی ایسا سوٹ چاہیے جیسا پھوپو نے مہرو کے لیے بھیجا ہے۔'' سندس آپی نے اٹھلاتے ہوئے فرمائش کی، ان کا یہ فرمائشی انداز بھی مہرو کو خاصا عجیب لگا۔ وہ خاموشی سے منتظر تھی کہ کبیر کیا جواب دیتا ہے۔

''تم مہرو سے ایکسچینج کرلو۔''

مفت میں اپنے مشورے سے نوازتے ہوئے شاید کبیر مطمئن ہو گیا لیکن اس کی بات نے مہرو کو پتنگے لگا دیے۔

''معاف کیجیے گا سندس آپی میں اپنی کوئی چیز نہ تو شیئر کرتی ہوں اور نہ ہی ایکسچینج خواہ وہ مجھے پسند ہو یا نہ ہو لیکن جو میرا ہے صرف میرا ہے۔''

اتنا کہہ کر اس نے کبیر کے سخت چہرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ وہ اسے بھی دیکھ رہا تھا۔

''آپ سندس آپی کو ایک اور ایسا سوٹ بنوا دیں۔'' کبیر کو مشورے سے نوازتے اس نے بیڈ پر بکھرے کپڑے اٹھا کر بیگ میں ڈالنا شروع کر دیے۔

''ارے بیٹا ناراض مت ہو۔ سندس تو مذاق کر رہی ہے تم خواہ مخواہ برا مان گئیں۔ تمہارا سوٹ تمہیں مبارک ہو۔ اللہ نصیب کرے۔''

تائی جی نے معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ مہرو نے جوابی طور پر ایک نظر کبیر کے چہرے پر ڈالی۔ جو لب بھینچے کسی مفکر کی طرح کرسی پر بیٹھا تھا۔ مہرو اُسے قطعی نظر انداز کرتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی، اُسی پل تائی نے سامنے بیٹھے یحییٰ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا وہ فوراً سے بیشتر اٹھا اور مہرو کے پیچھے لپکا، کبیر نے دیکھا ضرور مگر توجہ نہ دی۔

''سوری کبیر مجھے اندازہ نہ تھا کہ مہرو اتنی بد تمیزی کر جائے گی۔ میں نے تو جو کچھ کہا صرف مذاق تھا اور کچھ نہیں۔''

سندس آپی نے سارے معاملے سے خود کو الگ کرنے کی کوشش کی اور ایک ہی جملے میں مہرو کو قصور وار بھی ٹھہرا دیا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا اس کا یہ غصہ پل بھر کا ہے ابھی یحییٰ گیا ہے نا دیکھنا کتنی جلدی منا کر لے آئے گا۔ اس کی بات بہت مانتی ہے۔''

تائی کا لہجہ کچھ شاید جتاتا ہوا تھا مگر لہجہ سے زیادہ ان کے الفاظ کبیر کو چوکنا کر گئے اور پھر کچھ ہی دیر بعد مہرو بالکل نارمل انداز میں یحییٰ کے ساتھ باہر آ گئی۔ یحییٰ کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کبیر کو کچھ عجیب سی لگی، تائی جی نے ایک نگاہ کبیر کے چہرے پر ڈالی اور دوسری سندس پر ڈالتے ہوئے زیر لب مسکرا دیں، کبیر کے چہرے پر پھیلے تاثرات دیکھ کر انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کا تیر نشانے پر بیٹھ گیا ہے اور یہ احساس ہوتے ہی ان کے چہرے پر پھیلا اطمینان قابلِ دید تھا۔

☆......☆......☆

عید ختم ہوتے ہی زوہا کی شادی کی تاریخ رکھ

دی گئی۔ زوہا کبیر کی اکلوتی اور چھوٹی بہن تھی جس کی مہرو سے دوستی قابل رشک تھی۔ یہ ہی وجہ تھی جو زوہا کی متوقع شادی کی خبر نے اسے خوش کر دیا ساتھ ہی یہ احساس کہ امتحان ختم ہوتے ہی اس نے گاؤں واپس چلے جانا ہے۔ گاؤں واپس جانے کی خوشی کا احساس تائی اور ان کے گھر کا ہر فرد محسوس کر چکا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ ایک دن سلوئی اس سے پوچھ بیٹھی۔

''ایک بات تو بتاؤ مہرو۔ تم اتنی محنت کرنے کے بعد ڈاکٹر بننے میں کامیاب ہوئی ہو۔ تو پھر کیوں یہاں رُک کر اسپتال میں نوکری نہیں کرتیں تاکہ تمہاری تعلیم سے کسی کو فائدہ پہنچے۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر کیوں اس طرح واپس جا رہی ہو۔ تمہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ تمہارا یہ عمل درست نہیں اور پھر شہر کی رنگین زندگی چھوڑ کر گاؤں کی روکھی پھیکی دنیا میں کون واپس جاتا ہے۔''

''تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو میرا یہ عمل درست نہیں ہے۔'' سلوئی کی بات مکمل ہونے کے بعد مہرو نے اپنی بات شروع کی۔ ''دراصل تم پوری بات نہیں جانتیں۔'' یہاں تک پہنچ کر وہ رُک گئی۔ سلوئی کی جانب دیکھا اور دھیمے سے مسکرا دی۔

''میرا ارادہ گاؤں واپس جا کر اسپتال کھولنے کا ہے اور اس میں مجھ سے زیادہ دلچسپی بابا اور پھوپو کی ہے۔ اس کی وجہ غالباً پھوپا جان کی اچانک ہارٹ اٹیک سے ہونے والی موت تھی۔ موت جو کہ برحق ہے اور ہمیشہ ہے۔ وقت مقررہ پر ہی آتی ہے۔ نہ اُس سے ایک پل آگے نہ پیچھے پھر بھی انسان ساری زندگی یہ سوچنے میں گزار دیتا ہے۔ کاش وقت پر علاج ہوتا تو ہو سکتا تھا ہم اپنے پیارے کو بچا لیتے تو بس اسی سوچ نے ساری زندگی پھوپو کو گھیرے رکھا۔ اور اب وہ چاہتی ہیں کہ میں واپس جا کر گاؤں میں ان کی زمین پر اسپتال کا کام شروع کروایا جائے۔ یہ ہی وجہ تھی جو اتنا عرصہ میرے گھر والوں نے مجھ سے دوری برداشت کی تاکہ میں واپس جا کر اپنے گاؤں کے لوگوں کو فائدہ پہنچا سکوں۔ میری تعلیم میرے اپنے لوگوں کے لیے ہے۔ میں نے پیسا کمانے کے لیے علم حاصل نہیں کیا۔'' اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کے لیے رُکی۔ سلوئی کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی جو اس کی جانب متوجہ تھی۔

''رہی بات شہر کی رنگینیوں کی تو مان لو مجھے یہ شروع سے ہی کبھی پسند نہ آئیں۔ میں سیدھی سادھی گاؤں کی لڑکی ہوں۔ شہر کی تیز ہوائیں ہم جیسوں کو راس نہیں آتیں۔''

بات ختم کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بیسٹ آف لک مہرو! مجھے اندازہ نہ تھا تمہارے اندر ایک ایسی لڑکی چھپی ہے جو اپنے سے زیادہ دوسروں کو اہمیت دیتی ہے۔ میری دعا ہے تم ہمیشہ خوش رہو۔''

سلوئی نے پوری نیک نیتی کے ساتھ اُسے دعا دی۔ ''آمین۔''

مہرو کو سلوئی کی خلوص نیت پر کوئی شک نہ تھا۔

☆......☆......☆

''مجھے تو ایک بات کبھی سمجھ نہ آئی ماں کے پاس جو کچھ ہے وہ سب تمہاری بہن اور سلامت علی کے لیے کیوں ہے؟''

تایا جی نے اخبار لپیٹتے ہوئے تائی کے سرخ چہرے پر ایک نگاہ ڈالی انہیں سمجھ میں نہیں آیا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔

''کیا بات ہے نسرین اتنے غصے میں کیوں ہو؟''

جب وہ بولے تو ان کا انداز ہمیشہ کی طرح نرم ہی تھا۔

''آپ کی والدہ محترمہ نے اپنی ساری زمین

جائیداد و سلامت علی اور زلیخا کے بچوں کو دے دی ہے۔" وہ ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولیں۔

"اگر کچھ نہ دیا تو ہمیں اور ہمارے بچوں کو نہ دیا۔ اب دیکھو گاؤں کی زمین پر مہرو کے لیے اسپتال تعمیر کیا جائے گا۔ واہ رے نصیب رشتہ کرتے ہوئے بھی کسی کو میری بیٹیاں نظر نہ آئیں۔ جھٹ ماں بیٹی نے مہرو مانگ لی کبیر کے لیے۔ جانے آمنہ نے کیا گھول گھول کر پلایا، اس خاندان کو ہمیشہ وہ اور اس کے بچے ہی سب کی نظروں میں معتبر ٹھہرے۔ ہماری تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔" اور تایا کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔

"ایک منٹ نسرین! مزید جذباتی ہونے سے پہلے میری دو باتیں سن لو۔" جب وہ کسی طور خاموش نہ ہوئیں تو تایا جی کو ٹوکنا پڑا۔

"پہلی بات تو یہ کہ گاؤں کی وہ زمین اماں کی نہیں ہے بلکہ مستقیم کی ہے اور اس حوالے سے اس زمین پر زلیخا کا حق ہے۔ جسے چاہے استعمال کرنے کے لیے دے۔"

مستقیم ان کے بہنوئی اور کبیر کے والد کا نام تھا۔

"دوسری بات یہ کہ آج جس گھر میں تم بیٹھی ہو وہ مجھے میری ماں نے خرید کر دیا تھا، ورنہ اسی سرکاری نوکری اور تمہارے بے جا اخراجات کبھی مجھے اس قابل نہ کرتے کہ میں شہر میں آج اپنی ایک چھت کا مالک ہوتا۔ گھر بنانے اتنے آسان نہیں، ان کے لیے رقم چاہیے ہوتی ہے۔ جو مجھے میری ماں نے دی اور ان کا یہ مجھ پر احسان ہے۔"

"اے لو احسان دیکھو بھلا کئی سال پہلے چند لاکھ دے کر ساری زندگی کے لیے بے دخل کر دیا۔"

تائی ہار ماننے والوں میں سے نہ تھیں۔

"چند سال قبل کے یہ چند لاکھ روپے آج کروڑوں بن چکے ہیں۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں اس مکان کی مالیت کیا ہے اور اس کے علاوہ بھی ہمیشہ اماں نے میری مدد کی۔ جب مجھے ضرورت پڑی میری ماں اور بھائی میری مدد کو آگے بڑھے۔ تم نے کیا کیا ساری زندگی۔ اعلیٰ ترین اسکول کالجوں کے چکر میں لگی رہیں اور مہرو کو دیکھو۔ گاؤں کی پڑھی ہوئی لڑکی آج ڈاکٹر بن گئی اور تم صرف اسی میں خوش رہیں کہ تمہارے بچے انگلش منہ ٹیڑھا کر کے بول لیتے ہیں، تمہارے بچوں کی سوسائٹی بہت ہائی فائی ہے اور تم شاید بھول گئی ہو، کئی سال پہلے زلیخا نے پہلی ترجیح تمہیں دی تھی۔ سدرہ کا رشتہ کبیر کے لیے مانگ کر، اور تم جانتی ہو تم نے کیا جواب دیا تھا۔ میری بیٹی اور گاؤں میں رشتہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو پھر بھلا اب کیا پریشانی ہے۔ کیوں اس قدر واویلا کر رہی ہو۔ سب کچھ ویسے ہی ہے جیسا تم چاہتی تھیں۔ ویسے بھی نسرین بیگم اللہ بھروسہ کرنا سیکھو اور کبیر تمہاری بیٹی کا نصیب نہ بنا تو کوئی بات نہیں۔ اللہ ہمیں اس سے بہتر عطا کرے گا۔ انشاء اللہ بہت جلد ہماری بیٹیاں بھی اچھے گھروں میں بیاہی جائیں گی۔ پریشان اور مایوس مت ہو۔"

تایا جی سمجھ گئے تھے کہ تائی کی فرسٹریشن کی وجہ مہرو اور کبیر کے بعد اب عنقریب ہونے والی زوہا کی شادی ہے۔ جبکہ زوہا اور سلوئی سے بھی چھوٹی ہے اور اگلے ماہ میں شادی ہو کر تایا کے گھر جانے والی ہے۔

"میں پریشان اور مایوس نہیں ہوں۔ میرے بچوں میں کون سے کیڑے پڑے ہیں جو ان کے رشتے نہ آئیں گے۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ میری کسی غلطی اور کوتاہی کے سبب تم بہن بھائی ایک دوسرے سے جدا مت ہو۔ اسی لیے کہتی ہوں......"

تائی نے فوراً ہی پینترا بدلا۔ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر انہوں نے تایا کی شکل دیکھی جو ان کی جانب مکمل طور پر متوجہ تھے۔

"میں چاہتی ہوں کہ ہم مہرو کو اپنے یحییٰ کی دلہن بنا لیں کیونکہ مجھے وہ بہت پسند ہے اور اسی طرح سندس کا رشتہ کبیر سے طے ہو جائے۔"

یہ سب کچھ انہوں نے ایسے کہا جیسے کوئی عام سی بات ہو۔ ان کے نزدیک خاندانی رشتے ناتوں کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔"

ان کی بات اطمینان سے سنتے سنتے تایا کو جیسے کرنٹ لگا۔

"کبیر اور مہرو کی عنقریب شادی ہونے والی ہے اور تم ہو کہ اس قسم کی فضول باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ جاؤ نسرین اٹھو یہاں سے اور اپنا کام کرو۔"

تایا بہت غصہ میں تھے۔

"آپ شاید جانتے نہیں یحییٰ اور مہرو ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور اسی طرح سندس اور کبیر بھی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور کرامت علی بچپن میں ماں باپ کے طے کردہ رشتہ ضروری نہیں ہے کہ اولاد کے گلے کا طوق بن جائیں۔ اگر وہ اپنی زندگیاں ایک دوسرے کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں تو ہمیں کیا۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم ہمت کرو اور میرا ساتھ دو تاکہ ان تمام بچوں کو ان کی اصل خوشیاں دلوانے میں ہم دونوں مل کر اپنا کردار ادا کریں۔ یہ سارے بچے ہمارے اپنے بچے ہیں کرامت علی۔ اور اب میں اس سے زیادہ تمہیں کچھ نہ کہوں گی۔"

آواز کے ساتھ ساتھ تائی جی کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ انہوں نے دیکھا تایا کرامت علی کے چہرے پر ایک الجھن سی ابھر آئی ہے۔ تائی کی بات کے جواب میں وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے تائی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ اپنا کام کر چکی تھیں اور اب انتظار تھا کہ اس تمام کارروائی کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

دروازے سے کان لگائے سندس آپی بھی اپنی ماں کی باتیں سن کر حیران رہ گئی۔

"واہ میری ماں آپ تو بہت بڑی اداکارہ ہو۔"

نسرین بیگم کے کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ ان کے گلے لگ کر آہستہ سے بولی جواباً نسرین صرف مسکرا دیں۔

"آپ صرف کبیر کو میرا بنا دیں پھر دیکھیں میں آپ کو سونے میں پیلا کر دوں گی۔" اپنی ماں کو ان کی خواہش کے مطابق لالچ دیتے ہوئے سندس ہنسی۔

"کوشش تو پوری ہے۔ اب دیکھو آگے کیا ہوتا ہے؟"

وہ پُرسوچ انداز میں بیٹی کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولیں۔

"آپ ہمت کریں گی تو وہی ہوگا جیسا ہم چاہتے ہیں۔ یقین جانیں مما میں مہرو سے بہت محبت کرنے لگا ہوں۔"

یہ آواز یحییٰ کی تھی جو اپنی ماں کے کندھے تھامے انہیں حوصلہ دے رہا تھا۔ یہ جانے بنا کہ جو خواہش ان سب کی ہے آیا وہ ہی خواہش ان سے وابستہ لوگ بھی رکھتے ہیں یا صرف اپنی خوشیوں کے لیے وہ دوسروں کی قربانی مانگ رہے ہیں مگر شاید خود پرستی کی فطرت نے انہیں دوسروں کے جذبات سمجھنے کی عادت ہی نہ ڈالی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو زندگی صرف اپنے لیے جینا چاہتے ہیں۔ باقی دنیا گئی بھاڑ میں۔

☆......☆......☆

مہر النساء واپس آئی تو جانے کیوں اُسے سب کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ ایسے جیسے گاؤں میں پہلے جیسی رونق ہی نہ ہو یا شاید اس کے اندر کی رونق ختم ہو گئی تھی۔ وہ بالکل خاموش ہو گئی۔ اس کی یہ خاموشی جلد ہی بھابی نے محسوس کر لی اور وہ اُسے ٹوکے بنا رہ نہ سکیں۔

"کیا بات ہے مہرو! تم جب سے واپس آئی ہو بہت چپ چپ ہو۔ لگتا ہے شہر یاد آرہا ہے۔"

"نہیں بھائی ایسا کچھ نہیں ہے۔ بس پتا نہیں میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ پژمردہ لہجے میں بولی۔

"تو ڈاکٹرنی صاحبہ آپ اپنے بھائی کے ساتھ جا کر ڈاکٹر سے چیک اپ کرائیں ایسا نہ ہو کہ طبیعت زیادہ بگڑ جائے۔"

بھائی نے مسکراتے ہوئے اس کے موڈ کو بحال کرنے کی کوشش کی۔

"میرے پاس دوا تھی میں نے لے لی ہے۔ انشاءاللہ ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

انہیں جواب دے کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ جب سے آئی تھی کبیر ایک بار بھی اس سے ملنے نہ آیا تھا۔ پھوپو، زوہا اور شہباز تو دو بار آ چکے تھے مگر جس کا اُسے انتظار تھا شاید وہ اُسے دیکھنے یا اس سے ملنے کی کوئی چاہ نہ رکھتا تھا۔ کبیر کا یہی سرد رویہ تھا جو وہ ابھی تک گل سے بھی ملنے نہ گئی وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اُسے منگیتر کی داستانِ محبت سنائے اور وہ پوری جان سے کڑھتی رہے۔ اُسے لگتا کبیر کا نظر انداز کرنا اُسے اندر ہی اندر کھا رہا ہے وہ لاکھ کوشش کرتی یہ ظاہر کرنے کی کہ اُسے کبیر کی کوئی پروا نہیں مگر ہر گزرتا دن اس کی اس کوشش کو ناکام بنا دیتا اور اب تو اس نے عہد کر لیا تھا کہ جب تک کبیر اس سے خود بات نہ کرے گا وہ بھی اس سے ہم کلام ہونے کی کوشش نہیں کرے گی۔ یہاں تک کہ اگر وہ گھر آیا تو میں اپنے کمرے سے باہر نہ آؤں گی۔ اس نے اپنے اس دل میں آئے خیال پر مضبوطی سے جمے رہنے کا عہد کر لیا اور مطمئن ہو گئی۔

☆...☆...☆

مہرو کا رزلٹ آ گیا تھا۔ وہ بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئی۔ اس خوشی میں بابا نے سارے گاؤں میں مٹھائی تقسیم کروائی کیونکہ پورا گاؤں ان کی اس خوشی میں شریک تھا۔ وہ خود سارا دن بہت مصروف رہی پہلے نیٹ پر اپنا رزلٹ چیک کیا پھر اُس کی کلاس فیلوز نے اُسے فون کر کے مبارک باد دی۔ آدھے سے زیادہ گاؤں اُسے مبارک باد دینے آیا۔ پھوپو، شہباز اور زوہا سب آئے سوائے کبیر کے، جس کی وہ منتظر رہی اور وہیں سب کے بیٹھے ہوئے پھوپو نے ایک پروگرام بھی ترتیب دے ڈالا۔

"میرا خیال ہے جس دن زوہا مایوں بیٹھے گی اس دن مہرو کے پاس ہونے کی خوشی میں ایک بڑی تقریب رکھی جائے۔ کیوں پتر! ٹھیک ہے۔" پھوپو نے اپنا پروگرام سب کو بتانے کے بعد مہرو سے رائے چاہی۔

"لو بھلا اس میں مہرو کو کیا اعتراض ہوگا۔"

اس کے کچھ کہنے سے قبل بھابی بول اٹھی۔

"ہاں بھئی اپنی مہرو پتر کو تو ویسے بھی کسی بات پر کوئی رولا نہیں ڈالتی جو جی میں آئے کرو میری بچی نے کیا کہنا ہے۔"

دادی نے اُسے خود سے قریب کرتے ہوئے فخریہ جتلایا۔ مہرو نے دیکھا کہ بابا کے چہرے پر بھی ایک مشفقانہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی اور وہ اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"کیوں پتر پھر ٹھیک ہے نا......"

پھوپو ابھی بھی اس کی رائے کی منتظر تھیں۔ جی پھوپو جیسی آپ کی مرضی۔

اس نے سب کی خوشی دیکھتے ہوئے ہاں کر دی ورنہ اُس کا دل بالکل نہ چاہ رہا تھا کہ اس کے پاس ہونے کی خوشی میں رکھی جانے والی تقریب پھوپھو کے گھر ہو۔

"بس تو ٹھیک ہے میں آج ہی تمہارا جوڑا سلنے دے دیتی ہوں۔" پھوپو اپنا دوپٹہ سنبھالتے ہوئے

اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اور ہاں سلامت علی تم اک بار خود فون کر کے بھائی کرامت اور ان کے گھر والوں کو بھی دعوت نامہ دے دینا۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی اعتراض کھڑا ہو جائے کہ جی ہم تو زوہا کی شادی میں آئے تھے۔ ہمیں کسی نے مہرو کے پاس ہونے کی اطلاع ہی نہ دی۔ نسرین کا تو پتا ہی ہے ایسے موقع پر فساد ڈالنے کے لیے تیار رہتی ہے۔''

پھوپو کی اپنی بڑی بھابی سے کبھی نہ بنتی تھی اور یہ بات سب ہی جانتے تھے اس لیے ابھی بھی ان کی ساری بات سن کر بابا مسکرا دیے۔

تم فکر نہ کرو میں فون کر دوں گا۔

بابا نے انہیں اطمینان دلایا، پھر بابا کے فون کرتے ہی رات یحییٰ کا فون آ گیا۔

''ارے مہرو تم نے تو بتایا ہی نہیں کہ تم پکی ڈاکٹرنی بن گئی ہو۔'' مہرو نے فون اٹھاتے ہی وہ خوشی سے چہچہایا۔ ''بس اب میں کل آ رہا ہوں مٹھائی تیار رکھو۔''

مہرو نے دیکھا اسی دم بیرونی دروازے کو دھکیلتا ہوا کبیر اندر داخل ہوا۔ بلیک شلوار قمیض میں ملبوس ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت اور اسمارٹ۔ ایک لمحہ میں وہ اپنی نظریں اس پر سے ہٹانا بھول گئی۔ یہ دل بھی نہ لاکھ نہ چاہنے کے باوجود بھی ذلیل کروانے پر تلا رہتا ہے۔

''ارے کنجوس مٹھائی کا نام سن کر کہیں بے ہوش تو نہیں ہو گئیں۔''

یحییٰ کی شوخ آواز اس کے کانوں ٹکرائی اور وہ جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آ گئی۔

''تم آؤ تو سہی مٹھائی کے ڈھیر لگا دوں گی۔''

وہ جان بوجھ کر زور سے بولی مقصد کبیر کو سنانا تھا جس میں وہ کامیاب ہو گئی۔ اُسے محسوس ہوا سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے سے قبل کبیر نے ایک ترچھی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی جو خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ یہ خوشی کبیر کی آمد کی تھی یا یحییٰ سے بات کرنے کی کسی بھی دیکھنے والے کے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا۔

''چلو تو پھر میرا انتظار آج اور ابھی سے ہی شروع۔ اور ہاں مٹھائی کھانے کے لیے تحفہ لانا نہ بھولنا۔'' وہ چہکی۔

''مہرو فون بند کرو اور کبیر کے لیے کچھ چائے پانی کا بندوبست کرو۔''

اُسے مسلسل فون پر چپکا دیکھ کر اماں بول ہی پڑیں۔ مہرو نے دیکھا کہ کبیر ٹیپو کو گود میں لیے اس سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ شاید وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ سن بھی نہ رہا تھا۔

''اچھی یحییٰ اللہ حافظ جمعہ والے دن آنا نہ بھولنا۔''

یحییٰ کو خدا حافظ کہہ کر وہ کبیر کی جانب متوجہ ہوئی۔

''السلام وعلیکم۔'' لاکھ کوشش کے باوجود وہ بنا سلام کے نہ رہ سکی۔

''وعلیکم السلام۔'' سرد لہجے میں جواب دے کر وہ پھر سے ٹیپو میں مصروف ہو گیا۔

نہ کسی خوشی کا اظہار اور نہ ہی کوئی مبارک باد۔'' وہ مایوس ہو گئی۔

''جاؤ بیٹا کچن میں جا کر صغراں کی مدد کرو چائے تیار کروانے میں۔'' اماں نے اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اماں میں کمرے میں سونے جا رہی ہوں۔ آپ صغریٰ سے کہیں وہ خود ہی بنا دے گی۔''

بنا کسی جواب کا انتظار کیے بنا وہ مڑی اور کھٹ کھٹ کرتی اپنے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر لیا اور اس کے بعد جب تک کبیر گھر رہا۔ وہ باہر ہی نہ نکلی۔ یہاں تک کہ رات اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا، وجہ کبیر تھا

جو کہ کھانے کی ٹیبل پر موجود تھا اور اب وہ کسی طور پر اس کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسی طرح وہ شاید خود کو سزا دے رہی تھی۔

☆......☆......☆

''یہ دونوں سوٹ تو بہت بھاری ہیں بھابی۔ زوہا تو دلہن ہے اور اب اچھا نہیں لگتا میں بھی اس کے مقابلے میں دلہن بنی پھروں۔''

اپنے سامنے رکھے سوٹ اس نے ہاتھ سے پرے کر دیے۔

''میں نے جو سوٹ زوہا کی مایوں کے لیے بنوایا ہے وہ ہی پہن لوں گی۔''

''مگر مہرو پھوپو ناراض ہو جائیں گی۔ انہوں نے بڑی محبت سے تمہارے لیے ڈریس تیار کروائے ہیں۔''

بھابی اس کا انکار سن کر حیران ہوتے ہوئے بولیں۔

''میں انہیں سمجھا دوں گی آپ ٹینشن مت لیں۔''

''چلو مایوں والے دن تو تم یہ سوٹ مت پہنو مگر مہندی میں تو تمہیں لازمی وہ ہی ڈریس پہننا ہوں گے پھوپو نے تمہارے لیے جو بنوایا ہے۔''

اب کی بار جب بھابی بولیں تو ان کا لہجہ خاصا شوخ تھا۔ مہرو چونک گئی۔

''کیوں اس دن کوئی خاص بات ہے؟'' بھابی کے چہرے پر کچھ ایسا تھا جس نے مہرو کو کریدنے پر مجبور کر دیا۔

''ہاں سنو اُس دن تمہارا اور کبیر کا نکاح ہے۔''

ایک بالکل غیر متوقع خبر اس کا منہ حیرت کے مارے کھل کر رہ گیا۔

''منہ بند کرو مکھی پڑ جائے گی۔''

اس کی شکل دیکھ کر بھابی ہنستے ہوئے بولیں۔

''مجھ سے پوچھے بغیر آپ سب نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔'' وہ ابھی بھی حیرت زدہ تھی۔

''اور مجھے تو چھوڑیں پہلے یہ بتائیں آپ لوگوں نے کبیر سے پوچھا کہ آیا وہ اس نکاح پر تیار بھی ہے یا نہیں۔'' اُسے یقین تھا کہ کبیر بھی اُس کی طرح بے خبر ہوگا۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو مہرو۔'' اس کے انداز نے بھابی کو چوکنا کر دیا۔

''تمہارے اور کبیر کے درمیان کوئی ناراضگی وغیرہ ہے کیا؟'' اس کی باتوں سے بھابی نے یہ نتیجہ اخذ کیا۔

''ناراضگی......'' اس نے طنزیہ انداز میں یہ لفظ دہرایا۔

''کیا آپ سمجھتی ہیں ہم دونوں کے درمیان کچھ ایسا ہے کہ ایک دوسرے سے ناراض ہوا جائے؟ ناراض ہونے کے لیے کوئی تعلق، کوئی ریلیشن ہونا ضروری ہے بھابی اور آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ ایسا کچھ بھی ہمارے درمیان نہیں ہے۔''

بھابی کو وہ خاصی بدظن سی لگی۔ جانے ایسا کیوں تھا انہیں سمجھ نہ آیا۔ ورنہ مہرو تو ہمیشہ سے ہی بڑی صابر و شاکر تھی۔ پھر آج اتنے گلے شکوے کیوں؟ شاید تعلیم نے اس کے خیالات کو یکسر تبدیل کر دیا تھا۔

''مہرو کوئی بات دل میں ہے تو بتا دو، ہو سکتا ہے میں تمہارے کسی کام آ سکوں۔'' انہیں اپنی اکلوتی نند سے بہت محبت تھی یہ ہی وجہ تھی جو انہیں مہرو کی خاموشی اور اداسی ذرا نہ بھائی۔

''نہیں بھابی ایسا کچھ نہیں ہے آپ پریشان مت ہوں۔''

بھابی کے گلے میں بانہیں ڈال کر مہرو نے انہیں تسلی دی۔

''بس آپ یہ والا سوٹ رکھ لیں۔ میں مایوں والے دن وہ والا سوٹ ہی پہنوں گی جو اماں نے

میرے لیے بنوایا ہے۔"

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔"

بھابی نے تمام کپڑے سمیٹتے ہوئے کہا اور مہرو مطمئن ہوگئی۔

☆......☆......☆

جمعہ کی صبح ہی تائی اور ان کی ساری فیملی آ گئی وہ سب لوگ پھوپو کے گھر پر ہی رُکے تھے۔ مہرو ابھی تک ان سے نہ ملی تھی۔ صبح سے تائی جی اُسے دو فون کر چکی تھیں جبکہ یحییٰ بھی اس سے ملنے کو بے قرار تھا مگر مہرو کے دل میں ایسی کوئی بے چینی نہیں تھی سوائے اس کے کہ سندس آپی کے آنے سے کبیر بہت خوش ہوگا۔ اسی سوچ نے صبح سے اس کے دل میں ڈیرے ڈال دیے تھے۔

شام میں وہ بڑی بے دلی سے تیار ہوئی اپنا وائٹ نیٹ کا سوٹ پہنا حالانکہ جانتی تھی کہ پھوپو کو سفید رنگ خوشی کے موقع پر پہننا کبھی اچھا نہیں لگا مگر پھر بھی اُس نے وہی سوٹ زیب تن کیا۔ ساتھ ہی بہت ہلکا سا میک اپ بھی کر کے بال کھلے چھوڑ دیے۔ اور جب وہ سب کے ساتھ پھوپو کے گھر پہنچی تو بالکل سامنے کبیر بڑے سے صحن میں کرسیاں لگوا رہا تھا۔ اُسے آج وہ خوش دکھائی دیا۔ مہرو کو اُس کے چہرے پر کھلتی مسکراہٹ ذرا نہ بھائی وہ بنا سلام کیے اُس کے پاس سے گزرتی اندر بڑے ہال میں آ گئی جہاں سب لوگ جمع تھے۔ سامنے بچھی رنگین چارپائی پر تائی جی اور دادی کے ساتھ ساتھ کبیر کی دادی بھی موجود تھیں۔ مہرو نے سب کو سلام کیا اور سلویٰ کے ساتھ صوفے پر جا بیٹھی۔ سندس آپی ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ مہرو کے سامنے والے صوفے پر ایسے بیٹھی تھیں، جیسے وہ اُسے جانتی ہی نہ ہوں۔ مہرو نے بھی انہیں مخاطب نہ کیا۔

"یحییٰ نہیں آیا۔"

یہاں وہاں دیکھ کر مہرو نے سلویٰ سے سوال کیا۔

"وہ باہر نہیں تھا؟" سلویٰ نے الٹا اُس سے ہی پوچھ ڈالا۔

"نہیں تو یا شاید میں نے نہیں دیکھا۔"

"اچھا رکو میں بلاتی ہوں۔" سلویٰ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سے پیشتر کہ وہ باہر جاتی یحییٰ خود ہی اندر آ گیا۔

"تمہیں دیکھ کر یقین نہیں آ رہا کہ یہ وہ ہی مہر النساء بی بی ہیں جو ابھی ابھی ہمارے پاس سے دندناتی ہوئی گزر کر اندر آئی ہیں۔"

مہرو کو دیکھتے ہوئے وہ ہنسا۔

"تم بھی باہر تھے میں نے تو تمہیں دیکھا ہی نہیں۔" جواباً مہرو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب یہ بتاؤ ڈاکٹرنی صاحبہ میری مٹھائی کہاں ہے؟" وہ مہرو کے سامنے رکھے ہوئے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"مٹھائی بھی مل جائے گی پہلے تحفہ تو دو۔"

اپنے بالوں کو جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے وہ ہنسی۔

"تحفہ تو میں لایا ہوں۔"

سلویٰ وہاں سے کب اٹھی، مہرو کو پتا ہی نہ چلا اب وہاں آمنے سامنے صرف وہ دونوں موجود تھے، خاندان کی بزرگ خواتین کچھ دور بیٹھی اپنی باتوں میں مگن تھیں۔ سندس آپی جانے کہاں تھیں۔ بھابی بھی باہر تھیں کہیں مصروف تھیں۔ پھوپو اور زوہا تو ابھی تک اُسے نظر نہ آئی تھیں۔

"دکھاؤ ذرا میں بھی دیکھوں تم کیا لائے ہو۔" وہ نہایت ہی سادگی سے بولی، جواباً یحییٰ نے اپنی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی ڈبیا باہر نکالی۔

"یہ کیا ہے؟ ڈبیہ کا سائز مہرو کو چونکا گیا؟"

یحییٰ نے کوئی جواب دیے بنا باکس کھول کر مہرو

کے سامنے کر دیا جس میں نہایت ہی حسین جگمگاتے نگوں والی نفیس سی انگوٹھی موجود تھی۔

"یہ کس کے لیے ہے؟" یحییٰ کے اس تحفہ نے جانے کیوں اُسے چونکا سا دیا۔

تمہارے لیے؟ وہ اُس کے سامنے بیٹھا اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ جانے اُس کی نظروں میں ایسا کیا تھا کہ مہرو گھبرا اٹھی۔

"یہ سارے جگ گلاس کہاں رکھ دیے ہیں تم لوگوں نے۔"

ایک دم باہر کا دروازہ کھول کر کبیر اندر داخل ہوا۔ وہ غالباً سامنے دادی کے پاس کھڑی جمیلہ سے مخاطب تھا اس کی یک دم، اچانک اس طرح انٹری نے مہرو کو مزید بوکھلا دیا۔ وہ مارے گھبراہٹ کے اٹھ کھڑی ہوئی جبکہ یحییٰ اُسی طرح باکس کھولے اپنی جگہ پر ہی بیٹھا تھا۔ مہرو نے دیکھا کہ کبیر نے صرف ایک نظر ان دونوں پر ڈالی اور کچن کی جانب بڑھ گیا وہ یک دم خجل سی ہو گئی۔

'جانے اس سچویشن کو دیکھ کر کبیر کیا سمجھا ہو گا۔' آج اسے یحییٰ کا انداز بھی کچھ بدلا بدلا سا لگا۔

"میں تم سے یہ رنگ اس طرح نہیں لے سکتی کیونکہ کوئی بھی تحفہ اُس وقت قیمتی لگتا ہے جب وہ بنا خوف سب کے سامنے دیا جائے۔ لہٰذا تم یہ رنگ تائی جی کو دے دو وہ سب کے سامنے مجھے دیں تو یقین جانو مجھے اچھا لگے گا۔"

"وہ تمہارے لیے اور بہت کچھ لائی ہیں۔ یہ تحفہ تو صرف میری جانب سے ہے۔ مہرو رکھ لو یقین جانو میں بہت محبت اور خلوص سے لایا ہوں۔"

یحییٰ کو یقین نہ تھا کہ مہرو اس طرح منع کر دے گی۔

"سوری یحییٰ میں ماں سے پوچھے بنا کسی سے کوئی تحفہ نہیں لیتی۔"

اسے جواب دے کر وہ زدہا کے پاس آ گئی۔ پتا نہیں کیوں سارا دن اس کا دل عجیب بے چین سا رہا۔ اُسے بار بار یہ محسوس ہوا جیسے کچھ انہونی ہونے والی تھی کیا وہ سمجھ نہ پائی مایوں کی رسم کب ہوئی اور اس میں کیا کیا ہوا اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ کھانا کھانے کو بھی اس کا دل نہ چاہا اور وہ بنا کھائے ہی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر چاچا اللہ بخش کے ساتھ گھر واپس آ گئی۔ آج اُسے بالکل اچھا نہ لگا یحییٰ کا اس طرح تحفے میں انگوٹھی لانا، یا شاید یحییٰ کی نظروں میں کچھ ایسا تھا جس نے مہرو کو بے چین کر دیا۔ اُسے لگا یحییٰ اپنی اور اس کی دوستی کو غلط معنی پہنا رہا ہے۔ لیکن کیوں وہ تو اس کا کزن ہونے کے ناتے سب کچھ جانتا ہے۔ اُسے علم ہے کہ کبیر اور میرے رشتے کا پھر آج مجھے وہ اتنا عجیب کیوں لگا۔ ہوسکتا ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔

اس نے خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، لیکن دل تھا کہ مان کر ہی نہ دیا۔ عشاء ہو گئی ابھی تک کوئی بھی پھوپو کے گھر سے واپس نہ آیا تھا۔

گاؤں میں تو تقریبات سر شام ہی ختم ہو جایا کرتی تھیں پھر یہ سب لوگ کہاں رہ گئے۔

نماز پڑھ کر وہ کچن میں آ گئی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ صغراں اور صابرہ بھی سب کے ساتھ پھوپو کے گھر تھیں۔ اس نے فریج کھولا کہ دیکھے کہ اگر کچھ پکانے کے لیے ہے تو نکال لے، اسی دم بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ شاید کوئی آیا تھا۔

"یہ کون آ گیا؟"

اس نے حیرت سے سوچا کیونکہ اماں اور بھائی کے پاس باہر کی چابیاں موجود تھیں، سست روی سے قدم اٹھاتی وہ باہر دروازے تک آئی اور بنا پوچھے ہی کنڈی کھول دی۔ سامنے یحییٰ کھڑا تھا۔

"باقی سب لوگ کہاں ہیں؟" اس نے اکیلے یحییٰ کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''آ رہے ہیں......''

مختصر سا جواب دے کر وہ اندر آ گیا۔ مہرو نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور واپس کچن میں آ گئی۔

''اگر چائے بنا رہی ہو تو ایک کپ میرے لیے بھی بنا دو۔ سر بہت دکھ رہا ہے۔''

یحیٰی اس کے پیچھے ہی کچن کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ مہرو کو الجھن سی محسوس ہوئی جانے کیوں آج اُسے یحیٰی کی یہاں موجودگی اچھی نہ لگی۔

''تم اندر جاؤ میں لے کر آ رہی ہوں۔''

توے سے روٹی اتارتے ہوئے وہ پیچھے دیکھے بنا بولی۔

''مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے مہرو۔''

مہرو کو حیرت ہوئی وہ ابھی بھی اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔

''لاؤنج میں جا کر بیٹھو یحیٰی میں کھانا لے کر وہیں آ رہی ہوں۔ پھر تمہاری بات سنتی ہوں۔'' وہ حتی الامکان خود کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔ اُسے لگا یحیٰی آج کوئی خاص بات کرنے والا ہے۔ اُس کا دل نہ چاہا کہ وہ یحیٰی کی کوئی بات سنے۔ شاید عورت ہونے کے ناتے اس کے دل نے اُسے کوئی خاص اطلاع دے دی تھی۔ جس کے باعث وہ یحیٰی کو اگنور کرنے پر مجبور ہوگئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یحیٰی کی کوئی بھی بات اس کے لیے دکھ اور تکلیف کا باعث بنے کیونکہ وہ ہمیشہ اُسے ایک اچھے دوست کی نظر سے دیکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ ان دونوں کی دوستی خراب نہ ہو۔

''ٹھیک ہے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

وہ فوراً ہی اُس کی بات مان گیا اور پلٹ کر لاؤنج کی جانب مڑ گیا۔ مہرو نے دل ہی میں شکر ادا کیا اور جتنی دیر میں وہ کھانا اور چائے لے کر لاؤنج پہنچی سب گھر والے آ گئے تھے۔

خلافِ توقع اماں اور بھابی کچھ خاموش سی تھیں جبکہ دادی واپس ہی نہ آئی تھیں۔ وہ وہیں پھوپو کے گھر سے بھی سوائے یحیٰی کے کوئی نہ آیا تھا۔ تم کس کے ساتھ آئے ہو۔ وہاں تمہارا سب پوچھ رہے تھے۔''

یحیٰی کو لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر بھابی نے ابرو اچکاتے ہوئے سوال کیا۔

''میں نے مما کو بتایا تھا۔''

یحیٰی نے سامنے رکھا چائے کا کپ اٹھا کر چسکی بھری۔ بھابی خاموشی سے ٹیپو کو گود میں لیے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔

مہرو کو حیرت ہوئی انہوں نے مہرو کی طبیعت کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ اُسے بھابی کا رویہ کچھ عجیب غریب لگا۔ وہ کچھ ناراض سی تھیں۔ ان کی ناراضگی کا سبب صبح ہوتے ہی مہرو کی سمجھ میں آ گیا جب وہ کچن میں ناشتے کے لیے آئی کیونکہ آج وہ پہلا دن تھا جب کسی نے اُسے ناشتے کے لیے بھی نہ بلایا۔

''نو بج گئے اور آپ نے مجھے جگایا بھی نہیں۔''

اس نے کچن کے دروازے پر کھڑے ہی کھڑے سوال کیا۔

''تم شہری ہوگئی ہو اس لیے میں نے سوچا کہ شاید اب ناشتا بھی بارہ بجے کرو جیسے تائی اور ان کے بچے کرتے ہیں۔''

بھابی کا لہجہ بالکل سادہ تھا۔

''کیا بات ہے بھابی آپ مجھ سے ناراض ہیں؟''

اب وہ بنا پوچھے رہ نہ سکی۔

''نہیں مہرو صرف ایک شکوہ ہے۔''

فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے وہ واپس پلٹیں۔

''اگر تمہارے دل میں کچھ تھا تو مجھ سے کہتیں۔ کم از کم پورے خاندان کے سامنے وہ سب تو نہ ہوتا جو رات ہمیں بھگتنا پڑا۔'' وہ بہت دکھی تھیں۔

''کیا ہوا ہے بھابی بتائیں تو سہی کیا بات ہے۔''

بھابی کے انداز نے اُسے پریشان کر رہے تھے۔

"تمہیں پتا ہے کبیر نے تم سے شادی کرنے سے انکار کردیا ہے۔" اپنے تئیں انہوں نے جیسے کوئی دھماکہ کیا۔

"وہ کہتا ہے تمہارے لیے یحییٰ زیادہ بہتر رہے گا۔ کیونکہ تم شہر کے ماحول کی عادی ہوگئی ہو۔"

یہ خبر مہرو کے لیے بالکل نئی تھی۔

"کبیر کو شرم آنی چاہیے اپنا راستہ ہموار کرنے کے لیے مجھے استعمال کررہا ہے۔" غصے میں بھی اُس نے اپنی آواز قابو میں رکھی۔

"اس نے صاف کیوں نہیں کہا کہ وہ سندس آپی کو پسند کرنے لگا ہے۔ کیوں میرے ساتھ یحییٰ کا نام لے رہا ہے۔"

وہ ہلکی سی آواز میں چلائی۔ اس کی آواز رندھ گئی۔ بھابی نے ایک حیرت بھری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ رات وہ سب کچھ تمہارے بارے میں کہہ رہا تھا اور اب تم اُس پر الزام لگا رہی ہو۔"

"یہ الزام نہیں حقیقت ہے بھابی جب کہ میرے اور یحییٰ کے درمیان ایسا کچھ بھی نہیں اور آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔" اُس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح صاف اور سادہ تھا۔

لیکن مہرو رات سب کے سامنے تائی نے تمہارا رشتہ بھی مانگ لیا۔ انہوں نے تو زور دے کر کہا کہ تم کبیر کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتیں کیوں کہ تم یحییٰ میں......"

اپنی بات انہوں نے جان بوجھ کر ادھوری چھوڑ دی وجہ مہرو کے چہرے کے تاثرات تھے۔

"وہ کیا کہہ رہی تھیں میرے لیے یہ جاننا ضروری نہیں میرے لیے اہم یہ ہے کہ کبیر نے جو کچھ کہا وہ کس بنیاد پر کہا۔ اس نے اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا ہے اور میں اب اُسے نہیں چھوڑوں گی۔"

وہ بنا ناشتا کیے تیزی سے باہر نکل گئی۔ بھابی اسے روکنے کے لیے اُس کے پیچھے لپکیں اتنی دیر میں مہرو بیرونی دروازہ عبور کرچکی تھی۔

☆......☆......☆

دشت تنہائی میں اے جانِ جہاں
لرزاں ہیں......

وہ تکیے سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے غزل سننے میں مصروف تھا۔ جب زوردار آواز کے ساتھ کوئی دروازہ کھول کر اندر آیا۔

کبیر نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بالکل سامنے مہرو کھڑی تھی۔ سرخ چہرے اور انگارہ آنکھوں کے ساتھ۔ اسے محسوس ہوا وہ رورہی تھی۔

"تمہیں کسی نے تمیز نہیں سکھائی، اس طرح کسی کے کمرے میں جاتے ہیں بنا اجازت لیے......" وہ غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"معاف کیجیے گا مجھے کسی تمیز کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے تیزی سے کبیر کی بات کاٹی۔

"پہلے آپ خود سچ بولنے کی ہمت خود میں پیدا کریں اور دوسروں پر الزام تراشی سے زیادہ بہتر ہے کہ جو آپ چاہتے ہیں وہ سب کو بتائیں۔ اپنی خوشیوں کے لیے مجھے کیوں استعمال کررہے ہیں۔"

غصے سے اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"ایک منٹ سانس تو لو اور پھر صاف بتاؤ میں نے کون سا تم پر الزام لگا دیا۔" کبیر حیرت زدہ اپنی جگہ کھڑا تھا۔

"اپنے اور سندس آپی کے لیے راستے ہموار کرنے کی خاطر آپ نے مجھ پر یحییٰ کا الزام لگا دیا۔ آپ کو تو شرم آنی چاہیے۔ میں تو آپ کی بہت عزت کرتی تھی اب پتا چلا آپ کس قابل ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ یک دم واپس پلٹی، کبیر اس کے

سامنے آ گیا۔

''میں نے تم پر کوئی الزام نہیں لگایا مہرو بلکہ وہی کیا جو تم چاہتی تھیں۔''

سینے پر دونوں ہاتھ باندھے شکن آلود ماتھے کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''آپ کو الہام ہوا کہ میں یہ چاہتی تھی اور یہ اچانک آپ کو میری چاہت کا کہاں سے پتا چل گیا۔ اس کے لیے تو آپ نے بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کیا چاہتی ہوں؟''

وہ ذرا نہ ڈری اور کبیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ کبیر کو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے چاہت نظر آئی یا شاید یہ اُس کا وہم تھا۔

''پتا نہیں مہر تم کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ اس کے چہرے پر زیادہ دیر نظریں نہ جما سکا اور نظریں چراتا ہوا بولا۔

''مجھے تو بڑی مامی اور سندس نے کچھ اور ہی بتایا تھا۔''

''میں سمجھ گئی۔ انہوں نے آپ سے کہا ہوگا میں یحیٰی سے محبت کرنے لگی ہوں اور آپ نے بنا تصدیق کیے آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا کیونکہ مجھ پر الزام لگانے والی ذات کسی اور کی نہیں آپ کی پسندیدہ ہی کی تھی۔ صحیح کہہ رہی ہوں نا میں......''

وہ کبیر کی بات درمیان سے کاٹتے ہوئے بولی آپ کو شاید یاد نہیں رہا کہ میں اپنی کوئی بھی چیز نہ تو کسی سے شیئر کرتی ہوں اور نہ ہی ایکسچینج خواہ وہ مجھے پسند ہو یا نہ ہو......

روانی سے کہتے ہوئے وہ خاموش ہوگئی۔

''رُک کیوں گئیں کہہ دو نا کہ تم اپنی ناپسندیدہ چیز پر بھی حق جتانے کی عادی ہو جیسے کہ میں......''

مہرو نے دیکھا کہ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے مہرو کو حوصلہ دیا۔

''بالکل آپ مجھے پسند نہیں ہیں اس کے باوجود میں نہیں چاہوں گی کہ سندس آپی مجھے آپ سے یحیٰی کے بدلے ایکسچینج کریں۔'' کبیر کے چہرے پر چھائے اطمینان نے اُسے شوخ کر دیا۔

''چلو پھر تم دونوں مجھے شیئر کر لو۔''

وہ ہلکے پھلکے انداز میں اُس کے چہرے پر نگاہیں جماتا ہوا بولا۔

''جان سے مار دوں گی جو آپ کو مجھ سے شیئر کرے گا۔''

روانی میں اس نے کیا کہا۔ اُسے پتا ہی نہ چلا ہوش تب آیا جب کبیر قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ وہ یک دم شرمندہ سی ہوگئی۔

''تم مجھ سے اتنی محبت کرتی ہو مہرو مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا ہے۔ میں تو بلاوجہ پتا نہیں کیا کیا سوچتا رہا......''

وہ سیدھا اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا، اور مہرو یہاں وہاں کیونکہ اب کبیر کی نگاہوں کا سامنا نہ کر سکتی تھی مہرو کے غصہ کی حالت میں کبیر کے کمرے میں جانے کی اطلاع سن کر پھوپو اور دادی جو بھاگی بھاگی وہاں پہنچیں تو ان دونوں کو شانت دیکھ کر ان کے دل بھی خوشی سے بھر گئے۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ نسرین بھابی نے جو کچھ بھی کہا وہ کبھی سچ نہیں ہو سکتا۔''

پھوپو نے مہرو کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے سینے سے لگا لیا اور پھر اسی شام اس کا کبیر کے ساتھ نکاح ہو گیا تایا جی اور سلویٰ بہت خوش تھے جبکہ تائی کے ساتھ ساتھ سندس اور یحیٰی کے چہرے بھی ستے ہوئے تھے مگر اُسے کسی کی پروا نہ تھی۔ اس کی چاہت صرف کبیر تھا جو اُسے مل گیا اور ساتھ ہی یہ احساس بھی کہ کبیر اُس سے محبت کرتا ہے۔ اس احساس نے مہر النساء کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورتوں کی فہرست میں لا کھڑا کیا تھا۔

☆☆......☆☆

ناول

بینا عالیہ

تیرے عشق نچایا

عشق کی راہداریوں، طبقہء اشرافیہ اور اپنی مٹی سے جڑے لوگوں کی عکاسی کرتے سلسلے وار ناول کی بائیسویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملک قاسم علی جہان آباد کے مالک تھے۔ ان کا شمار ضلع خوشاب کے جانے مانے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کے دو بیٹے ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ تھے۔ عمار علی ریاست کے امور میں دلچسپی لیتے تھے جبکہ ملک مصطفیٰ علی چھوٹی بہن امل کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں لاہور رہائش پذیر تھے، ملک عمار علی کی شادی ان کی کزن ماہین سے ہوئی تھی۔ وہ اٹھارہ سالہ لڑکی خود سے عمر میں کئی سال بڑے ملک عمار علی کو ذہنی طور پر قبول نہ کر سکی تھی۔ وہ کانوینٹ سے پڑھی ہوئی اور خاصے آزاد خیالات رکھتی تھی، جو لائف بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ اُم فروا اُم زارا اور اسماعیل بخش مولوی ابراہیم کی اولادیں ہیں۔ اُم فروا کی شادی بلال حمید سے ہوئی ہے جو میڈم فیری کے لیے کام کر رہا ہے۔ میڈم فیری کا تعلق اس جگہ سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ بلال حمید اُم فروا کو پہلی بار میکے لے کر آیا تھا کہ میڈم فیری کی کال آ گئی......

میڈم فیری نے بلال عرف بالو کو باور کرایا کہ جلد اُم فروا کو ان کے حوالے کر دے۔ بلال حمید کے لیے یہ ناممکن سا ہو گیا تھا کیونکہ وہ اُم فروا سے واقعی محبت کرنے لگا تھا۔ ماہین اپنے دیور مصطفیٰ علی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ امل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اُس کی شادی اُس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہونے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں لیکن امل کے خیالات کسی اور طرف بھٹکنے لگے تھے۔

ماہین اپنے بچپن کے دوست کاشان احمد سے ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کاشان بچپن ہی سے اُس میں دلچسپی لیتا تھا مگر کبھی محبت کا اظہار نہ کر پایا۔ ماہین اپنے آئیڈیل کے اس طرح بچھڑ جانے پر دکھی ہے۔ کاشان احمد ملک سے باہر جانے سے پہلے ماہین سے محبت کا اظہار کر دیتا ہے۔ ماہین ملک عمار علی سے ویسے ہی ناخوش ہے اس پر کاشان احمد کا اظہارِ محبت اُس کی زندگی میں ہلچل مچا دیتا ہے۔

ماہین کے دل میں کاشان احمد کی محبت بھی جڑ پکڑ رہی ہے اور اب وہ عمار علی کی شدتوں سے مزید خائف ہونے لگی ہے۔ امل کی شادی اس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ محمد علی اُسے محبتوں کی بارش میں نہلا دیتا ہے اور یوں فوجی افسر کی بیوی بن کر وہ اپنی پہلی محبت کی یادوں سے پیچھا چھڑا لیتی ہے۔ ماہین اور عمار علی کے بیچ میں تکرار ہونے لگی ہے۔ میڈم فیری بلال کو اُم فروا پر کڑی نظر رکھنے کا کہتی ہے۔ ایک دن اچانک بلال کی ملک مصطفیٰ علی سے ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ انہیں اعتماد میں لے کر اپنی اور اُم فروا کی رام کتھا سنا دیتا ہے۔ ملک مصطفیٰ علی اُسے اپنے ساتھ مراد ولا میں لے جاتا ہے اور انیکسی میں رہائش اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ فیری بلال کی تلاش میں ہے۔
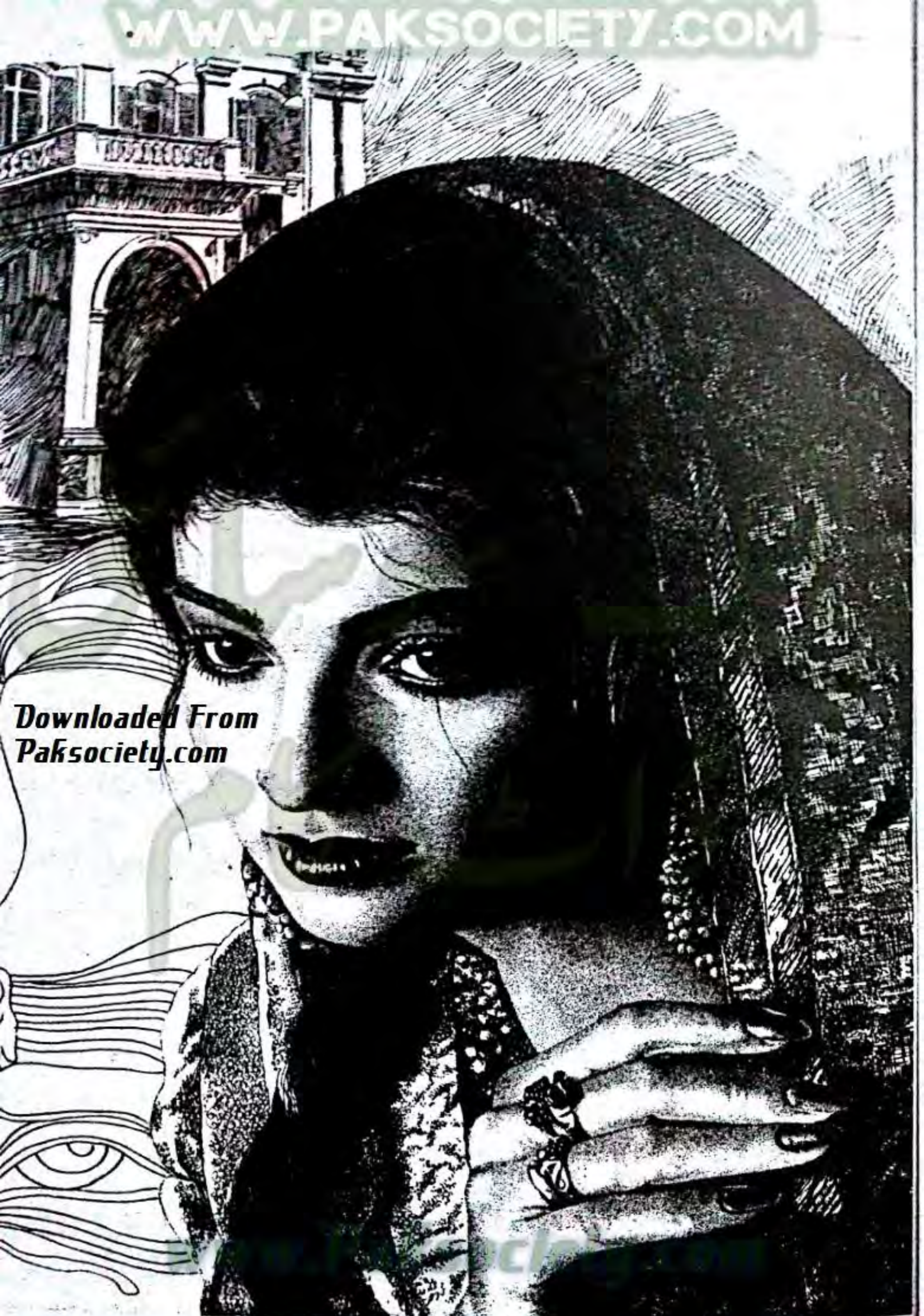
اچانک ملک قاسم علی کی وفات ہو جاتی ہے۔ سارا جہان آباد سوگ میں ڈوبا ہے۔ ملک عمار علی سارے انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے ملک کے فرائض انجام دینے لگتے ہیں۔
ماہین کی ذراسی غفلت اُسے نہ چاہتے ہوئے بھی ماں بنا دیتی ہے۔ ماہین کے دل میں کسی طرح بھی بچے کی محبت پیدا نہیں ہو پاتی۔ وہ ماں کے سنگھاسن پر بیٹھ کر بھی کاشان کی محبت کی ہُوک اپنے دل میں محسوس کرتی ہے۔ امل دوسری بار ماں بننے والی ہے۔ محمد علی مہرالنساء بیگم سے امل کا خیال رکھنے کا کہتا ہے۔ اِدھر مہرالنساء بیگم دادی بننے کے بعد چاہتی ہیں کہ ماہین ریاست کی بڑی ملکائن کی ذمے داریاں اُن کی زندگی ہی میں اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ماہین اس صورتِ حال سے سخت متنفر ہے۔ وہ جلد از جلد جہان آباد سے واپس لاہور جانا چاہتی ہے۔ لیکن ملک عمار علی اُس کی باتیں سن کر بہت رسان سے، اپنی محبت سے اُسے جہان آباد رہنے پر قائل کر لیتے ہیں۔
کاشان احمد، ماہین کو عمار علی کے ساتھ محبت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آخر ماہین کاشان کی محبت میں عمار علی کے ساتھ آہستہ آہستہ محبت کرنے لگتی ہے۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ عہد کرتی ہے کہ آئندہ زندگی وہ ملک عمار کی محبت کی پاسداری میں گزارے گی۔ زندگی نئی کروٹ لیتی ہے۔ ماہین دوسری بار اُمید سے ہوتی ہے۔ اچانک اُس کے سر کا سائیں، جہان آباد کے بڑے سرکار ملک عمار علی زندگی کی بازی ہار دیتے ہیں۔ جہان آباد اِس افتاد پر خون کے آنسو روتا ہے۔ ملک مصطفیٰ علی، بھائی کی اچانک موت پر دلبرداشتہ ہیں آخر ماں، بھابی اور بھتیجے کے لیے زندگی میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔
اُم فروا کو بلال آخر طلاق دے دیتا ہے اور اُم فروا واپس اپنے میکے آجاتی ہے۔ اُم فروا کی محبت میں ملک مصطفیٰ علی کا مسلسل دین کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے اور آخر کار......

(اب آگے پڑھیے)

اُس کے نازک اندام سراپے کی مہین ڈور اُنہیں اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ اُس کی ترنم کھنکتی آواز اُن کی سماعتوں کے ایوانوں میں اُتر رہی تھی۔ دل مچل رہا تھا کوئی دلیل اس پر اثر نہ کر رہی تھی۔ تنہائی پاتے ہی اُس کے خیال کے علاوہ وہ کچھ سوچ ہی نہ پاتے۔ آج بھی اُن کی آنکھوں کے نور میں وہ ساعتیں امر تھیں جنہیں زندگی سے بھی کشید نہ کر سکتے تھے۔ وہ گاڑی میں پیٹرول بھروا چکے تھے۔ اب اُن کی گاڑی شفاف سرمئی کشادہ سڑک پر فراٹے بھرتی منزلِ مقصود کی جانب رواں تھی۔

☆......☆......☆

اُمِ فروا گہری سوچ میں تھی کہ آخر ملک صاحب کی والدہ اور بھابی یہاں کیوں آ رہی ہیں؟ وہ بے بے جی کے پاس سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ پھر وہ یہی سوچنے لگی کہ اُن کی اور ہماری حیثیت ایک نہیں ہے۔ ہمارے درمیان اسٹیٹس کا بہت بڑا فرق ہے۔ ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں اتنے بڑے لوگ کیسے آ سکتے ہیں۔''
وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ آخر کیوں آ رہے وہ؟'' بس دماغ میں یہی بات گردش کر رہی تھی۔ کھلی کھڑکی سے اندر آتی خنک ہوا نے اس کے دہکتے گال کو چھوا۔ اُس نے گداز ہتھیلی عارض پر ٹیک لی۔ سرکتے گونگے لمحے مسکرائے، وہ اٹھی اور نماز پڑھنے کے لیے جائے نماز بچھانے لگی۔

☆......☆......☆

مولوی ابراہیم بخش کا یہ گھر کافی بڑا تھا۔ کمرے کھلے ہوادار اور اسٹائلش طریقے سے بنے ہوئے تھے۔ لاؤنج خاصا وسیع و عریض تھا۔ گھر کو نفاست و سادگی کے ساتھ مختصر لیکن قیمتی ساز و سامان کے ساتھ آراستہ کیا گیا تھا۔ لاؤنج میں تمام فرشی سیٹنگ تھی۔ ست رنگی اجرک پرنٹ میں چاندنی فرش پر بچھی تھی۔ اُس سے میچنگ فلور کشن اور

گاؤ تکیے پورے کمرے میں رکھے ہوئے تھے۔ دیوار گیر خطاطی کا انتہائی جاذبِ نظر فریم آویزاں تھا۔ دیواریں آف وائٹ تھیں، ٹی کلر جھالر والے پردے بھی آف وائٹ تھے۔ کھڑکیوں کے ساتھ انڈر پلانٹ چند گملے رکھے ہوئے تھے۔ لاؤنج کے اطراف تین کشادہ بیڈ روم تھے۔ کچن نفیس اور کھلا تھا۔ یہاں آ کر واقعی سچی طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ صحن میں پینٹ شدہ بے شمار گملے رکھے ہوئے تھے۔

مغرب کے بعد ماں جی اور ماہین یہاں پہنچے تھے۔ ملک قاسم علی کے ذاتی پرانے ڈرائیور بخت دین کے ساتھ۔ بخت دین اب مہرالنساء کا ڈرائیور تھا۔ ملک قاسم علی کے انتقال کے بعد وہ جانا چاہتا تھا کیونکہ اب یہاں پر اُس کا دل نہیں لگتا تھا۔ لیکن ملک مصطفیٰ علی اور مہرالنساء نے اُسے نہ جانے دیا۔ ان کے ساتھ سیماں بھی تھی۔ جس نے مٹھائی کی ٹوکری اور فروٹ کا کریٹ اٹھا رکھا تھا۔

ماں جی چپ چپ تھیں۔ خوش دکھائی تو دے رہی تھیں لیکن اُن کی آنکھیں اُن کی خوشی کا ساتھ دینے سے گریزاں تھیں۔ مہرالنساء مولوی صاحب کے گھر بہت کچھ لانا چاہ رہی تھیں۔ لیکن ملک مصطفیٰ علی نے منع کر دیا تھا۔ مبادا وہ لوگ بُرا نہ منائیں یہ خیال انہیں نہ آئے کہ اپنی امارت دکھائی جا رہی ہے۔

گیٹ سے باہر اسماعیل بخش نے انہیں خوش آمدید کہا تھا۔ دونوں خواتین اسماعیل بخش کو دیکھ کر چونکی تھیں۔ ایک نوجوان لڑکا، تراشیدہ داڑھی آف وائٹ شلوار قمیض میں ملبوس پیشانی پر محراب کا واضح نشان، شکل ایسی کہ خدا کی قدرت یاد آتے ہوئے بے ساختہ ہونٹوں سے سبحان اللہ نکلے۔

اسماعیل بخش کی نظریں بدستور جھکی رہیں، اُس نے انہیں راستہ دیا۔ صحن میں بے بے جی موجود تھیں۔ گاڑی کا ہارن انہوں نے سن لیا تھا۔ اُم فروا اور اُم زارا کچن میں تھیں۔ بے بے جی بہت اچھی دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے بہت لائٹ کلر زیب تن کر رکھا تھا۔ ساتھ میں ڈھاکہ ململ تارکشی بنا دوپٹا سلیقے سے سر پر لے رکھا تھا۔ جس پر نفیس سی سلکی لیس آویزاں تھی۔

ماہین تو بے بے جی کو دیکھ کر مبہوت رہ گئی۔ ایسا گریس فل بے داغ ملائم چمکتا چہرہ، میدے جیسے گلاب پتیوں سے گندھے گال، بڑی بڑی سنہری غزالی آنکھیں، جن پر اب بھی گھنیری مڑی ہوئی پلکیں موجود تھیں۔ اس عمر میں ایسا والہانہ وقار، متانت...... جب بے بے جی نے استقبال میں توصیفی کلمات ادا کیے تو لفظوں کے چناؤ پر ماں جی بھی بے طرح چونکی تھیں۔ واقعی باوقار خاندانی لوگ لگ رہے تھے۔ ماہین تو بس یہی سوچ رہی تھی کہ اس حسین ماں کی بیٹیاں جانے کتنی خوبصورت ہوں گی۔

''اندر تشریف لائیے۔'' لاؤنج میں آتے ہوئے آنے والے مہمان پھر چونکے۔ اس قدر سکون، اطمینان، روح کو سرشار کر دینے والا ماحول۔ مہرالنساء نے مراد ولا میں اپنی خواب گاہ کے ساتھ ایک فرشی نشست گاہ بھی بنا رکھی تھی۔ اکثر وہ وہاں جا کر بیٹھتی تھیں۔

''آپ ساتھ والے کمرے میں تشریف لے آئیں۔'' بے بے جی نے اُم فروا اور اُم زارا کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کمرہ بہت بڑا تھا، جہاں ایک طرف ان دونوں کا بیڈ تھا۔ درمیان میں جالی کے پردوں کے اُس پار لیونگ روم تھا۔ جہاں صوفہ، گلاس ٹیبل، کرسٹل کے گلدان وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ خطاطی کا بہت بڑا فریم یہاں پر بھی تھا۔ بے بے جی جھجک رہی تھیں۔ ایسی شان و شوکت والی خواتین لاؤنج میں نیچے کیسے بیٹھیں گی۔

''آ نئی ہم اِدھر ہی بیٹھیں گے۔'' ماہین جھٹ بولی۔ ''اُمِ فروا اور اُمِ زارا کہاں ہیں؟'' ماہین نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔

''آ رہی ہیں۔'' مہمان صوفہ کشن پر براجمان ہو چکے تھے۔ اُن کے چہروں سے لگ رہا تھا کہ انہیں یہاں آ کر اچھا لگا۔

چند لمحے بعد اُمِ فروا نپے تلے قدم اٹھاتی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ ماہین اور مہر النساء کی نگاہیں اُس کی طرف اٹھیں تو اسے دیکھتی رہ گئیں۔ ایسا بے مثال حسن ان دونوں خواتین نے آج سے پہلے نہ دیکھا نہ سنا۔ وہ تو کوئی اپسرا تھی، حور تھی یا پرستان سے آئی پری تھی۔ کیا تھی وہ؟ دونوں ٹکٹکی باندھے، بنا آنکھیں جھپکے اُمِ فروا کو دیکھ رہی تھیں۔ گلابوں کا سا سراپا رکھنے والی لڑکی انہیں گنگ کر گئی تھی۔ اطراف کی صدائیں جیسے اُس کے آ جانے سے بے صدا ہو گئی تھیں۔ سرو جیسا قد سانچے میں ڈھلا اُس کا بلوریں سراپا۔ ایسا ملکوتی حسن۔ اُن کی آنکھوں کے شوق بڑھا رہا تھا۔ بے بی پنک شیفون کے لباس میں ملبوس یہ رنگ اُس کے چہرے کی رنگت سے مشابہہ تھا۔

اُمِ فروا بری طرح نروس ہو چکی تھی۔ اُس نے باری باری دونوں کو سلام کیا۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ماہین سوچ رہی تھی مصطفیٰ بھائی نے اُمِ فروا کی جتنی تعریف کی تھی۔ وہ تو اس کے بے پایاں بے دریغ بے مثال حسن کے سامنے ایک ذرہ کے برابر تھی۔ خدا نے اُسے ایسا حسن معصومیت پاکیزگی عطا کی تھی۔

''یہاں میرے پاس بیٹھو۔'' مہر النساء نے اُسے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اُن کے نزدیک دوسرے کشن پر بیٹھ گئی۔ اُن کی نگاہیں بار بار اُمِ فروا کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ مہر النساء کے ہونٹوں پر نرم مسکان کھلی ہوئی تھی۔ جیسے اپنے بیٹے کی پسند کی خوب داد دے رہی ہوں۔ مولوی ابراہیم اور اپنی حیثیت کا جو احساس تھا۔ وہ اس لڑکی کو دیکھ کر فی الحال ذہن سے چھٹ چکا تھا۔ کیونکہ اس پری زادی کے سامنے ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے مفلوج ہو جاتا۔

اِس کے ہونٹ بے وجہ مسکا رہے تھے۔ کوئی اس کی سماعت میں کچی نیند جیسی سرگوشی کر گیا تھا۔ بے نام خوشبو اس کے پاس پاس کسمسائی۔ اچانک سے الوہی ترنگ میں اس کی آنکھوں میں ملک مصطفیٰ علی کے نام کا تارا چمکا تھا۔

''امیدیں رکھنی چاہئیں۔ امیدیں اچھی ہوتی ہیں۔'' کسی نے اس کے گال کے نزدیک سرگوشی کی۔

''اُمِ فروا۔'' ماہین نے محبت سے اس کا مرمریں ہاتھ اپنے ملائم ہاتھ میں لیا تو جواباً اُمِ فروا مسکرائی۔ ملک مصطفیٰ علی نے اسماعیل بخش کو سمجھا دیا تھا کہ اپنی بے بے جی کو منع کرنا اُمِ فروا اور بلال حمید کی بابت کوئی بھی بات ماں جی یا ماہین سے نہ کریں۔'' بے بے جی آخر ایسی بات کیونکر کرتیں۔ پہلی بار آنے والے مہمانوں کے سامنے۔ تھوڑی دیر بعد اُمِ زارا فریش ایپل جوس کے گلاس ٹرے میں رکھے لاؤنج میں داخل ہوئی۔ سلام کرتے ہوئے اُس نے ٹرے سامنے کیا۔ اُمِ زارا بھی بہت خوبصورت تھی۔ اُمِ فروا اور بے بے جی سے اس کی شکل ملتی تھی۔ لیکن یہ بھی کہا جا سکتا تھا اُمِ فروا اُس سے زیادہ حسین تھی۔

اب اُمِ زارا بھی اُمِ فروا کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد اُمِ زارا اٹھی تو اُمِ فروا بھی اُس کے ساتھ اٹھ گئی۔ تب مہر النساء نے اپنے آنے کا مدعا بیان کرنا چاہا۔ تمہید انہیں باندھنی نہیں آ رہی تھی۔ ماہین منتظر تھی کہ پہلے پھوپی ماں ہی بات شروع کریں۔ تب ماں جی نے نپے تلے لفظوں میں اپنے

آنے کی وجہ بیان کی۔ بے بے جی کے سر پر جیسے بم ہی پھوڑ دیا گیا تھا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا اتنے بڑے گھرانے کا رشتہ اُن کی اُم فروا کے لیے آیا تھا۔ بے بے جی خاموش تھیں۔

''بہن آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ اُمِ فروا ہماری بہو بنے۔ انشاء اللہ یہ ہمارے گھرانے میں بہت خوش رہے گی۔'' مہرالنساء نے خاموش بیٹھی بے بے جی سے کہا تھا۔

''جی آنٹی مجھے بھی مجھے بھی ایک اچھی فرینڈ مل جائے گی۔ بس آپ کو ہمارے حق میں فیصلہ دینا ہوگا۔ آپ گھر میں صلاح مشورہ کرلیں۔ بہت اُمید کے ساتھ آئے ہیں ہم۔''

''بیٹا وہ تو ٹھیک ہے لیکن کہاں آپ اور کہاں ہم؟'' مہرالنساء کی آنکھوں میں ہلکا سا کھنچاؤ بڑھا لیکن دوسرے لمحے انہوں نے خود پر کنٹرول پالیا۔ ایک تو بے بے جی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے بڑے رئیس زادے کا رشتہ اُن کی اُم فروا کے لیے آیا ہے۔ اور پھر اُمِ فروا کا پہلا نکاح...... ایسی باتیں چھپائی نہیں جاسکتیں۔

بے بے جی کے چہرے پر بے چینی تھی۔

''بہن آپ کیا سوچ رہی ہیں؟'' مہرالنساء نے اُن کا ہاتھ نرمی سے دبایا۔ بے بے جی جواباً صرف مسکرائیں۔

''بہن اگر آپ کی اُمِ فروا مصطفیٰ علی کی قسمت میں لکھی ہے تو انہیں مل کر ہی رہے گی۔''

''بے شک جو حکم رب کا ہوگا وہی ہو کر رہے گا۔'' بے بے جی نے آہستگی سے کہا۔

''میں مولوی صاحب سے بات کروں گی۔'' بے بے جی سوچ رہی تھیں کہ اگر واقعی خدا تعالیٰ نے ان دونوں کی زیست کے اوراق پر ایک دوسرے کا نام درج کردیا ہے تو بھلا ہماری کیا مجال۔

''آنٹی ہم خود مولوی صاحب کو منالیں گے۔ اگر دو خاندانوں کی آپس میں انڈرسٹینڈنگ ہوجائے تو یہ ظاہری حیثیت اہمیت نہیں رکھتی۔''

''ٹھیک ہے بیٹا میں مولوی صاحب اور اسماعیل سے بات کروں گی تفصیل کے ساتھ۔''

کھانا کھائے بغیر بے بے جی نے انہیں اٹھنے نہیں دیا تھا۔ کھانا بہت پُرتکلف اور لذیذ تھا۔ سب نے شوق و رغبت سے کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے بعد اسپیشل سبز قہوہ سرو کیا گیا۔ مہرالنساء اور ماہین کو واقعی میں یہ لوگ بہت پسند آئے تھے۔ گھر کے ماحول میں غیر معمولی روحانیت تھی۔ گھر کی تزئین و آرائش میں گونا گوں سکھ و اطمینان تھا۔

وہ لوگ جاچکے تھے۔ اتنی دیر مولوی صاحب اور اسماعیل بخش مسجد میں رہے تھے۔ اب مولوی صاحب اور اسماعیل گھر میں داخل ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد جب اُمِ فروا اور اُمِ زارا کچن سمیٹ رہی تھیں۔ بے بے جی نے مہمانوں کے آنے کا مدعا بیان کیا۔

''ملک مصطفیٰ علی کی والدہ اور بھابی ملک صاحب کا رشتہ اُمِ فروا کے لیے لائی ہیں۔'' اسماعیل بخش مسکرایا۔ لیکن مولوی صاحب خاموش رہے۔ پہلا خیال یہی مولوی صاحب کے ذہن میں کلک ہوا کہ ایسا ممکن نہیں ہے بے بے جی کا خدشہ درست تھا۔ اُن کے درمیان زمین آسمان جتنا فرق تھا۔

''مولوی صاحب کچھ تو بولیں۔'' بے بے جی انہیں خاموش پاکر بولیں۔

''اُمِ فروا کی ماں آپ خود ماشاء اللہ سمجھدار ہیں۔ ہمارا اور اُن رئیسوں کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔''

''مولوی صاحب میں نے یہ بات انہیں جتائی تھی۔ وہ کہتی ہیں آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں۔ آپ اور ہم

ایک ہی ہیں۔ انہیں تو بس اُم فروا کو اپنی بہو بنانا ہے۔''

''اُم فروا کے نکاح کا شاید انہیں علم نہیں ہے۔'' مولوی صاحب قہوے کا پیالہ اپنے قریب کھسکاتے ہوئے گویا ہوئے۔

''ابا جی ملک مصطفیٰ علی نے مجھ سے کہا ہے کہ اس نکاح کے بارے میں کسی سے ذکر نہ کیا جائے۔ ضرورت پڑنے پر میں خود اپنی والدہ سے بات کرلوں گا۔'' اسماعیل بخش نے مولوی صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے جھجک کر کہا۔

''دیکھو اسماعیل! ہمارا اُن کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ اُم فروا کی ماں اُن لوگوں کو انکار کر دو۔ ہم اپنی حیثیت کے لوگوں میں ہی بچیوں کے رشتے کریں گے۔''

''مولوی صاحب اتنی جلدی نہ کریں۔ چند ملاقاتیں اور کرلیں۔ ملک صاحب کی بھابی بہت اصرار کر رہی تھیں کہ آپ کچھ مت سوچیں۔ بس اُم فروا ہمیں دے کر ہم پر احسان کر دیں۔''

''آپ بیٹی کی ماں بن کر سوچ رہی ہیں۔ آپ یہ کیوں نہیں سمجھتیں ہمارا اُن کا جوڑ نہیں بنتا۔''

''مولوی صاحب آپ درست فرما رہے ہیں لیکن یہ بھی سوچیں کہ وہ بڑی چاہ اور شوق سے آئی ہیں۔ ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں آ کر وہ بہت خوش ہوئی ہیں۔ بار بار یہی کہہ کر گئیں کہ ہم انکار نہیں سنیں گے۔ بقول اُن کے اس ظاہری حیثیت کی اُن کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مولوی صاحب اُن کے رویے سے میں نے یہی اخذ کیا کہ وہ کسی قسم کے زعم فخر و انبساط میں مبتلا نہیں ہیں۔''

''ابا جی بے بے جی صحیح کہہ رہی ہیں۔ ایک دو ملاقاتیں ہونے دیں۔'' اسماعیل بولا۔

''ملک صاحب مجھے تو اچھے انسان لگے ہیں۔ غریبوں کے اَن داتا ہیں۔ اپنی امارت کبھی کسی پر نہیں جتاتے۔ اُن سے میری کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ اکثر وہ میری دکان پر آ جاتے ہیں بغیر کسی پروٹوکول کے۔ تمام خط کے فریمز کا آرڈر دیا ہے مجھے۔ جو انہوں نے باہر رہنے والے اپنے دوستوں کو تحفہ کے طور پر بھجوانی ہیں۔'' مولوی ابراہیم بخش نے کوئی جواب نہ دیا۔ قہوہ ختم کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھ گئے۔

کچن میں آ کر اُم زارا، اُم فروا سے بولی۔ ''آپی پتا ہے آپ کو یہ لوگ کیوں آئے تھے؟'' اِس کے چہرے پر معنی خیز مسکان عود رہی تھی۔

''مجھے کیا پتا۔'' اُم فروا نے شانے اچکاتے ہوئے قریب کھڑی اُم زارا کی طرف دیکھے بغیر کہا اور بچا ہوا کھانا فریج میں رکھنے لگی۔

''ہو...... ہو اس بے خبری پر قربان جاؤں۔'' وہ پھر اُس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

''کیوں تنگ کر رہی ہو اُم زارا۔'' اُس نے اچانک اندر مچلنے والی اتھل پتھل پر قابو پایا۔ لیکن فریج میں سالن کا باؤل رکھتے ہوئے اُس کے ہاتھ ضرور لرزے۔

''آپی پکڑی گئی چوری۔'' اُم زارا ہنسی۔ آج اُم زارا بہت خوش تھی۔ جبھی تو یوں چہک رہی تھی اور دل میں دعائیں کر رہی تھی کہ اللہ کرے ابا جی مان جائیں۔ بے بے جی کو وہ اور اسماعیل بخش منا ہی لیتے۔

''آپی میری طرف دیکھو۔''

''کیوں دیکھوں بھئی۔'' وہ مصروف سے انداز میں بولی۔ ''اگر کچھ بتانا چاہتی ہو تو بول دو۔'' اُم فروا کو بھی

جلدی تھی کہ اُم زارا بتائے کہ وہ لوگ کیوں آئے تھے؟ بے بے جی نے کیا کہا؟ ابا جی سے بات ہوئی بے بے جی کی؟ ابا جی نے کیا جواب دیا؟''

''بات سنو آپی۔'' اُم زارا نے اُسے اپنی جانب گھمایا۔'' ملک مصطفیٰ علی کی بھابی اور والدہ آپ کا رشتہ لے کر آئی تھیں ملک مصطفیٰ علی کے لیے۔''

''اچھا۔'' وہ قریب پڑے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اُم فروا کو کچھ کچھ امید تو تھی لیکن یقین نہیں تھا۔ اس لیے تو کہتے ہیں اُمید و یقین کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا چاہیے۔ امیدیں اچھی ہوتی ہیں اور یقین خدا پر ایمان کی دلیل ہے۔ اب اُم فروا کو جلدی تھی کہ اُم زارا خود ہی بتا دے کہ ابا جی بے بے جی نے کیا کہا۔

''آپی مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔'' اُم زارا اُس سے لپٹ گئی تھی۔

''آپی آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔'' اُم زارا اُس کے چہرے پر پھیلی حیرت دیکھ کر گویا ہوئی۔

''پتا نہیں اُم زارا۔''

''واقعی آپی وہ آپ کا رشتہ لے کر آئے تھے ملک مصطفیٰ علی کے لیے۔'' لیکن وہ یوں ہی زرد پڑی رہی۔

''آپی آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ اتنے بڑے گھرانے سے آپ کے لیے رشتہ آیا ہے۔ وہ بہت زور دے کر گئی ہیں کہ ہمیں ہر صورت ہاں ہی میں جواب چاہیے۔ انشاء اللہ ابا جی اور بے بے جی مان جائیں گی۔'' اُم زارا کی خوشی دیدنی تھی۔

''آپی میں بہت بہت خوش ہوں۔ اتنے بڑے رئیسوں کے گھر آپ کی شادی ہوگی۔ آپی سن لیں آپ! میں آپ کی شادی میں ڈھیروں کپڑے بنواؤں گی۔'' اُم زارا کو یوں خوش دیکھ کر وہ مسکرائی۔

''آپی ویسے ملک مصطفیٰ علی ہیں بہت گڈ لکنگ۔'' اُم زارا نے اُس کے کندھوں کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر آہستہ سے ہلایا۔

''اب بس بھی کردو اُم زارا۔'' اس وقت اُم زارا خوش تھی۔ اُس کی آنکھوں میں مسرور کن چمک اُبھر رہی تھی۔

'ملک صاحب نے میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی پرپوزل بھجوایا ہے۔ کیا وہ مجھے میری ہی طرح سوچتے ہیں؟ محبت کرتے ہیں مجھ سے؟' اُس کا ذہن اُلجھ رہا تھا۔ وہ کچن سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنی مخصوص ایزی چیئر پر بیٹھتے ہوئے وہ واقعی مضطرب تھی۔

دونوں گھرانوں کی حیثیت میں بہت فرق ہے۔ اچانک سے اُسے جھٹکا لگا۔ اگر انکار کر دیا گیا تو...... اس سے آگے نہیں سوچ پا رہی تھی۔ ہاں گلابی ہتھیلیوں میں نمی ضرور اُتر آئی تھی۔ اُس نے غیر ارادی طور پر نچلے ہونٹ پر دانت گاڑ دیے۔

پُر فسوں احساس اُم فروا کے اندر باہر ناچ رہا تھا۔ اچانک موبائل اسکرین پر ملک مصطفیٰ علی کا نمبر جگمگایا۔ تیسری بیل پر اُس نے کال ریسیو کر لی تھی۔

''السلام علیکم!'' سلام کرتے ہوئے اُم فروا کے دل میں خوب پکڑ دھکڑ پھیلی تھی۔

''وعلیکم اسلام کیسی ہیں آپ؟'' لہجے میں گنگناہٹ جیسا ردھم تھا۔

''اچھی ہوں۔'' مسکراہٹ اس نے ہونٹوں سے باہر آنے سے روکی۔ دونوں طرف مکمل خاموشی تھی کئی

خاموشی لیے سر کیے۔
''کچھ بولیں گی نہیں۔'' ملک مصطفیٰ علی کی گھمبیر آواز اُم فروا کی سماعتوں میں ابھری۔
''جی...... کیا؟'' وہ نروس تھی۔
''آج جو مہمان آپ کے گھر آئے تھے۔ اُن ہی کا ذکر کردیں۔''
''جی آپ کی ماں جی اور بھابی آئی تھیں۔ ماشاءاللہ دونوں بہت اچھی ہیں۔''
''شکر ہے میرے گھر والے آپ کو پسند تو آئے۔''
''پسند؟ وہ تو بہت پیارے لوگ ہیں۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ ایسی شان و شوکت والے لوگ ہمارے گھر آکر فرشی نشست پر اس قدر خوش ہو کر بیٹھیں گے۔''
''انہیں بھی آپ کی فیملی بہت پسند آئی ہے، خصوصی طور پر آپ...... ماں جی اور بھابی پہلی ہی ملاقات میں دیوانی ہوگئی ہیں آپ کی۔''
''آپ شرمندہ نہ کریں۔ وہ خود بہت اچھی ہیں۔''
''وہ اچھی ہیں اور ہم۔'' اچانک لہجہ پُرشوخ ہوگیا۔
''آپ بھی اچھے ہوں گے۔''
''ہوں گے سے مراد؟''
''کچھ نہیں۔'' وہ جھینپی۔
''اُم فروا آپ کو معلوم تو ہو چکا ہوگا وہ کس سلسلے میں آئی ہیں؟''
''جی۔'' جانے کیوں اُس کی زبان تالو سے چپکی جا رہی تھی۔
''پھر۔'' ملک مصطفیٰ علی کے لہجے کی پور پور میں خوشی پنہاں تھی۔
''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''
''آپ ہمارے بارے میں کچھ تو فرما سکتی ہیں؟''
''میں...... کچھ...... میں تو بس...... میں یہ کہوں گی کہ ایسا بھلا کیسے ممکن ہے۔ آپ کا اور ہمارا کوئی میل نہیں ہے۔''
''اُم فروا میل خدا بنانے والا ہے اگر اُس مالک نے ہمارا جوڑا بنادیا ہے تو ہم ضرور ملیں گے۔''
''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' وہ بغور اپنی گلابی ہتھیلی کی لکیریں دیکھ رہی تھی۔ یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ آیا ان لکیروں میں وہ بسے ہوئے ہیں یا رب کا حکم نہیں ہے۔
''اُم فروا آپ ضرور کہیں۔ میں سن رہا ہوں۔'' اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن اُسے بات تو کرنا ہی تھی۔
''آپ خاموش کیوں ہیں بولیں۔''
''آپ خود سمجھ جائیں میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔''
''اُم فروا میں نہیں جانتا آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''
''ملک صاحب میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔'' رندھے ہوئے گلے کے ساتھ وہ بمشکل کہہ پائی۔
''پلیز اُم فروا آئندہ کبھی ایسی بات نہ کیجیے گا۔ آپ کس قابل ہیں۔ آپ کیا ہیں، میں اچھی طرح جانتا

ہوں۔ مجھے آپ پر بھروسا ہے، مان ہے، یقین ہے۔ اور یہ سب بھی غلط ثابت نہیں ہوسکتا۔ آپ کی پاکیزگی کو میں سلام کرتا ہوں۔ جو ہوگیا اُسے بھول جائیں۔ خدا نے آپ کو محفوظ رکھا۔ میں ایسا اس لیے نہیں کہہ رہا کہ مجھے آپ پر یقین نہیں ہے، میں آنکھیں بند کرکے آپ کی پاکیزگی کا اقرار کرسکتا ہوں۔ پوری دنیا مل کر آپ کی بابت مجھے اُکسائے میں تب بھی دنیا پر یقین نہ کروں کیونکہ مجھے آپ پر یقین ہے۔ اُمِ فروا میں صحیح کہہ رہا ہوں ناں؟ میرا یقین پختہ ہے ناں؟ آپ اپنی زبان سے آج اقرار کرلیں۔ اُمِ فروا میں مانتا ہوں۔ آپ آج بھی اوس کے اُس پہلے قطرے کی مانند ہیں جو بیراگن رات کے نا جانے کس پہر دھرتی پر کسی نازک گلاب کی کسی ایک متبرک پتی پر ثبت ہوتا ہے اور اُس پتی کے نصیب کو امر کرجاتا ہے۔''

''ملک صاحب آپ درست کہہ رہے ہیں۔'' وہ جھجکتے ہوئے بمشکل کہہ پائی۔ تب ملک مصطفیٰ علی کے اندر دور تک گہری طمانیت سرایت کرگئی۔

''اُمِ فروا میں نے یہ فیصلہ جذباتی ہوکر نہیں کیا۔ بلکہ بہت عرصہ سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ ہی میری جیون ساتھی بنیں گی۔ جہاں تک حیثیت کی بات ہے۔ حیثیت تو اُن ہی پلوں میں ختم ہوگئی تھی۔ جب ملک قاسم علی اور ملک عمار علی کی بیویاں آپ کے گھر میں آتے ہی اُس ماحول میں سموگئی تھیں۔ گہری اپنائیت و طمانیت لے کر وہاں سے اٹھیں۔ میرا کوئی بزرگ نہیں ہے۔ میں خود مولوی صاحب سے تفصیل سے بات کروں گا۔ اُن کے تمام وہم اور وسوسے دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ بس آپ اتنا بتادیں آپ کو تو اس رشتے پر اعتراض نہیں ہے۔ اسی مقصد کے لیے میں نے فون کیا ہے۔ ممکن ہے میرا فون کرنا آپ کو اچھا نہ لگا ہو۔ اُمِ فروا آپ نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔''

''میرے والدین کا ہر فیصلہ میرے لیے قابلِ قبول ہوگا۔''

''اچھا جی۔'' وہ یک بارگی کھل اٹھے تھے۔

☆......☆......☆

ملک مصطفیٰ علی تھے کہ کسی ضدی بچے کی مانند اُن کا دل بار بار مچل رہا تھا اُمِ فروا کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے۔ ایسا کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ وہاں اُن کا رشتہ بھیجا گیا تھا۔ بھلا وہ کیسے اُن کے سامنے جاسکتی تھی، کیوں نہ ماہین سے کہوں۔ وہ اُمِ فروا کے لیے کچھ شاپنگ کردے اور میں اُن کے گھر جاکر دے آؤں۔ یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ اگر مولوی صاحب اور اسماعیل کو پتا نہ بھی چلے لیکن اُمِ فروا کی بہن اور والدہ کو تو پتا چلے گا ہی۔ اُن سے کوئی بات نہیں بن پارہی تھی کہ وہ کس طرح اُمِ فروا کو دیکھیں۔

'کہہ دوں گا بھابی نے یہ شاپنگ آپ کے لیے کی ہے۔ کسی کے گھر یوں منہ اٹھا کر چلے جانا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے ناں۔ مجھے تو بس اُمِ فروا کو ہر صورت دیکھنا ہے۔'

ماہین نے ہاسپٹل چیک اپ کے لیے جانا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی ماہین کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر کے پاس سے ہوکر ماہین سے کہوں گا اُمِ فروا کے لیے کچھ شاپنگ کرلے۔ نہیں...... نہیں یہ مناسب نہیں ہے۔ ماہین میرے بارے میں کیا سوچے گی۔

ملک مصطفیٰ علی تم تو پاگل ہوچکے ہو۔ اُس لڑکی کے عشق میں۔ وہ ہنسے واقعی اُس اپسرا کے خیالوں نے مجھے احمق ہی بنادیا ہے۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ اللہ سے مدد مانگ رہے تھے کہ کوئی سبیل نکل آئے جو وہ

اُم فروا تک رسائی پالیں۔

☆......☆......☆
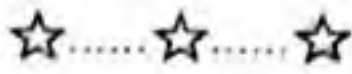
رات کو ڈنر پر وہ ماہین سے پوچھ رہے تھے۔

''بھابی کل آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہے ناں؟''

''جی ہاں صبح دس بجے بلایا ہے ڈاکٹر نے۔'' وہ مسکرائی۔ ماہین خوش رہنے کی کوشش کرتی تھی پھر بھی اُداسی کی کوئی نہ کوئی رمق اُس کے چہرے پر چھلک ہی آتی تھی۔ ملک مصطفیٰ علی نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جیسے کسی نے اُن کے چہرے پر گھونسہ جڑ دیا ہو۔ یقیناً ماہین کو ان دنوں عمار لالہ شدتوں سے یاد آتے ہوں گے۔ ماں جی کے ہاتھ زور سے لرزے تھے۔ انہوں نے کھانے سے ہاتھ روکا تو قف بعد پھر کھانے لگیں۔ ملک عمار علی تو ہر وقت انہیں یاد آتے تھے۔ ہلکا سا ملال ان تینوں کے چہروں پر قابض تھا۔ ماہین کا پہلے جیسا رنگ روپ نہیں رہا تھا۔ دودھیا گلابی رنگت جانے کہاں کھو گئی تھی۔ ناں ہی حسین آنکھوں میں پہلے جیسی چمک تھی۔ جو ہمیشہ اس کی آنکھوں کا احاطہ کیے رکھتی تھی۔ ملک عمار علی کیا گئے اپنی بے تحاشا محبت اس کے دامن میں سمو گئے۔

''ماہین!'' ملک مصطفیٰ علی نے اُسے پکارا۔ اُس کے جسم کا رواں رواں چونکا۔ کانٹا اور چمچ زور سے پلیٹ پر گرا۔ آنکھوں میں اتری نمی کمالِ مہارت سے پیچھے کی جانب دھکیلنے میں کامیاب ہوگئی۔ اُسے کافی سمجھ آچکی تھی آنکھوں میں بھر آنے والی نمی کو کیسے چھپانا ہے۔ اب وہ بلاوجہ مسکرائے جارہی تھی۔ مہرالنساء خاموشی سے کھانا کھاتی رہیں۔ جیسے ماہین کی کیفیت کا انہیں علم ہی نہ ہو۔

''بھابی میں آپ کے ساتھ صبح ڈاکٹر کے پاس چلوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''واپسی پر آپ کو شاپنگ کراؤں گا۔''

''مصطفیٰ بھائی میرے پاس چیزوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ فی الحال تو مجھے شاپنگ کی ضرورت نہیں ہے مزید سامان اکٹھا کر کے کیا کروں گی۔ ماہین نے اُداسی کو کافی حد تک چھپالیا تھا۔

''پرسوں میں جہان آباد جارہا ہوں۔ ماں جی آپ تو اِدھر ہی رُکیں گی ناں ماہین کے پاس۔''

''ہاں مصطفیٰ علی میں ماہین کے پاس رہوں گی۔'' ماں جی وہی مونگے کا معاملہ ہے ساتھ والے گاؤں کے سیدوں نے رپھڑا (پریشانی) ڈالا ہوا ہے۔ پٹواری کو بلایا ہوا ہے۔''

''مصطفیٰ علی صلح جو انداز میں بہت معاملات حل ہونے چاہئیں۔ اپنے بڑوں کی روایات کا پاس اب تم نے ہی رکھنا ہے۔'' مہرالنساء گویا ہوئیں۔

''ماں جی ایسا ہی تو کر رہا ہوں۔ یہ سیدوں کے نئے نویلے نوجوان لڑکے ہیں جو بہت جوشیلے ہیں۔''

''پتر تم اپنے بڑے شاہ جی سے مل کر اُن سے تفصیلی بات کر لینا تا کہ تمہاری بات سہل طریقے سے اُن کی سمجھ میں آجائے۔''

''ماں جی آپ کا حکم بجا۔ ایسا ہی ہوگا۔ آپ ہرگز فکر مند نہ ہوا کریں۔''

''ہاں پھوپی ماں وہاں سب ٹھیک چل رہا ہے۔ مصطفیٰ بھائی اپنے بزرگوں کے درس کبھی نہیں بھولیں گے۔ میرا خود بہت دل چاہتا ہے جہان آباد جا کر رہوں۔ اب لاہور میں میرا دل نہیں لگتا۔''

کھانے کے بعد مہرالنساء اپنی خواب گاہ میں چلی گئی تھیں۔ ملک مصطفیٰ علی اور ماہین لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ یہیں پر یسماں گرین ٹی لے آئی تھی۔ گلناز ماہین کی خواب گاہ میں تھی جہاں حسان علی سو رہا تھا۔

☆......☆......☆

ملک مصطفیٰ علی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے مولوی صاحب کے جواب کا۔ وہ اب بھی مولوی صاحب سے فون پر بات کرتے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہتیں۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ملک مصطفیٰ علی نے اُمِ فروا کو فون کیا تھا۔ وہ اُسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ آواز ہی سن لی جائے، یہی سوچ کر اُس کا نمبر ملایا تھا۔

''اسلام علیکم جی! اُمِ فروا نے پہلی ہی بیل پر فون اٹھالیا تھا۔

''وعلیکم السلام، کیسی ہیں آپ؟''

''اللہ کا شکر ہے آپ خیریت سے ہیں۔'' اُمِ فروا کا تنفس اچانک تیز ہوا۔

''الحمدللہ میں بھی ٹھیک ہوں۔'' دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ بات کیا کریں۔ کتنے لمحے خاموشی کے ساتھ سرک گئے۔

''مولوی صاحب کہاں ہیں؟'' معاً اس بابت پوچھا گیا کہ شاید اُمِ فروا کچھ ذکر کر دے۔ ممکن ہے مولوی صاحب نے کچھ تو بات کی ہوگی ان کے پروپوزل کے بارے میں۔

''وہ مسجد میں ہیں۔ عشاء کی نماز کے بعد مسجد میں سیرتِ نبوی ﷺ پر اجتماع ہے۔''

''اِس کا مطلب ہے دیر سے گھر آئیں گے؟''

''میرے خیال میں۔'' اُمِ فروا اپنے دوپٹے پر لگی لیس بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

''سوچ رہا ہوں میں بھی اس بابرکت محفل میں شرکت کرلوں۔''

''اچھی بات ہے۔'' شاید وہ مسکرائی تھی۔

''دیکھتا ہوں شاید چکر لگا بھی لوں۔''

''ملک صاحب گھر میں اکثر آپ کا ذکر ہوتا ہے۔''

''میرا ذکر آپ کے گھر میں؟'' وہ خوش دکھائی دے رہے تھے۔

''جی اسماعیل بھائی ابا جی سے آپ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔''

''صرف اسماعیل ہی میرا ذکر کرتا ہے؟'' وہ محظوظ ہوئے۔

''جی۔''

''اُمِ فروا اب آپ خوش رہتیں ہیں ناں؟'' ملک مصطفیٰ علی نے بات بدلی۔

''بہت خوش رہتی ہوں۔''

''اُمِ فروا میرے لیے دعا کیا کریں۔''

''آپ تو میرے محسن ہیں۔ آپ کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتی ہوں۔''

''اُمِ فروا یہ دعا بھی کر دیا کریں۔ مولوی صاحب میرے حق میں فیصلہ دے دیں۔''

''اگر اللہ چاہے گا تو آپ کے حق میں فیصلہ ہو جائے گا۔''

''اگر میرے حق میں فیصلہ ہو گیا تو آپ کو کیسا لگے گا؟'' وہ جھینپ گئی۔

''آپ ایسے سوال تو مجھ سے نہ کریں۔''
''اچھا نہیں کرتا۔ اگر میرے حق میں فیصلہ نہ ہوا تو میری لائف بہت ڈسٹرب ہو جائے گی۔'' اُم فروا خاموش تھی لیکن دل میں سوچ رہی تھی۔ انشاء اللہ آپ کے حق میں ہی فیصلہ ہوگا۔ آپ کیا جانیں میری زندگی بھی بہت ڈسٹرب ہوگی۔
''بس اُم فروا آپ کو میرے لیے ڈھیر ساری دعائیں کرنی ہیں۔'' وہ اُداس تھے۔
''جی اچھا۔''
فون بند ہو چکا تھا۔ اُم فروا بھی اُداس تھی۔ پریشان بھی تھی۔ گھر میں ملک مصطفیٰ علی کے بھیجے گئے رشتے کا تذکرہ نہیں ہو رہا تھا۔ مولوی ابراہیم بخش نے چپ سادھ لی تھی۔

☆......☆......☆

بلال حمید، ملک مصطفیٰ علی کی مہربانی سے اپنی لائف میں سیٹل ہو چکا تھا۔ نورین بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ ہر طرح سے بلال حمید کا خیال رکھتی۔ اُس کا بیٹا احمد بھی بلال حمید سے مانوس ہو چکا تھا۔ اب وہ بلال حمید کو پاپا کہنے لگا تھا۔ بلال حمید خوش تھا، مطمئن تھا۔ اب اُسے ہر چیز وقت پر ملتی تھی۔ نورین سلیقہ مند لڑکی تھی۔ گھر کو اُس نے اچھے طریقے سے ڈیکوریٹ کر لیا تھا۔ رات کو جب وہ تینوں مل کر کھانا کھاتے تو بلال حمید کی دن بھر کی تھکان دور ہو جاتی۔ احمد سے وہ بہت پیار کرتا تھا۔ اُس نے اُم فروا کے بارے میں اچھا سوچا۔ اللہ کو اُس کا یہ فعل پسند آ گیا۔ خدا نے اسے نیک و شریف زندگی کی ساتھی عطا کر دی۔ ایک یتیم بچہ عطا کر دیا۔ احمد کا خیال رکھ کر وہ مزید نیکی کما رہا تھا۔ وہ خوش ہے اس بات کا چاہے جتنی بار مرضی اعتراف کرتا۔ لیکن وہ حوروں والا حسن تاباں رکھنے والی اُم فروا اس کے دل میں کہیں چھید کیے موجود تھی۔

☆......☆......☆

ملک مصطفیٰ علی دو دن کے لیے جہان آباد جا رہے تھے۔ ماہین نے بھی اُن کے ساتھ جہان آباد جانے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ پھوپی ماں کے لیے اُداس تھی۔ عمار کے لیے اُداس تھی۔ مہر النساء کو قریبی رشتے دار کی فوتگی کی وجہ سے دو دن پہلے جہان آباد آنا پڑا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی کو کھاد بیج کے سلسلے میں جہان آباد آنا پڑا سوچا تعزیت بھی کر لی جائے گی۔
وہ شام کو جہان آباد پہنچے تھے۔ مہر النساء انہیں دیکھ کر بہت خوش ہو گئی تھیں۔ وہ بھی اپنے بچوں کے لیے اُداس تھیں خاص طور پر حسان علی کے لیے۔''
''ماہین پُتر تم نے اپنے آنے کا بتایا نہیں حالانکہ صبح ہی بات ہوئی تھی تم سے۔''
''پھوپی ماں میرا تو اچانک پروگرام بنا۔ مصطفیٰ بھائی آ رہے تھے سوچا میں بھی آپ سے مل لوں۔'' ملنا تو اُسے عمار علی سے تھا۔ اُن کی اُن یادوں سے ملنا تھا جو وہ اس بڑی حویلی اور جہان آباد میں چھوڑ گئے تھے۔
''پھوپی ماں میں نے سوچا کیوں نہ آپ کو سرپرائز دیا جائے۔''
''اچھا کیا بہت اچھا کیا جو تم آ گئیں۔'' وہ حسان علی کو گود میں بٹھائے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ اب وہ حسان علی سے باتیں کر رہی تھیں۔ ماں جی اور مصطفیٰ علی کو چھا سو کے ساتھ مصروف دیکھا تو وہ چپکے سے وہاں سے کھسک آئی۔

اپنی خواب گاہ میں قدم رکھتے ہوئے اُس کے ذہن پر جیسے پہروں میں لرزش ابھری۔ دروازے سے اندر ہوتے ہی سامنے کی فرنٹ دیوار پر ملک عمار علی اور ماہین کی شادی کی دیوار گیر تصویر نہایت قیمتی منقش فریم میں آویزاں تھی۔ اس تصویر کو جب جب ماہین نے دیکھا وہ سسک پڑی۔ ملک عمار علی کی آنکھوں کی خیرہ کرتی الوہی ملکوتی چمک، بھرے بھرے ہونٹوں پر گہری مسکان جیسے اُن کا انگ انگ ماہین کو پانے کی خوشی میں مہک رہا تھا۔

ماہین نے آنکھوں میں اتر آنے والی نمی کو روکا۔ اُس شخص نے چلے جانا تھا اسی لیے جاتے جاتے ماہین کو روحانی کرب ناکیوں کی بھٹی میں جھونک گیا۔

ماہین نے واش روم جا کر وضو کیا۔ وارڈ روب سے سفید ململ کا بڑا سا دوپٹا نکالا اور اُس کی بکل مارے مغرب کی نماز پڑھنے لگی۔ نماز سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ شہزادی حسان علی کو لیے اس کی خواب گاہ میں آ گئی۔

''نکی ملکانی جی چھوٹے ملک کو نیند آ رہی ہے۔''

''اسے بیڈ پر لٹا دو اور یہ کمبل باہر لے جا کر اچھی طرح جھاڑ کر لاؤ۔''

''جی اچھا!'' ماہین حسان علی کے پاس آ کر تکیے کے سہارے لیٹ گئی اور آہستہ آہستہ اسے تھپتھپانے لگی۔ شہزادی کمبل جھاڑ لائی تھی۔ حسان علی سو چکا تھا۔

''جی وڈی ملکانی جی آپ کو چائے کے لیے بلا رہی ہیں۔'' ماہین نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم حسان کے پاس ہی رہنا۔''

''جی اچھا۔'' شہزادی قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھ چکی تھی۔

☆......☆......☆

ڈنر کے بعد سب سفید چوڑی ٹائلز والے اس چبوترے نما تھڑے پر آ بیٹھے تھے۔ جو راہداریوں اور کمرے کے بیچ میں برآمدے سے پہلے تھا۔ جہاں زبردست قسم کا ڈیرہ لگا ہوا تھا۔ رنگین مرصع پایوں والے اونچے پیڑھے، میچنگ چارپائیاں جن پر جہان آباد کے بنے کھیس، اور چاندی کے چھابوں والے گاؤ تکیے لگے تھے۔ ملک عمار علی کا پیڑھا آج بھی رکھا جاتا تھا۔

یہاں اُسے یوں دیکھ کر مہر النساء اور ملک مصطفیٰ علی بھی خاموش تھے۔

وہ انہیں دیکھ کر مبہم سا مسکرائی۔ اور جلدی سے چائے دانی سے ٹی کوزی اتارتے ہوئے چائے بنانے لگی۔ اب وہ بلاوجہ مسکرا رہی تھی۔ چائے کے دوران ماں جی سے جہان آباد کے کسانوں کی ریاستی امور پر بات چیت ہوتی رہی۔

''چھوٹے ملک صاحب باہر منشی اور کاردار آئے ہیں۔'' لنگر خانے میں کام کرنے والی میدو تائی نے آ کر اطلاع دی۔ ملک مصطفیٰ علی نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سر کو خم دیا۔

''آپ لوگ گپ شپ لگائیں، میں مردان خانے جا رہا ہوں میدو باہر چائے پانی بھجوا دینا۔''

''جی بہتر چھوٹے ملک۔'' میدو چبوترے کی سیڑھیاں اُترتی لنگر خانے کی طرف غائب ہو گئی۔

مہر النساء کچھ پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔ خاندان کی خواتین طرح طرح کی باتیں کرنے لگی تھیں۔ ملک مصطفیٰ علی اور ماہین کے متعلق۔

دونوں جوان ہیں۔ اکیلے شہر میں رہتے ہیں۔ مہر النساء کیوں نہیں ان دونوں کا نکاح پڑھوا دیتی۔ شریکوں کو تو

موقع چاہیے کسی پر کیچڑ اچھالنے کا۔ مہرالنساء کی خود یہی خواہش تھی لیکن ماہین کے دوٹوک
مہرالنساء کے کانوں میں ایسی کئی باتیں پہنچی تھیں۔ مہرالنساء کی خود یہی خواہش تھی لیکن ماہین کے مصطفیٰ علی کی
جواب نے انہیں خاموش کرادیا تھا۔ شاید وہ یہ بھی سہار نہ پاتیں کہ اُن کے عمار علی کی بیوہ اُن کے
سہاگن بنے۔ اُم فروا مہرالنساء کو بے حد پسند آئی تھی۔ وہ پوری فیملی انہیں اچھی لگی تھی۔ لیکن اُن کے اور اپنے
اسٹینس کو لے کر پریشان تھیں۔ جب شریکوں کو اور جہان آباد کی رعایا کو معلوم ہوگا کہ ایک مولوی کی بیٹی ملک قاسم
علی کی بہو بنے گی تو دنیا بہت باتیں کرے گی۔ طرح طرح کی بولیاں بولی جائیں گی۔ وہ دل میں سوچتیں، اچھا ہو
جو مولوی صاحب انکار کردیں۔ دوسرے لمحے دماغ کی نسیں جھرجھری لیتیں۔ میرے بچے کی خوشی ہے یہ۔ میں
کیوں رکاوٹ ڈالوں۔ لوگوں کی خاطر اپنے بچے کا دل دکھاؤں۔ جب دل ٹوٹتے ہیں تو انسان اپنی ذات کا بھی
دشمن بن جاتا ہے۔ مجھے صرف اپنے بچے کی خوشی مقدم ہونی چاہیے۔ مولوی صاحب اچھے خاندان سے تعلق
رکھتے ہیں، نیک وصالح لوگ ہیں۔ نیک شریف انتہائی حسین لڑکی ہے۔ صوم وصلوۃ کی پابند ہے۔ مجھے اپنے
بارے میں سوچنا ہے۔ دوسرے کیا کہتے ہیں بھلا یہ سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ اُن کے اندر کب سے جنگ
چھڑی ہوئی تھی۔ جہاں وہ اپنے بیٹے کا دفاع کررہی تھیں۔

''پھوپی ماں کیا سوچ رہی ہیں؟'' ماہین کے پکارنے پر وہ چونکی تھیں۔

''اُم فروا کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ جانے وہ لوگ کب جواب دیں گے۔''

''دے دیں گے پھوپی ماں! انشاءاللہ ہاں میں ہی جواب آئے گا۔''

''پتر اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''

''پھوپی ماں وہ بیٹی والے ہیں۔ انہیں بھی تو سوچنا ہے۔ یہ بھی تو سوچ سکتے ہیں کہ ہمارے اور اُن کے
اسٹیٹس میں بہت فرق ہے۔'' ماہین نے خود ہی اُن کی مشکل آسان کردی تھی۔

''ماہین اُن کا حق ہے اپنی بیٹی کے لیے سوچنا۔ اُن کی سفید پوشی سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''پھوپی ماں انہیں تو فرق پڑتا ہے ناں۔ وہ چاہیں گے اُن کی بیٹی کسی قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہو۔
وہ بہت سوچ سمجھ کر دلیلوں کے ساتھ فیصلہ کریں گے۔ اب ہمارا یہ کام ہے کہ ہر طریقے سے انہیں مطمئن کریں۔
اب لاہور واپس جاتے ہیں ناں تو آپ اور میں ایک مرتبہ پھر اُن کے گھر چلے جائیں گے۔ پھوپی ماں ہمیں اُن
لوگوں کو مطمئن کرنا ہوگا۔ اُن کے ذہن میں اٹھتے ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔''

''ماہین تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' مہرالنساء سوچ رہی تھیں کہ ماہین کس قدر سمجھدار ہوگئی ہے۔

''پھوپی ماں اُم فروا بہت اچھی لڑکی ہے۔''

''ہاں وہ تو پہلی ملاقات میں ہی اندازہ ہوگیا تھا۔ پتر یہ تمام ریاست تم بچوں کی ہی ہے۔ اُن کی سفید پوشی
سے ہمیں غرض نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے اناج میں فصل کی اوسط میں اللہ پاک نے بہت برکت ڈال رکھی ہے۔
میری تو ہمیشہ یہی دعا رہتی ہے آنے والی نسلیں بھی اپنے آباؤ اجداد کی اس ریاست کی حفاظت کریں۔ جیسے اُن
کے بڑوں نے ایمانداری اور غریبوں پر ظلم کیے بغیر اس ریاست کے نظام کو چلائے رکھا۔ ماہین پتر پہلا درس ہی
اپنی اولادوں کو یہی دینا۔ ناحق کسی غریب پر زیادتی نہ کریں۔ اس ریاست میں رہنے والا کوئی شخص یا جانور رات
کو بھوکا نہ سوئے۔ ورنہ روزِ محشر کا حساب بہت شدید ہے۔''

☆......☆......☆

اسماعیل بخش بار بار مولوی صاحب کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا ملک مصطفیٰ علی ایک نیک نیت اور اچھے انسان ہیں۔ وہ مولوی صاحب کی فیملی کو جانتے نہیں تھے پھر بھی انہوں نے اُم فروا کو ایک تنہا لڑکی سمجھتے ہوئے بھر پور طریقے سے مدد کی۔ بحفاظت اُسے گھر تک پہنچایا۔ اسماعیل کی دلی خواہش تھی ملک مصطفیٰ کا پروپوزل قبول کرلیا جائے۔ بھلا انہیں رشتوں کی کیا کمی، ہمارے گھر کی شرافت دیکھ کر ہی انہوں نے رشتہ بھیجا ہے۔'' وہ مولوی صاحب کو منانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ بے بے جی تو مان گئی تھیں۔ مولوی صاحب نے ہی خاموشی سادھ رکھی تھی۔ اُدھر ملک مصطفیٰ علی فکرمند تھے کہ مولوی ابراہیم بخش جانے اب کیا فیصلہ کرتے ہیں۔''

ماہین بے بی شاپنگ مکمل کر چکی تھی۔ مہر النساء لال حویلی میں ہی تھیں، حسان علی زیادہ تر اُن کے ہی پاس رہتا تھا۔ حسان علی چلتا تھا، بھاگتا تھا، خوب باتیں کرتا توتلی زبان میں۔ چاچا اور دادو کی وہ جان تھا۔ حسان علی کی وجہ سے ان سب کے دلوں کی رونقیں بڑھ گئی تھیں۔ حسان علی کی شکل بالکل عمار علی پر تھی۔ اُس کی جسامت ابھی سے باپ جیسی معلوم ہو رہی تھی۔ جب جب ماہین حسان علی کو دیکھتی۔ اُسے عمار علی یاد آتے۔

ماہین اور مہر النساء کی خواہش تھی ماہین کی ڈیلیوری سے پہلے پہلے ملک مصطفیٰ علی کا رشتہ پکا ہو جائے اور ڈیلیوری کے بعد شادی کردی جائے۔ مہر النساء جلد ملک مصطفیٰ علی کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی تھیں۔

آج انہیں اُم فروا کے گھر جانا تھا۔ لیکن ماہین کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ ماہین ہی کے کہنے پر مہر النساء نے بے بے جی کو فون کیا تھا۔ تھوڑی دیر رسمی گفتگو کرنے کے بعد وہ اصل مدعے کی طرف آئی تھیں۔

''فاطمہ بہن پھر آپ نے کیا سوچا؟''

''مولوی صاحب سے میری تفصیلی بات ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بہترین لوگ ہیں لیکن......'' بے بے جی رُکیں۔ پھر گویا ہوئیں۔

''آپ کی اور ہماری حیثیت میں بہت فرق ہے۔''

''فاطمہ بہن آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں۔ ہم تمام گھر والے اپنی مرضی و خوشی سے خلوصِ دل کے ساتھ اُم فروا کو اپنانا چاہتے ہیں۔ آپ کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی ہم سے۔ اگر آپ کو اُم فروا کی بابت آنے والے مستقبل سے وسوسے ہیں تو آپ جتنا چاہیں میں حق مہر اُم فروا کے نام کرنے کو تیار ہوں۔ بس گزارش ہے اس بچی کو ہمیں سونپ دیں۔'' بے بے جی خاموش تھیں۔ مہر النساء جانتی تھیں مصطفیٰ علی اُم فروا کے بغیر نہیں رہ پائے گا۔ مہر النساء کو ہر صورت مولوی ابراہیم کی فیملی کو منانا تھا۔

''آج میں نے اور ماہین نے آپ کی طرف آنا تھا لیکن ماہین کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ میں اور ماہین کل آئیں گے اور مولوی صاحب سے خود بات کریں گے۔''

☆......☆......☆

فرائی ڈے کی اُس شام ماہین اور مہر النساء مٹھائی سمیت دوبارہ پہنچ گئی تھیں۔ چائے کے بعد مہر النساء نے بے بے جی سے کہا کہ آپ مولوی صاحب کو بلائیں میں خود اُن سے بات کروں گی۔''

اس وقت مولوی ابراہیم بخش نگاہیں جھکائے بیٹھے تھے۔ گھر آئے مہمانوں نے اُن سے ملنے کی خواہش کی تھی۔ تو وہ ملنے سے کیسے انکار کرتے۔ مہر النساء نے تفصیل کے ساتھ اُن سے بات کی تھی۔ خدشہ وہی تھا۔ آپ

کی فیملی سے ہمارا کوئی جوڑ نہیں ہے۔
''مولوی صاحب آپ تمام خدشات دل سے نکال دیں۔ ہم خلوص دل اور نیک نیتی سے اُم فروا کو اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔ آپ اللہ کی ذات پر بھروسا کرتے ہوئے فیصلہ ہمارے حق میں دے دیں۔ آج ہم ہاں کرائے بغیر نہیں اُٹھیں گے۔'' اسماعیل بخش اور بے بے جی بھی پاس تھے۔ مولوی ابراہیم بخش پہلی بار گویا ہوئے۔
''بہن جی بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ صرف ان کے نصیب سے ڈر لگتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بہت اچھے لوگ ہیں۔''
''مولوی صاحب ہمارے اچھے ہونے کا آپ خود اعتراف کر رہے ہیں۔ تو بس ہاں کر دیں۔ آج میں ہاں کرائے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔'' مولوی صاحب نے بے بے جی اور اسماعیل کی طرف دیکھا۔ اُن کی نگاہوں میں بھی رضا مندی تھی۔ لیکن مولوی صاحب کے چہرے پر فکر مندی بدستور قائم تھی۔ ایک مرتبہ پہلے بھی وہ اُم فروا جیسی بیٹی کے لیے دھوکہ کھا چکے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی تو مولوی صاحب کے سامنے تھے جنہوں نے اُن کی مدد کی تھی۔ مولوی صاحب اور اسماعیل جہان آباد بھی جا چکے تھے۔ ملک عمار کی تعزیت کے لیے، انہیں یقین تھا کہ انشاء اللہ وہ دھوکہ نہیں کھائیں گے۔
''ٹھیک ہے۔ بہن جی آج سے اُم فروا آپ کی بیٹی ہے۔''
''شکریہ مولوی صاحب!'' مہر النساء اور ماہین بہت خوش تھیں۔ ماہین کا دل چاہا میسج کر کے ملک مصطفیٰ علی کو یہ خوشخبری سنا دے۔ لیکن نہیں...... ماہین کو تو انہیں سرپرائز دینا تھا۔ خوب تنگ کرنا تھا، آسانی سے تھوڑی بتانا تھا۔ سب بہت خوش تھے۔
''اُم زارا جلدی سے مٹھائی لاؤ۔'' ماہین نے اُم زارا سے کہا۔ اُم زارا کچن میں آتے ہی بہن سے لپٹ گئی تھی۔
''آپی بہت بہت مبارک ہو، ملک مصطفیٰ علی کا رشتہ منظور کر لیا گیا ہے۔'' اُم فروا حیرت سے بہن کو دیکھ رہی تھی۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اور ملک مصطفیٰ علی ایک ہو جائیں گے۔ وہ خوبرو شہزادوں جیسا شخص اس کا ہو جائے گا۔ خوشی تھی کہ اس کے گلال عارضوں پر چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ ہواؤں میں اُڑ رہی ہے۔
ماہین نے اُم فروا کے کمرے میں جا کر اُس کی بہت ساری تصاویر بنالی تھیں۔
''اُم فروا اب تو تم ہماری ہو چکی ہو۔ تمہاری تصویروں پر بھی ہمارا پورا حق ہے۔'' ماہین اُس کی خنداں پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جواباً اُم فروا کھل کر مسکرائی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں جلتی جوت بتا رہی تھی کہ وہ بہت خوش ہے۔ طے یہ ہوا تھا ملک مصطفیٰ علی اور اُم فروا کا نکاح ہو جائے۔ رخصتی ماہین کی ڈیلیوری کے بعد، کیونکہ فوزیہ نے ملک مصطفیٰ علی کی شادی میں شرکت کرنی تھی اور وہ تین چار ماہ بعد آ سکتی تھیں۔

☆......☆......☆

سادگی سے ملک مصطفیٰ علی اور اُم فروا کا نکاح ہو گیا تھا۔ نکاح افراتفری میں ہوا تھا۔ ال نہیں آ سکی تھی۔ مولوی صاحب نے ملک مصطفیٰ علی کو اُم فروا کے ساتھ بیٹھ کر تصویریں بنوانے کی اجازت دے دی تھی۔ تصویروں کے حق میں وہ نہیں تھے لیکن بیٹی کے سسرال والوں کی خوشی کا احترام کرنا بھی ضروری تھا۔

☆......☆......☆

خوشی کیا ہوتی ہے؟ زیست کا چارم مشکباری لیے ایسا ہی دبیز ہوتا ہے جب گہری آسودگی کی لہر وجود کے روم

روم میں سرایت کرتی ہے تو کیسی بے پایاں الوہی سرشاری روح کے در و بام کو وضو کرا جاتی ہے۔ ملک مصطفیٰ علی کی بھی کچھ ایسی فیلنگز تھیں۔ ابھی صرف چند روز ہی تو گزرے تھے اُن کے نکاح کو۔ لیکن محسوس ہوتا تھا گزشتہ کئی موسموں کی ہر ہر ساعت ایک دوسرے کی ہمراہی میں کشاں کشاں چلتے رہے ہیں۔ کیا بے خود محبت ایسا ردھم ہے جو روح کے ہر سرے میں گونج اٹھی ہے۔ چھو لیتی ہے دل کے آبگینوں کو۔ اُمِ فروا اُن کی ہے۔ یہ احساس انہیں عجب سرور بخش جاتا۔

وہاں اُمِ فروا بھی خود سے ایسے ہی سوال کرتی تھی۔

☆......☆......☆

''ماہین نے بے بے جی سے اجازت لے لی تھی کہ اُمِ فروا اور ملک مصطفیٰ علی فون پر بات کر لیا کریں۔ اس طرح ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کا انہیں موقع مل جائے گا۔''

نکاح ہو چکا تھا بے بے جی کا سوچنا یا انکاری ہونا نہیں بنتا تھا۔ سو انہوں نے اجازت دے دی تھی۔ اب اُمِ فروا ملک مصطفیٰ علی کی منکوحہ تھی، اُن کی زوجیت میں آچکی تھی۔ اب رات کو اکثر دونوں کے درمیان لمبی بات ہوتی۔ اُمِ فروا نے انہیں ملک صاحب کی بجائے ملک جی کہنا شروع کر دیا تھا۔

اب اُن دونوں کی محبتوں میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ مصطفیٰ علی اللہ اور اُس کے بعد بلال حمید کے ممنون تھے۔ جس کی وساطت سے انہوں نے اُمِ فروا تک رسائی پائی تھی۔

ماں جی اور ماہین کی اکثر اُمِ فروا سے بات چیت ہوتی رہتی۔ ایک دو بار ملنے بھی آئیں۔ جب بھی ملک مصطفیٰ علی جہان آباد جاتے واپسی پر خوشاب کی مشہور مٹھائی مولوی صاحب کے گھرانے کے لیے ضرور لاتے۔ ماہین جب بھی شاپنگ کرتی اُمِ فروا کے لیے خاص طور پر شاپنگ کی جاتی۔ مولوی صاحب کی اجازت سے ماہین اُمِ فروا کو لبرٹی لے آئی تھی۔ اُمِ فروا کی پسند کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عروسی اور ولیمہ کے جوڑوں کے آرڈرز دیے گئے تھے۔ ایک معروف ڈیزائنر کو باقی بری کے ملبوسات کے لیے۔ دوسری ڈیزائنر ہائیر کی گئی۔ اُمِ فروا کی اپائنٹمنٹ چند بار ماہین نے ارینج کروائی تھی۔ ڈیزائنر حیران ہوتی اُمِ فروا کی چوائس پر۔ کلر سکیم' اسٹائل' نفاست کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُس نے او کے کیے تھے۔

مہر النساء نے اپنا خاندانی زیور تینوں بچوں میں برابر تقسیم کیا تھا، ساتھ میں نیا زیور بھی بنوایا گیا تھا۔ اپنے فیملی جیولرز کو مہر النساء لال حویلی بلوا لیتیں۔ انہوں نے اُمِ فروا کے لیے کئی سیٹ آرڈر کیے تھے۔ جس میں پنا، نورتن، براؤن، یاقوت، زمرد، فیروزہ، ڈائمنڈ، گولڈ میں یہ تمام سیٹ تھے۔

مہر النساء مطمئن تھیں۔ اُن کے بیٹے کی پسند واقعی لاجواب ہے۔ اب انہیں لوگوں کی پروا نہیں تھی، نہ ہی انہوں نے تفصیل سے کچھ بتایا تھا۔

☆......☆......☆

اس مشکبار ارغوانی ہلکی سی خنکی بھری صبح میں ماہین نے لاہور کے پرائیویٹ ہاسپٹل میں ایک تندرست بیٹے کو جنم دیا تھا۔

جہاں ملک مصطفیٰ علی اور مہر النساء خوش تھے وہی آج عمار علی سب کو بہت یاد آرہے تھے۔ انہیں بھلایا ہی کب تھا۔ آج اس خوشی کے موقع پر سب کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ آنے والا نو مولود ہیمی اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

ماہین نے کئی بار چھلک آنے والے آنسو آنکھوں کی گہرائیوں میں اتارے تھے۔ وہ اپنے بچے کو گود میں لیے بغور دیکھ رہی تھی۔

''عمار آج آپ ہوتے تو کس قدر خوش ہوتے۔ اللہ کا حکم جو یہی تھا۔ اس بچے نے یتیمی کی حالت میں دنیا میں آنا تھا۔'' دل تھا کہ بار بار پھوڑا بنا جا رہا تھا۔ ماہین کی ڈیلیوری نارمل تھی۔ بے بی صحت مند تھا۔ نرسری روم میں دو گھنٹے رکھنے کے بعد بے بی ماہین کو دے دیا گیا تھا۔ ابھی نقوش دبے ہوئے تھے چہرے پر سوائلنگ کی وجہ سے۔ پرائیویٹ روم میں نرس نے بے بی امل کو پکڑایا تھا۔ امل اُسے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ آج اس بہن کو اپنے لالہ جو باپ جیسے تھے، شدت سے یاد آ رہے تھے۔ امل نے بے بی کو ماہین کی گود میں ڈال دیا تھا۔ ماں جی کی خوشی دیدنی تھی۔ فرطِ جذبات سے خود پر کنٹرول کرنے کی کوشش میں اُن کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ آج خوشی کا دن تھا۔ اُن کے عمار علی کا بیٹا اس دنیا میں آیا تھا۔ دل کٹ رہا تھا پوتے کی خوشی میں دادی نے سسکیاں بمشکل بوڑھے دل کی دیوار میں روک رکھی تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا۔ ابھی اُن کا دل پھٹ جائے گا عمار علی کا بیٹا...... بیٹا...... بیٹا۔ اسی نام کی باز گشتیں اُن کے کانوں میں واویلا برپا کر رہی تھیں۔

مہر النساء کا غم آج پھر تازہ ہو گیا تھا، اس خوشی کے موقع پر یہ کیسی خوشی تھی جس نے سب کی آنکھوں میں آنسو بھر دیے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی مسکرا رہے تھے لیکن اُن کا اندر رو رہا تھا۔ اُن کے لالہ کا بیٹا اس دنیا میں آ چکا تھا۔ آج انہیں بابا جان بھی بہت یاد آ رہے تھے۔

☆......☆......☆

صدقہ خیرات دیا گیا تھا۔ جہان آباد میں بھی منشی سے کہہ کر تمام مزارعوں کے گھروں میں اناج اور گوشت بھجوایا گیا۔ گاؤں والے نئے آنے والے چھوٹے ملک کی زندگی کے لیے دعائیں کر رہے تھے۔

فوزیہ کا روزانہ فون آتا۔ وہ خوش تھیں دوسرے نواسے کی پیدائش پر۔ وہ دور دیس میں بیٹھی اپنے بھتیجے ملک عمار علی کو یاد کر کے خوب روئیں۔ ملک عمار علی تو بچپن میں رہتے ہی اپنی فوزیہ پھوپی کے پاس تھے۔ عمار علی فوزیہ کے دل کے بہت قریب تھے۔ جبھی انہوں نے اپنی سترہ سالہ بیٹی انہیں سونپ دی تھی۔

بچے کا نام حازم علی رکھا گیا۔ حسان علی دلچسپی سے بھائی کو دیکھتا خوش ہوتا۔ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اُس کی روئی جیسے گال چھوتا۔ پھر کھل کھلا کر ہنستا۔ جب حازم گول گول آنکھیں گھماتا تو حسان علی اُسے چومتا اور پھر زور سے قہقہہ لگاتا۔ تب خاموش بیٹھی ماہین کے اندر تک خوشی بھر جاتی۔

مالک! تُو بہت بڑا رحیم ہے مجھے بہلانے کے لیے دو کھلونے عنایت کر دیے۔ وہ آنکھیں بھیگنے سے روکتی زور زور سے پلکیں جھپکتی۔

امل کا روزانہ فون آتا۔ دیر تک ماہین سے باتیں کرتی۔ وہ بار بار کہتی۔ ''ماہی تم خوش رہا کرو۔ تمہیں اب اپنے بچوں کا خاص خیال رکھنا ہے۔ تم خوش رہو گی تو لالہ کی روح بھی مطمئن رہے گی۔ کیا تم چاہتی ہو کہ وہ عالمِ بالا میں پریشان رہیں۔''

''خدا نہ کرے امل آپی۔''

''تو پھر تم خوش رہا کرو۔''

''ہاں میں خوش رہوں گی۔ اپنے اور عمار کے بچوں کے لیے۔'' ماہین کے چہرے پر آسودہ سی مسکان کھل

رہی تھی۔

☆......☆......☆

ماہین اور ماں جی کو ملک مصطفیٰ علی جہان آباد چھوڑ آئے تھے۔ آج کل اُن کی ڈیری فیکٹری میں لیبر کی بھرتی جارہی تھی۔ چند نئے شروع ہونے والے پروجیکٹ پر پیپر ورک ہورہا تھا۔ رات کو وہ دیر تک ماہین اور ماں سے بات کرتے۔ امل سے بھی وہ ضرور بات کرتے۔ ایک گھنٹہ تو مخصوص تھا اُمِ فروا سے بات کرنے کے لیے۔ دن بھر کی مصروفیات اُسے بتاتے۔ اُمِ فروا کا دن کیسے گزرا وہ بتاتی۔

ملک مصطفیٰ علی کا شدت سے دل چاہتا وہ اُمِ فروا کو دیکھیں۔ لیکن ایسا ممکن نہیں تھا ہاں وہ روزانہ اپنی ایک تصویر انہیں بھیجتی۔ اس شام وہ فون پر اُس سے کہہ رہے تھے۔

''زوجہ محترمہ کیا ہی اچھا ہو کل ویک اینڈ پر ہم کینڈل لائٹ ڈنر باہر کریں۔'' ملک مصطفیٰ علی نے بمشکل اپنی ہنسی روک رکھی تھی۔ وہ بخوبی جانتے تھے اُمِ فروا کا جواب کیا ہوگا۔

''توبہ کریں ملک جی، بے بے جی نے صرف بات کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ باہر گھومنے کی نہیں۔''

''آخر تم میری منکوحہ ہو۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے؟''

''بہت حرج ہے۔'' وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں رخصتی تو جانے کب ہو۔ فوزیہ پھوپو آئیں گی تو رخصتی ہوگی۔''

''تو پھر ملک جی آپ صبر کریں۔ اُمِ فروا کی کھنکتی ہنسی اُن کا دل ہی تو جلا گئی۔

''نہیں صبر ہوتا ناں۔'' انہوں نے منہ بسورا۔

''مجبوری ہے۔'' وہ محظوظ ہو کر بولی۔

''فرو میں تمہیں بہت مس کرتا ہوں۔ فراق کیا ہوتا ہے یہ تو کوئی مابدولت سے پوچھے۔''

''ملک جی آپ بھی ناں۔'' وہ جھینپ گئی۔ اُن کا اندازِ بیاں اس کے بدن کو گلاب کر گیا تھا۔ اس کی آنکھیں جھکتی چلی گئیں۔ لہجہ مدھم ہونے لگا۔

''فرو خاموش کیوں ہو گئی ہو؟''

''نہیں تو۔'' اُس کا لہجہ ٹوٹا۔ وہ صراحی دار گردن پر انگلیاں سرسراتی رہی۔

''اس وقت کیا کر رہی ہو تم؟''

''صحن میں بیٹھی آپ سے بات کر رہی ہوں۔''

''کیا گھر والے سو گئے؟''

''اتنی جلدی......'' وہ ہنسی۔ ''ابا جی اور اسماعیل بھائی باہر ہیں۔ بے بے جی اپنے کمرے میں ہیں اُمِ زارا کچن میں ہے۔''

''اس چاندنی رات میں اگر میں اچانک سے تمہارے سامنے آجاؤں تو؟'' وہ مسکرائی۔

''فی الحال ایسا ممکن نہیں ہے۔''

''فرو......'' وہ رُکتے ہوئے گویا ہوئے۔

''جی۔''

''ایک بات پوچھوں۔''

''ہوں۔'' شوخی بھری آواز میں نرم سا خمار عود رہا تھا۔

''سچ سچ جواب دو گی؟'' ملک مصطفیٰ علی نے تراشیدہ گھنی مونچھوں کا سرا گھمایا۔

''ملک جی میں آپ سے کبھی جھوٹ بول ہی نہیں سکتی۔''

''رئیلی!''

''جی بالکل۔'' تب اک بے ساختہ عجب نشے کے احساس سے ملک مصطفیٰ علی کی شہد آگیں آنکھیں مسکرائیں۔

''ملک جی بولیں۔'' اُم فروا نے عارض کو بار بار چھوتی لٹ کان کے پیچھے کی۔

''فرو میں تمہیں مس کر رہا ہوں مجھے دیکھنا ہے تمہیں۔ میں کسی روز اسماعیل سے ملنے آجاؤں۔''

''جی نہیں۔'' وہ کھسیانی ہو کر مسکرائی۔

''یار کیوں اتنے احکام لاگو کر رہی ہو مجھ پر۔'' وہ مسکرائی۔

''اگر آپ آ بھی گئے تو آپ کو بیٹھک میں ہی بٹھایا جائے گا۔'' وہ محظوظ ہوئی۔

''تو تم چائے لے کر آجانا۔'' وہ زور سے ہنسی اُن کی بے چارگی پر۔

''ملک جی یہ امور اُم زارا ہی انجام دے گی۔''

''مارے گئے۔ آخری اُمید بھی دم توڑ گئی۔''

''میں فون پر تمہیں بیل دوں گا تب تم دروازے تک تو آسکتی ہو ناں۔ بس تمہیں دیکھنا ہے میں نے۔'' کیسی معصومانہ خواہش تھی اُن کی۔

''ملک جی ایسا بھی ممکن نہیں ہے۔ بھلا میں گھر والوں سے چھپ کر آپ سے کیسے مل سکتی ہوں۔'' ملک مصطفیٰ علی کی بے تابی، اُن کی محبت کی خوشبو اُم فروا کے اطراف میں حصار کھینچ رہی تھی۔ اُن کی آنکھیں اس ستارہ پیرہن کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

''ظالم بیوی ہو تم۔''

''رخصتی سے پہلے مجھے دیکھنا بھول جائیں آپ۔''

''اللہ نہ کرے کہ میں تمہیں کبھی بھولوں۔'' ملک مصطفیٰ علی کی آواز میں بوجھل گھمبیرتا سمٹ آئی۔

''ملک جی آپ تو سیریس ہو گئے۔ میرا ایسا مطلب تو نہیں تھا۔''

''فروا میدیں ضرور رکھنی چاہئیں۔ امیدیں زیست کو ڈھارس دیتی ہیں۔ تم میرے دل کی مراد ہو اُمِ فروا۔''

''میں جانتی ہوں ملک جی۔'' اُس نے ملک مصطفیٰ علی کی جھنجلاہٹ دور کرنا چاہی۔

''تم بھی کبھی کچھ تو اظہار کیا کرو۔'' وہ اُم فروا سے مخاطب تھے۔ وہ اچانک سمٹ کر لجائی۔

''ملک جی میں بہت خوش ہوں۔''

''اور؟''

''اور کیا؟''

''اُمِ فروا کچھ اور بھی تو بولو۔'' وہ ہاتھ سے گال رگڑ رہے تھے۔ کرچ کرچ کی آواز وہ بھی سن رہی تھی اور

بدستور مسکراتی رہی۔ لمحہ بھر کے لیے اُم فروا کو محسوس ہوا۔ وہ روئی کے گولوں جیسے بادلوں پر کی راستہ بناتی کہکشاں کے رتھ پر سرشاری میں جھوم رہی ہے۔ اپنے مجازی خدا سے ایسے التفات پا کر وہ کیسے خوش نہ ہوتی۔ اس کے وجود کا روم روم گنگنا اٹھا۔ ملک مصطفیٰ علی اسے بہت چاہتے ہیں۔ سوچتے ہوئے مسرور ہوا تھی تھی۔ میرے مالک میں جس قدر تیرا شکرادا کروں کم ہے۔

☆......☆......☆

بلال حمید نورین کو پا کر خوش و مطمئن تھا لیکن ایک تیز دھار نوکیلی سولی تھی، جس کی انی اُس کے سینے میں چبھی ہوئی تھی۔ میں اپنی ازدواجی زندگی سے خوش ہوں۔ پھر یہ بے قراری کیسی ہے۔ اس نے تقریباً ہزار بار خود کو یقین دلایا تھا۔ میں ملک مصطفیٰ علی اور اُم فروا کے نکاح سے بہت خوش ہوں۔ لیکن اندر کی اذیت ناکی اسے کچلتی کھسوٹتی۔ تم بار بار خود سے جھوٹ بولتے ہو۔ تم اُم فروا کو نہیں بھولے ہو۔ اُس کی جدائی کا تمہیں ملال ہے۔''

درد نا کی حد سے بڑھتی تو خود کو تلاوت قرآن میں مشغول کر لیتا۔ اکثر نورین کو گھمانے لے جاتا۔ نورین اس کے ساتھ خوش تھی۔ اُس کے چہرے پر طمانیت آمیزی دکھائی دیتی۔ بلال حمید سے وہ بہت محبت کرنے لگی تھی۔ کیونکہ وہ اس کا مجازی خدا تھا۔ اُم فروا کے بحر کی جانب بڑھتی تمام کشتیاں وہ جلا دینا چاہتا تھا۔

''میں اُسے بھول جاؤں گا۔'' شاید وہ ایسا نہ کر پاتا لیکن ایسی سوچ اسے خاصی تشفی دیتی۔

☆......☆......☆

حازم علی کے عقیقے کی تیاریاں جاری تھیں۔ جس میں پوری برادری، آس پاس گاؤں کے زمیندار، ملک مصطفیٰ علی کے قریبی دوست مدعو تھے۔ ان دنوں جہان آباد میں رونقیں اُتر آئی تھیں۔ رعایا کے لوگوں کے چہروں پر خوشی دکھائی دے رہی تھی۔ دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا۔ وسیع و عریض اریج منٹ کیا گیا تھا۔ ایونٹ منتظم کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ جو اسلام آباد سے آئے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی نے دل کھول کر خرچ کیا تھا۔ انواع و اقسام کے اشتہا انگیز خوشبو والے کھانوں سے ٹیبل بھرے پڑے تھے۔ اہل، مہر النساء، ماہین سب ہی خوش تھے۔ حازم علی اور حسان علی کے لیے ایک جیسا لباس بنوایا گیا تھا۔ ماہین اپنے بیٹوں کو دیکھ دیکھ کر نہال تھی۔ مہر النساء سورتیں پڑھ پڑھ کر اپنے پوتوں کو دم کر رہی تھیں۔ اہل کا بیٹا احمد اور بیٹی مریم بہت پیارے لگ رہے تھے۔ وہ باقی بچوں کے ساتھ خوب مستیاں کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

مولوی ابراہیم بخش کی فیملی کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ مولوی صاحب اُم فروا کے پاس رُک گئے تھے۔ اسماعیل بخش بے بے جی اور اُم زارا جہان آباد آئے تھے۔ بے بے جی اُم فروا کے سسرال کی شان و شوکت مرتبہ دیکھ کر کچھ پریشان ہوئی تھیں۔ اس قدر لمبے چوڑے سلسلے ...... بے بے جی اور اُم زارا مبہوت رہ گئی تھیں۔ ایک سہمی ہوئی ماں مزید ڈر گئی تھی۔

''خداوند میری بچی کے نصیب اچھے کرنا۔ ہم گناہ گار بندوں پر اپنا خاص کرم فرمانا۔ ہماری بچی کی حفاظت فرماتے ہوئے جس درجے کی وہ مستحق ہے اُسے عطا کرنا۔'' بے بے جی دل ہی دل میں اُم فروا کے لیے دعائیں کر رہی تھیں۔ اُم زارا بھی کچھ ایسی ہی حالت سے دوچار تھی۔

(عشق کی راہداریوں میں، زندگی کی سچ بیانیوں کی چشم کشائی کرتے
اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط، انشاء اللہ آئندہ ماہ ستمبر میں ملاحظہ کیجیے)

میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ ان کی نظر بچا کر اِدھر اُدھر ہو جاؤں لیکن نثار مجھے دیکھ لیتا ہے اور زبردستی کھینچ کر اپنے پاس کھڑا کر لیتا ہے۔ کولڈ ٹی صاحب بھی میری پچھلی لغزشوں کو فراموش کر کے بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں اور دانٹا دربار کے ساتھ.....

ذخیرۂ ادب سے ایک لازوال انتخاب

کتنی چھٹی پر آئے ہو؟'' نثار نے چھوٹتے ہی بغیر کسی علیک سلیک کے پوچھا۔

''پندرہ دن کی۔'' میں نے جواب دیا۔

''بہت خوب' چلو اس بار تمہیں لاہور کی زمین دوز مال گاڑیاں دکھائیں گے۔'' نثار نے فیصلہ صادر کیا۔

''میں سیر کروں گا۔'' وہ کچھ دیر سوچ کر مشفقانہ انداز سے کہتا ہے۔ ''تم کہانیاں لکھنا۔''

یہ لائحۂ عمل ہم دونوں کے حسب منشا ہے۔

چنانچہ شام ہوتے ہی نثار مجھے مال روڈ پر ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل کے لان پر ہم کمال بے حیائی سے ایک ایسی جگہ پر جا ڈٹے، جہاں پہلے سے ایک دو ایڈیٹر' چند نامہ نگار' کچھ ریڈیو آرٹسٹ' کچھ ادیب اور چند گرگ باراں دیدہ صورت کے سیاسی حضرات براجمان تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ ایک صاحب کولڈ ٹی نوشِ جان فرما رہے ہیں۔ یہ کولڈ ٹی اس گرم چائے سے مختلف ہے جو گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور جسے معمولی ذہانت کے انسان پیا کرتے ہیں۔ یہ مشروب خاص لاہور کی ایجاد ہے اور دستور کے مطابق اس ایجاد کی ماں بھی ضرورت ہے۔ وہ ضرورت پردہ پوشی کی وجہ سے اکثر حضرات کو پوشیدہ امراض کی طرح لاحق ہو گئی ہے۔

دانشوروں کی اس محفل پر پوسٹ مارٹم کے کمرے کی فضا بڑی شدت سے چھائی ہوئی ہے۔ قوم کی لاش سامنے ٹیبل پر دھری ہے اور ہر شخص اس کا کوئی نہ کوئی عضو ہاتھ میں لیے بڑی چابک دستی کے ساتھ پوسٹ مارٹم کرنے میں منہمک ہے۔ رُوحانی' جسمانی' ایمانی اور سیاسی امراض سے لے کر خودکشی کے نفسیاتی اسباب تک بڑی تندہی سے تشخیص ہو رہی ہے۔ علاج تجویز ہوتے ہیں۔ نسخوں پر گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔ میز پر مکے پڑتے ہیں۔ کرسیاں اُلٹتے اُلٹتے بچتی ہیں لیکن اس وقت کی ساری بیماریوں کا واحد علاج صرف اس چائے دانی میں ہے جس میں کولڈ ٹی بڑی احتیاط سے محفوظ ہے۔ کولڈ ٹی والے صاحب پیالی سے منہ لگائے مزے مزے کی چسکیاں لے رہے ہیں اور اپنے اردگرد کف در دہن مسیحاؤں کے طوفان

بدتمیزی کے باوجود بڑی لاتعلقی سے داغ کی ایک عشقیہ غزل گنگنا رہے ہیں۔

"آج سینما کا پروگرام ہے؟" کولڈ ٹی صاحب نثار سے پوچھتے ہیں۔

"جی نہیں آج دوسرے پروگرام ہیں۔" نثار میری طرف اشارہ کر کے دوسرے کے لفظ پر خاصا زور دیتا ہے۔

"ہوں۔" کولڈ ٹی صاحب عینک اتار کر مجھے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے گھورتے ہیں۔ "نثار تم نے ابھی ان کی کیا تعریف کی تھی؟ کس جگہ کے میونسپل کمشنر ہیں یہ؟"

نثار قہقہہ لگا کر ان کی تصحیح کرتا ہے۔ "میونسپل کمشنر نہیں بھائی، یہ برخوردار ڈپٹی کمشنر ہے ڈپٹی کمشنر۔"

کولڈ ٹی صاحب قطعی مرعوب نہیں ہوتے۔ "ٹھیک ہے۔" وہ بڑے مربیانہ انداز سے فرماتے ہیں۔ "اس نازک زمانے میں ایک آدھ ڈپٹی کمشنر کو ہاتھ میں رکھنا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔"

پھر وہ کمال شفقت کے ساتھ میری ڈھارس بندھاتے ہیں۔ "برخوردار تم بے فکر رہو میں لاہور میں تمہاری موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا انشاء اللہ!"

"یہ بچہ لاہور کی زمین دوز مال گاڑیاں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔" نثار مؤدبانہ گزارش کرتا ہے۔ "یہ ان پر کہانیاں لکھے گا۔"

"تم کہانیاں بھی لکھتے ہو؟" کولڈ ٹی صاحب اس انداز سے پوچھتے ہیں جیسے کہانیاں لکھنا کوئی بہت بڑا اخلاقی جرم ہو۔ "کہاں لکھتے ہو؟"

میں خجالت سے منمنا کر نقوش' سویرا' ساقی' ہمایوں' ادبی دنیا' وغیرہ کے نام لیتا ہوں۔

''یہ رسالے کہاں چھپتے ہیں؟ میں نے تو نہیں دیکھے۔'' کولڈ ٹی صاحب کی نظر میں میری ادبی پوزیشن گر جاتی ہے۔ وہ اپنی عینک دوبارہ آنکھوں پر لگا لیتے ہیں اور مشفقانہ انداز میں مجھے یہ رائے دیتے ہیں کہ اگر مجھے کہانیاں لکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو شمع' ڈائریکٹر اور چنگاری میں لکھا کروں۔ کولڈ ٹی کا آخری پیالہ حلق میں انڈیل کر وہ ان رسالوں پر اپنی گراں قدر رائے کا اظہار بھی فرماتے ہیں۔

اس مختصر سی علمی و ادبی بحث کے بعد جب ہم ہوٹل سے نکل کر ایک تانگے میں سوار ہوتے ہیں تو نثار اور کولڈ ٹی صاحب کا تانگے والے سے تبادلۂ خیالات شروع ہو جاتا ہے۔ تانگے والا بڑی مشاقی سے اپنے فنونِ لطیفہ کا پرچار کرتا ہے۔

زمیندار اخبار کے عقب میں رہنے والی جو انگریزی بولتی ہے' چوبرجی والی جس کا رنگ گورا اور بال سنہری ہیں' میو گارڈن والی جو اسی سال میٹرک میں فیل ہوئی ہے' گھوڑا ہسپتال کے پاس والی جو لتا منگیشکر کی طرح گاتی ہے' ماڈل ٹاؤن والی جو ایک ہسپتال میں نرس ہے لیکن نثار اور کولڈ ٹی صاحب تانگے والے کے پراپیگنڈے سے بالکل متاثر نہیں ہوئے۔

''تم سالے' باسی کڑی کا ابال ہو۔'' کولڈ ٹی صاحب خفا ہوتے ہیں۔ ''تم سے تو مزنگ کے اڈے کے تانگے والے ہزار درجہ اچھے ہیں۔''

تانگے والا مزنگ کے اڈے والوں کو فصیح و بلیغ گالیاں دے کر ڈرامائی انداز سے اپنا تازہ ترین شاہکار برآمد کرتا ہے۔ ''لڑکی کیا ہے صاحب' نرا آلو بخارا ہے۔ ابھی کالج میں پڑھتی تھی۔ فقط دو مہینے سے اس لائن میں آئی ہے۔ اب تک صرف چار مرتبہ باہر گئی ہے۔ کالے خاں پٹھان نے پورے سات سو روپے دیے تھے۔ تمہاری خاطر اسے دو سو میں منالوں گا۔ چلوں؟''

آلو بخارا کے نام سے نثار اور کولڈ ٹی صاحب کی رال ٹپکنے لگتی ہے لیکن دو سو روپے کا ذکر سن کر ان کے جبڑے لٹک جاتے ہیں۔ وہ دونوں امید افزا نظروں سے مجھے گھورتے ہیں خاص طور پر کولڈ ٹی صاحب کے انداز بڑی شدت سے للکار رہے ہیں۔ برخوردار' دیکھو میں تمہیں اپنی خدمت کا سنہری موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم اس وقت کام نہ آ سکے تو ڈپٹی کمشنر نہیں' گھسیارے ہو لیکن میرے انداز ہیں کہ انہیں ترکی بہ ترکی جواب دیتے اور وہ مایوس ہو کر پھر اپنا جبڑا لٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس خاموش سرد جنگ کے بعد موضوعِ سخن بدل جاتا ہے۔ تانگے والا گھوڑے کو مخاطب کر کے ہمیں بڑی سنگین اور پیچ دار گالیاں سناتا ہے۔ نثار اپنے جگری دوستوں کی تعریف کرتا ہے' جو ضرورت کے وقت اس پر کئی ہزار روپیہ تک خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور کولڈ ٹی صاحب پاکستان کے جملہ افسروں کی کمینگی' نالائقی اور بددیانتی پر جی کھول کر تبصرہ فرماتے ہیں' یوں بھی رفتہ رفتہ کولڈ ٹی اپنا رنگ دکھا رہی ہے اور جب تانگے والا گھوڑے کی وساطت سے ہمیں چند الوداعی گالیاں سنا کر ہیرا منڈی میں نوگزے کی قبر کے پاس اتار دیتا ہے تو کولڈ ٹی صاحب کے پاؤں بڑی شدت سے لڑکھڑا رہے ہوتے ہیں اور وہ 'س' کو 'ش' میں بدل کر بڑی خوش سگالی سے چوک میں کھڑے ہوئے پولیس کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہیں۔ ''شو پائی جی' شلام۔ جیتے رہو۔''

سپاہی نتھنے پھیلا کر کولڈ ٹی کے منہ کو قریب سے زور لگا کر سونگھتا ہے۔ ''اچھا' آج بھی خوب

چڑھا رکھی ہے صاحب، پرمٹ کہاں ہے؟"
کولڈٹی صاحب فتح مند مرغ کی طرح چھاتی نکال کر اپنا ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھاتے ہیں غالباً وہ مجھے پرمٹ کے طور پر سپاہی کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں لیکن میں نظر بچا کر کھسک جاتا ہوں اور نوگزے کی قبر کی اوٹ میں جا چھپتا ہوں۔

مجھے غیر موجود پا کر کولڈٹی صاحب کی چھاتی کا تناؤ ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور وہ اپنی شرٹ کی جیبیں ٹٹول کر پانچ روپے کا نوٹ کانسٹیبل کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ کانسٹیبل اس پرمٹ سے مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے۔ نثار اور کولڈٹی صاحب کی گرمیٔ گفتار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے درمیان میری ذات کا مسئلہ زیرِ غور ہے۔ وہ کچھ دیر میرا انتظار کرتے ہیں اور پھر غصے سے ایک طرف چل پڑتے ہیں۔

نوگزے کی قبر کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے کیونکہ وہی پرمٹ والا سپاہی اب مشتبہ نگاہوں سے بار بار میرا جائزہ لے رہا ہے۔ میں واپس لوٹنے کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں جہاں نثار کولڈٹی صاحب اور پرمٹ والے کانسٹیبل سے میرا سامنا نہ ہو۔ اس تلاش میں، میں ہیرا منڈی کی بے شمار پیچ در پیچ گلیوں کے تانے بانے میں الجھ جاتا ہوں۔ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ گلیوں اور سڑکوں پر سرگشت کرتے ہوئے شائقین قدم قدم پر چیل کی طرح جھپٹتے ہوئے دلال، دروازوں اور دریچوں میں گڑیوں کی طرح بجی ہوئی عورتیں...... اپنے رنگ برنگ ملبوسات کے باوجود ساری مخلوق الف ننگی ہے اور ان کے جسم اور اذہان ایک ہی بے آواز سر پر بڑی ہم آہنگی کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ فضا میں کچے گوشت کی بسانداندر رچی ہوئی ہے اور بڑی پاور کے قمقموں کا اجتماعی نور گلیوں اور سڑکوں پر برص کے داغوں کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ یہ عورتیں جو دروازوں اور کھڑکیوں میں گردنیں لٹکائے بیٹھی ہیں، یکا یک جگہ سے اڑ جائیں گی اور ابابیلوں کی طرح اپنی چونچوں میں کنکریاں اٹھا کر ساری دنیا کو اپنے نرغے میں لے لیں گی لیکن عملی طور پر کنکریوں کی جگہ میری گردن پر چھپاک سے بلغم کا ایک بڑا سا غلغہ آ گرتا ہے جو ایک ادھ موئی سی عورت دریچے میں بیٹھی بڑے اطمینان سے کھنکار کھنکار کر نیچے تھوک رہی ہے۔ میں اپنی گردن کو اس غلاظت سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہوں تو خدا کی خاص رحمت میری دست گیری فرماتی ہے اور ایک گلی میں مجھے مسجد نظر پڑتی ہے جس کے ایک دروازے پر کالی سیاہی سے "یا اللہ" اور دوسرے دروازے پر "یا محمدؐ" لکھا ہوا ہے۔ یہ چھوٹی سی مسجد دو بلند و بالا عمارتوں کے درمیان بڑی بے بسی سے جکڑی کھڑی ہے۔ اندر تعفن ہے ایک طرف نالی میں بیئر کی چند خالی اور شکستہ بوتلیں اوندھی پڑی ہیں۔ وضو کے لیے ایک پرانا حمام ہے جس کا پانی لعابِ دہن کی طرح کثیف ہے۔ باسی اور بڑے زوروں سے ہمک مارتا ہے۔ نہ جانے اس مسجد کو دیکھ کر میرے دل میں ریل کے انجن کا خیال کیوں آتا ہے جو تیز رفتاری سے چلتا چلتا اچانک پٹڑی سے اتر گیا ہو۔

ہیرا منڈی سے بھٹکتا بھٹکتا آخر میں شاہی مسجد میں آ پہنچتا ہوں اور خدا کی کھلی فضا میں اطمینان سے زور زور سے سانس لینے لگتا ہوں۔ رات کے بارہ بجے بھی مسجد کے آس پاس کئی شاندار کاریں کھڑی ہیں اور ان کے ڈرائیور اِدھر اُدھر بے دلی سے بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ یہ شرفاء کی موٹریں ہیں جو اپنی

بیگمات سے اجازت لے کر شاہی مسجد میں آ، نیم شی یا اقبالؒ کے مزار پر ہدیۂ عقیدت پیش کرنے یہاں آیا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مسجد کی چکنی سیڑھیوں پر اکثر ان کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور الڑھکتے لڑھکتے سے بے اختیار ہیرا منڈی کے نہاں خانوں میں جا گرتے ہیں اگر اقبال زندہ ہوتا تو مسئلہ جبر و قدر کی ایک نئی تفسیر منظوم کر سکتا تھا۔

شاہی مسجد کے عین مقابل پرانے قلعے کی وہ ادھ مٹی ہوئی عمارت ہے جس کے صدر دروازے پر پاکستان کا جھنڈا کسلمندی سے لہرا رہا ہے۔ اقبالؒ کے مزار میں ایک چھوٹا سا بلب روشن ہے۔ بڑا بلب کچھ عرصہ ہوا چوری ہو گیا تھا۔ لاہور میں بجلی کے نئے بلب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے کیونکہ ان کی مانگ ہیرا منڈی میں بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ اقبالؒ کے مزار کو ایک چھوٹے سے بلب پر ہی قناعت شعار ہونا چاہیے۔ مزار کے دروازے پر ایک آہنی قفل لگا ہوا ہے تاکہ عقیدت مند اندر گھس کر سوئچ بورڈ نہ چرا سکیں...... باہر لان میں ہیرا منڈی کے اِکا دکا دلال بھولے بھٹکے راہیوں کے لیے خضرِ راہ کا کام دینے کے منتظر بیٹھے ہیں۔ ایک تانگے والا دو آنے میں داتا کے دربار پہنچانے کا اعلان کرتا ہے اور میں اچک کر اس میں سوار ہو جاتا ہوں۔ تانگے میں ضلع جہلم کے دو مقدمہ باز بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ دن بھر مقدموں اور کچہریوں کی زحمت کے بعد وہ گھڑی دو گھڑی دل بہلانے کے لیے ہیرا منڈی آ گئے تھے اور اب حضرت داتا گنج بخشؒ کے آستانہ پر سلام کرنے جا رہے ہیں۔

''کرتا تو سب کچھ اللہ ہی ہے۔'' ایک مقدمہ باز اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔ ''لیکن بزرگوں کا سہارا بھی بڑی چیز ہوتی ہے۔''

دوسرا مقدمہ باز بھی اس نظریے کی تائید کرتا ہے اور اس روحانی گفتگو کے بعد وہ دونوں سرگوشیوں میں ہیرا منڈی کے ذاتی تجربات پر تبادلۂ خیالات کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

جمعرات کی وجہ سے داتا صاحب کے دربار میں عورتوں، مردوں اور بچوں کا بے پناہ ہجوم ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور دربار کے صدر دروازے میں نثار اور کولڈٹی صاحب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چست کھڑے ہیں۔ ہجوم کے ہر ریلے کے ساتھ وہ خس و خاشاک کی طرح بہتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے واپس آ کر صدر دروازے کے عین بیچ اپنی جگہ سنبھال لیتے ہیں۔ میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ ان کی نظر بچا کر اِدھر اُدھر ہو جاؤں لیکن نثار مجھے دیکھ لیتا ہے اور زبردستی کھینچ کر اپنے پاس کھڑا کر لیتا ہے۔ کولڈٹی صاحب بھی میری پچھلی لغزشوں کو فراموش کر کے بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں اور داتا دربار کے ساتھ مسلمان عورتوں کی عقیدت مندی کے جملہ فوائد پر عارفانہ روشنی ڈالتے ہیں۔ اپنے پروگرام کے مطابق یہ لوگ اب یہاں سے مزنگ کے اڈے پر جائیں گے اور وہاں سے زمین دوز گاڑیوں کی دوسری منزل شروع ہو گی۔ لاہور نارتھ ویسٹرن ریلوے کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ یہاں کی زمین دوز مال گاڑیاں ہر سڑک، ہر گلی، ہر کوچے میں چلتی ہیں۔ جگہ جگہ سرخ بتیوں کے نشان ٹمٹماتے ہیں لیکن ان بتیوں کے باوجود کئی گاڑیاں کانٹا بدلتے بدلتے چوک جاتی ہیں اور اکثر تصادم کے حادثات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی تیز رفتار انجن چلتے چلتے پٹری سے اتر جائے تو اسے پھینک نہیں دیا جاتا بلکہ اس کی پیشانی پر اللہ اور رسول کا نام لکھ کر اسے مسجد کے کام پر لگا لیا جاتا ہے۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ میگزین

- رنگِ کائنات
- دوشیزہ گلستاں
- نئے لہجے، نئی آوازیں
- یہ ہوئی نا بات
- لولی وُڈ، بولی وُڈ
- نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل
- کچن کارنر
- حکیم جی!
- بیوٹی گائیڈ

اسماء اعوان

حدیث نبوی

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”جتنی سخت آزمائشیں اور معیبت ہوتی ہے۔ اتنا ہی بڑا اس کا صلہ ہوتا ہے اور خدا جب کسی گروہ سے محبت کرتا ہے تو اُن کو مزید نکھارنے کے لیے ،کندن بنانے کے لیے آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ پس جو خدا کی رضا پر راضی ہوں، خدا بھی اُن سے راضی ہو جاتا ہے۔

مرسلہ: نگہت غفار۔ کراچی

اقوال حضرت علیؓ

☆ اگر تمہیں یقین ہو جائے کہ تمہارا رزق اللہ کے پاس ہے تو پھر رزق کی تلاش نہ کرو بلکہ اللہ کو تلاش کرو جس کے پاس تمہارا رزق ہے۔

☆ جو شخص اپنی زبان کو قابو میں نہیں رکھتا وہ ندامت اٹھاتا ہے۔ زبان کی حفاظت دولت کی حفاظت سے زیادہ مشکل ہے۔

☆ کسی محتاج کو کوئی چیز عطا کرنے میں کل تک کا انتظار مت کرو۔ تمہیں کیا معلوم کل تک تمہیں یا اُسے کیا پیش آئے گا۔

☆ صبر کی تلقین کو کامیابی کی لذت اور شیرنی دور کرتی ہے۔

☆ صدقہ بلا اور عذاب ہٹانے کا ذریعہ ہے۔

مرسلہ: معصومہ رضا گلستان جوہر۔ کراچی

پریشانی

تذکرہ کرنے سے بڑھتی رہتی ہے۔ خاموش رہنے سے کم ہو جاتی ہے۔ صبر کرنے سے ختم ہو جاتی ہے اور اللہ کا شکر ادا کرنے سے خوشی میں بدل جاتی ہے۔

مرسلہ: انزاء نقوی۔ کراچی

کچھ ایسا کرتے ہیں

چلو کچھ ایسا کرتے ہیں
تمہیں ہم یاد کرتے ہیں
دل ناشاد کو کچھ اور
ہم برباد کرتے ہیں
تمہیں آواز دیتے ہیں
تمہیں واپس بلاتے ہیں
کسی دیرینہ رستے سے
تمہیں ہم ڈھونڈ لاتے ہیں
جو اب تک کہہ نہ پائے
وہ سب کچھ آج کہتے ہیں
وہ سب ترتیب دیتے ہیں
شروع سے ہم بتاتے ہیں

شاعرہ: فاطمہ نجیب۔ پسند: ثانیہ مسعود۔ کراچی

مشورہ

ایک مرغا دیوار پر بیٹھا اپنے مالک کو دیکھ رہا تھا۔ جو بہت بیمار تھا۔ مالک کی بیوی اُس کے پاس آئی اور بولی۔ ”آپ کو بہت تیز بخار ہے۔ میں آپ کے لیے چکن سوپ بناتی ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے مرغے کی جانب دیکھا تو مرغا گھبرا کر بولا۔ اِک واری

Panadol دے کر دیکھ لو۔

مرسلہ: شعبان کھوسہ

غور سے پڑھیں

☆ چھوٹے غم واویلا کرتے ہیں۔ بڑے غم ہمیشہ خاموش رہتے ہیں۔

☆ چھت کے کونے پر رہنا جھگڑالو عورت کے ساتھ مشترکہ گھر میں رہنے سے ہے۔

☆ خاموشی تمام برائیوں اور خامیوں کو چھپا دیتی ہے۔

☆ لوگوں کو تکلیف نہ دینے سے دشمنوں کے دل بھی صاف ہوجاتے ہیں۔

☆ مجھے بارش میں چلنا بہت پسند ہے تاکہ کوئی میرے آنسو نہ دیکھ لے۔

☆ کوئی آئینہ انسان کی اتنی حقیقی تصویر پیش نہیں کرسکتا جتنی اُس کی گفتگو۔

مرسلہ: ماہین خاور۔ سیالکوٹ

واہ رے مرد

ایک مرد ہی دوسرے مرد کی نیچر سمجھ سکتا ہے۔

غور فرمائیے

گاہک: مجھے ایک لیڈیز سوٹ چاہیے۔

دکان دار: بیگم کے لیے چاہیے یا کوئی اچھا سا دکھاؤں۔

مرسلہ: شاہانہ احمد۔ کراچی

ترکِ تعلق

جا تجھ کو بھی اپنی چاہ سے آزاد کر دیا
تُو بھی کتاب زیست کا عنوان نہیں رہا
لو مل گئی نجات مقدر سنور گئے
اب دل میں تیرے پیار کا ارماں نہیں رہا
خاموشیوں کا راج ہے دل سے نگاہ تک
اب تیرے لوٹ آنے کا امکاں نہیں رہا

من کا نگر اُجاڑ بیابان ہوگیا
دل تُو نہیں رہا تُو میری جاں نہیں رہا

انتخاب: یاسمین رضا۔ ڈیفنس کراچی

چمکتے موتی

1) اللہ سے ڈرنے والا شخص سب سے پہلے اِس کے بندوں کے معاملے میں محتاط رہتا ہے۔

2) دعا دستک کی طرح ہے اور مسلسل دستک سے دروازہ کھل ہی جاتا ہے۔

3) غصہ کرنے کا مطلب ہے کہ ہم دوسروں کی غلطیوں کا انتقام اپنے آپ سے لے رہے ہیں۔

4) دوست ہزار بھی کم ہیں دشمن ایک بھی زیادہ ہے۔

5) دنیا میں سب سے بڑا گناہ لوگوں کو اذیت اور تکلیف دینا ہے۔

مرسلہ: سعدیہ عابد۔ کراچی

وہ ہمارا ہے اس طرح

قرب کے نہ وفا کے ہوتے ہیں
سارے جھگڑے انا کے ہوتے ہیں
بات نیت کی ہے صرف ورنہ
وقت سارے دعا کے ہوتے ہیں
وہ جو بظاہر کچھ نہیں لگتے
ان سے رشتے بلا کے ہوتے ہیں
وہ ہمارا ہے اس طرح سے فیضؔ
جیسے بندے خدا کے ہوتے ہیں

شاعر: فیض احمد فیض۔ پسند: رضوانہ کوثر۔ لاہور

ترکیب

شک کرنے والی بیوی نے اپنے میاں کو میکے سے کال کر کے پوچھا۔ وہ کہاں ہے۔ میاں نے جواب دیا کہ وہ گھر پر ہے۔ بیوی بولی ثبوت کے طور پر میرا جوسر چلا کر سناؤ۔ شوہر نے جوسر کی گھرڑ گھرڑ چلا

کرسنا دی۔ اس بار بیوی گھر پر سرپرائز دینے اچانک آ گئی۔ اور دیکھا کہ بیٹا اکیلا ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''ڈیڈی کدھر ہیں؟ بیٹے نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں کچھ دنوں سے جو سر ساتھ لے کر گھوم رہے ہیں۔

مرسلہ: ریحانہ مجاہد۔ گلستان جوہر، کراچی

پردیسی ساجن کے نام

اب کے ساجن جب تم آنا
میرے لیے چند تحفے لانا
جوتوں، کپڑوں، پرفیوم کے علاوہ
میک اپ کی اک کٹ بھی لانا
اب کے ساجن جب تم آنا
چھوٹی سی فرمائش ہے بس اک
تھوڑے سے کچھ ڈالر بھی
ایک بڑے سے بیگ میں بھر کر لانا
اب کے ساجن جب تم آنا
دیکھو کچھ بھی بھول نہ جانا

شاعرہ: یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ لاہور

تخت اور تاج

تیمور لنگ اور بجازت میں جنگ ہوئی۔ بجازت بے چارے کی ایک آنکھ تھی۔ وہ جنگ میں شکست کھا گیا۔ اور گرفتار کر کے تیمور کے سامنے لایا گیا۔

تیمور اُسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ تو درباریوں نے ڈرتے ڈرتے اس کی وجہ اس سے پوچھی۔ تیمور نے کہا۔ ''میں اس لیے ہنس رہا ہوں کہ خدا کی نظر میں یہ تخت وتاج اتنی معمولی چیز ہے کہ اس نے کانے سے چھین کر لنگڑے کے حوالے کر دی۔''

مرسلہ: افشں رضا۔ اسلام آباد

گھریلو ٹوٹکے (آزمودہ)

1) تھکی ہوئی آنکھیں میک اپ کے باوجود صاف نظر آ ئیں۔ رات سونے سے پہلے تازہ عرق گلاب کے چند قطرے آنکھوں میں ڈال لینے سے آنکھوں کا میلا پن اور تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔

2) ناخنوں کو لمبا کرنے کے لیے انہیں پسے ہوئے لہسن میں روز کچھ دیر کے لیے ڈبو کر رکھیں اس سے ناخن لمبے اور بے حد چمکدار ہو جاتے ہیں۔ بعد میں بیسن سے ہاتھ دھونے سے لہسن کی بو ختم ہو جاتی ہے۔

3) جن خواتین کی رنگت دھوپ میں نکلنے سے سانولی ہو رہی ہے۔ وہ صبح کے وقت آدھا لیموں نیم گرم پانی میں نچوڑ کر پی لیں اور باقی آدھا لیموں بالائی میں نچوڑ کر رات کو سوتے وقت چہرے پر ملیں۔ رنگت نکھر جائے گی۔

مرسلہ: مسز نوید ہاشمی۔ کراچی

انا پرست

تُو جو بدلا بدل گئے ہم بھی
پیار کرتے تھے بندگی تو نہیں
وقت سمٹ جائے گا بہر صورت
تُو کوئی شرط زندگی تو نہیں

پسند: رقیہ یوسف۔ ڈسکہ

اصلاح

ایک چھوٹی سی بچی نے اپنی ٹیچر کو بتایا رات کو میں اپنے ڈیڈی کے ساتھ سویا تھا۔ ٹیچر نے جملے کی اصلاح کو درست کرتے ہوئے فقرے کو درست کر کے دہرایا۔ ''رات کو میں ڈیڈی کے ساتھ سوئی تھی۔ بچی یہ فقرہ سن کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ یہ اُس وقت ہوا ہو گا جب میں سو چکا تھا۔

مرسلہ: احسن رضا۔ اسلام آباد

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی روشن باتیں

☆ ہم میں سے وہی زندہ رہے گا۔ جو دلوں میں زندہ رہے گا اور دلوں میں وہی زندہ رہے گا جو خیر بانٹے گا، محبتیں بانٹے گا اور آسانیاں پیدا کرے گا۔ (اشفاق احمد)

☆ خوف دراصل خواہش سے جنم لینے والی

کیفیت ہے۔ جو لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں خوفزدہ رہتے ہیں۔ (بانو قدسیہ)

مرسلہ: عائشہ عثمان۔ کراچی

بہادری

ایک عورت ڈینٹل سرجن کے کمرے میں داخل ہوئی اور عجلت میں بولی۔ میں بہت جلدی میں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب آپ کو ایک دانت فوراً نکالنا ہے۔ براہ کرم اپنی فیس بتادیں۔ ڈاکٹر نے فیس بتائی جو بہت زیادہ تھی۔ عورت کے اعتراض پر ڈاکٹر نے وضاحت کی۔ ''اس میں میری فیس کے علاوہ جلد کو سن کرنے والی ادویات کی قیمت بھی شامل ہے۔ عورت نے کہا آپ ادویات کو چھوڑیں اور صرف دانت نکالنے کی فیس لیں۔''

ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔''میں نے آپ جیسی بہادر عورت کبھی نہیں دیکھی جو بغیر سُن کیے دانت نکلوا رہی ہے۔''

''دانت میرا نہیں میرے شوہر کا نکالنا ہے۔ وہ باہر بیٹھا ہے۔'' عورت نے جواب دیا۔

مرسلہ: معاویہ عنبر وٹو۔ ساہیوال

محبت

محبت دل میں اتر کر
اپنا بنا لیتی ہے
محبت خوشبو ہے
من کو مہکا دیتی ہے
محبت بکھرنے نہیں دیتی
سمیٹ لیتی ہے
محبت دل کے ریگستان میں
بارش بن کر برستی ہے
محبت امر ہے، زندگی
ہمیشہ زندہ رہتی ہے
محبت وہ جذبہ ہے
رب سے ملا دیتی ہے
محبت عام کریں آؤ ممتاز
یہ دل جیت لیتی ہے
نفرتیں مٹا دیتی ہے

شاعر: ممتاز احمد۔ سرگودھا

ذلت

ایک آدمی نے ارسطو سے کہا۔ ''علم کی مشقت برداشت کرنے کی مجھ میں تاب و طاقت نہیں۔'' ارسطو نے جواب دیا۔ پھر ساری زندگی ذلت برداشت کرتے رہو۔

مرسلہ: زوبیہ اکرم۔ کراچی

سکون

ڈاکٹر: آپ کے شوہر کو شدید ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔ یہ نیند کی گولیاں لے لیں۔''

عورت: ''ڈاکٹر صاحب میں یہ انہیں کس وقت دوں؟''

ڈاکٹر: یہ آپ نے کھانی ہیں۔''

مرسلہ: نورالعین۔ اسلام آباد

تم......

پھول بن کر مہک رہی ہو تم
کتنے رنگوں میں ڈھل گئی ہو تم
کھل رہے ہیں یہاں کنول کے پھول
آبشاروں سا ہنس رہی ہو تم
میرے حصے میں، اب رہا نہیں میں
میرے حصے میں آگئی ہو تم
میں تمہیں بھول ہی نہیں سکتا
اور یہی بات بھولتی ہو تم
میری دنیا میں اُڑ کے آئی ہو
شاہزادی، کوئی پری ہو تم

شاعر: کامی شاہ۔ پسند: صبوحی کاظمی۔ کراچی

☆☆......☆☆

نئے لہجے، نئی آوازیں

فرق

تمہاری بات لمبی ہے
مثالیں ہیں، دلیلیں ہیں
ہماری بات چھوٹی ہے
ہمیں تم سے محبت ہے

شاعرہ: راحت وفا راجپوت۔ لاہور

سیلاب

جب بادل برستا ہے
دل میرا اڑتا ہے
ٹپ ٹپ گرتی بوندیں
جمع ہو کر
سیلاب نہ بن جائیں
سب کچھ بہا کر
نایاب نہ بن جائیں

شاعر: ریاض حسین تبسم چوہان۔ فیصل آباد

پیاسنگ

جن کے سپنے دیکھے تھے
من میں خواب جاگے تھے
اک الھڑ، معصوم کے خواب
ہونے چلے سب پورے تھے
گوری چلی تھی آج پیا نگر
آنکھوں میں خواب ہلکورے تھے
ہاتھوں میں مہندی، آنکھوں میں کجرا، گال لال گلال
لب جیسے پنکھڑی گلاب
ماتھے پہ ٹیکا، پاؤں میں پائل، گلے میں موتی ہار
سر پر ڈالے گھونگھٹ، سرتاپا خوشبو میں بسی
پھوٹ رہی تھی، اُن چھوٹے بدن کی خوشبو
بڑھ رہے تھے رات کے سائے
من میں اندیشے تھے ہزار
ایک طرف تھا چھٹا بابل کا انگنا
دوسری طرف تھا، پیا کا ساتھ

شاعرہ: ثمینہ عرفان۔ کراچی

غزل

دکھ کے دریا سے گزرتے ہوئے اکثر دیکھا
درد و غم پلتے ہوئے روح کے اندر دیکھا
تھی فضا زرد سی بوجھل سی اُداسی ہر سُو
دل کی ویرانی پہ روتے ہوئے اکثر دیکھا
نہ کوئی فکرِ تردد نہ کوئی اُن کو ملال
حالِ دل جب بھی کبھی اُن کو سنا کر دیکھا
ضرب کاری تھی بڑی روح بھی تڑپی تھی میری
جو مسیحا تھا اُسی نے نہیں آ کر دیکھا
یہ میرا زخم کبھی بھی نہ بھرے گا انزاء
اِس جہاں سے یہی انعام بھی پا کر دیکھا

شاعرہ: انزاء نقوی۔ کراچی

تحفہ

یاد رکھو گے ایسا تحفہ بھیجوں گی
اپنی آنکھ کا بہتا دریا بھیجوں گی
میری آنکھ سے عشق سمندر بہتا ہے
پاس رہو گے پھر بھی پیاسا بھیجوں گی
دامن میں خیرات سنبھالے رکھنا تم
میں تم کو اس بار بھی کاسہ بھیجوں گی
خط میں آنسو کچھ تصویریں میری ہیں
بھیگا چہرہ بھیگی آنکھیں بھیجوں گی

فری جی کیسے پیار ہوا اک لڑکے سے
چاہت سے بھرپور خلاصہ بھیجوں گی
شاعرہ: فریدہ جاوید فری۔ لاہور

بس تیرا خیال ہے

یادوں کی لہروں پہ ہچکولے کھاتا ہے تیرا خیال
ڈوبتے ڈوبتے میں بھی ساحل پر اتر آتی ہوں
اتنی مشکل سے ارادوں کے پُل باندھے تھے دل نے
سوچتے سوچتے میں پھر سے بکھر جاتی ہوں
میرے گھر کے راستے بڑے ہی پتھریلے ہیں
تیرے پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں ڈر جاتی ہوں
جب بھی دیکھا ہے تجھے میں نے کسی اور کے ساتھ
تجھ سے بچھڑ نہ جاؤں یہ سوچ کے مر جاتی ہوں
شاعرہ: صائمہ بشیر۔ سرگودھا

تیری یاد

کل رات جو تیری یاد آتی رہی مجھے
کتنا تڑپاتی رہی تیری یاد مجھے
کبھی سوچا نہ تھا اتنا ستائے گی
اتنا رلائے گی، تڑپائے گی تیری یاد مجھے
بے قراری میں بہت ہی ڈھونڈا تجھے
تجھ سے ملنے کو دل بے چین رہا مگر
مجبور کر دیا اس زمانے نے مجھے
کسی اور نے جو اپنانا چاہا مجھے
کسی اور کا ہونے نہ دیا تیری یاد نے مجھے
شاعرہ: ماریہ ناز۔ چیچہ وطنی

تیرے ہم......

خوابوں کی دنیا میں اب تو رہنے لگے ہیں ہم
محبت زندگی ہے خود سے کہنے لگے ہیں ہم
کرتے ہیں تم سے بے لوث محبت
خود کو تیرا دیوانہ کہنے لگے ہیں ہم
ہم نے بنا دیا ہے خود کو غلام تیری یادوں کا
تیری یاد میں پل پل اب تو جینے لگے ہیں ہم
کیا خطا ہو گئی ہم سے کچھ بتائیے تو صاحب
کیوں خود کو گناہ گار تیرا لگنے لگے ہیں ہم
کاش تمہیں بھی ہو جائے میری اس محبت کا احساس
چپکے چپکے تجھے اپنے خدا سے مانگنے لگے ہیں ہم
شاعرہ: عاصمہ کوثر، چیچہ وطنی

پیاری بیٹی

دنیا میں رحمت بن کر آتی ہے بیٹی
اللہ کا سلام لاتی ہے بیٹی!
کھلکھلاتی ہوئی، روتی ہوئی، مسکراتی ہوئی
نا جانے کب بڑی ہو جاتی ہے بیٹی
اُداس سے لمحوں کو مسرتوں میں بدل کر
دلہن بن کر رخصت ہو جاتی ہے بیٹی!
یادیں اُس کی بچپن کی، شرارتیں کرنا اُس کا
ماں کی گود سے باپ کے سینے میں چھپ جاتی ہے بیٹی
ہمت سی بھر دیتی ہے نیم مرگ دل کو نسیم
زندگی کو جینے کا حوصلہ دیتی ہے بیٹی
شاعرہ: شبانہ نسیم۔ کراچی

اے ری سکھی!

آنگن میں مورے
لگا ہے اک پیپل
اس کے کوڑے کو اٹھا ڈری سکھی
آگ لگا ڈری سکھی
آنگن میں مورے
پیا کو لا ڈری سکھی
اک برہن کی پیاس بجھا ڈری سکھی
آ ڈری سکھی!
آ ڈری سکھی!

شاعر: علی حسنین تابش۔ چشتیاں

سوال آپ کے......
جواب زین العابدین کے!!

اِس ماہ سوہا علی۔ ملتان سوال انعام کا حق دار ٹھہرا۔ انہیں اعزازی طور پر دوشیزہ گفٹ ہیمپر روانہ کیا جارہا ہے (ادارہ)

ماہ رُخ بشیر۔ کراچی

☺: بھیا! ہمارے سیاستدانوں کو جھوٹی قسمیں کھانے سے کیسے روکا جاسکتا ہے؟

✎: بہت مشکل ہے انہیں قدرتی طور پر کھانے کی عادت پڑ چکی ہے۔

شاہین خان۔ ملتان

☺: زین بھائی! میں جب بھی ان سے ملتی تھی وہ میرے حسن کے قصیدے پڑھتے نہ تھکتے تھے مگر جانے کیوں کل انہوں نے مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا؟ بتایئے کیا کروں؟

✎: پیاری بہن! آئندہ کبھی بھی اُن سے ملنے سے پہلے بیوٹی پارلر جانا نا بھولیے گا۔

ماریہ خان۔ چیچہ وطنی

☺: زین بھائی! فلم اسٹار صائمہ ٹی وی پر مستقل کیوں آ گئی ہیں؟

✎: ارے بھئی! فلم کے ہیروز تو ان کا بوجھ اٹھا اٹھا کر تھک کر بھاگ گئے ہیں اور اب وہ مستقل ٹی وی کے ہیروز کا زورِ بازو آزمارہی ہیں۔ اللہ نہ کرے ٹی وی کے ہیروز بھی......

عامرہ حسین۔ شہدادکوٹ

☺: زین جی! میں ہمیشہ کوشش کرتی ہوں مگر مجھے عید کا چاند نظر نہیں آتا۔ کوئی ترکیب بتائیں میں اگلی بار ہی سہی، عید کا چاند دیکھ لوں؟

✎: اچھی بہنا فوراً رویتِ ہلال کمیٹی سے رجوع کریں کیونکہ وہ جب چاہیں، جہاں چاہیں چاند دیکھ لیتے ہیں۔

مہک رعنا۔ ٹنڈو آدم

☺: بھیا جی! برستے ساون اور گرجتے ساجن میں کیا فرق ہے؟

✎: ارے......ارے خیر تو ہے، اس موسم میں بڑی مستیاں سوجھ رہی ہیں۔ سکون سے نہیں بیٹھ سکتیں۔

عمیر شبیر۔ کراچی

☺: زین بھائی! جلدی سے بتائیں کہ آخر یہ وفا کہاں غائب ہے؟

✎: بھاگ گئی وہ بھی بیچاری۔

یاسمین عمران۔ کوپرا سیالکوٹ

☺: زین جی برکھا برسے، من مورا ترسے؟

ﷺ: اب اس پر ہم کیا کہیں کہ آپ کا منوا کہیں اور جا کے برسے۔

عاصمہ کوثر۔ چیچہ وطنی

☺: ساون ہوا اور ساجن کی کمی محسوس ہو تو کیا کریں؟

ﷺ: یہ چار چار روپے والے موبائل پیکج کس دن کام آئیں گے رَج کے باتیں کریں۔

شبانہ زمان۔ کراچی

☺: زین بھیا! مجھے اک پل چین نہ آئے؟

ﷺ: ظاہری بات ہے! موسم گرم، بجلی غائب، پانی غائب، بے

ﷺ: ہا..... حق! اجی اس کا کوئی علاج نہیں۔

نبیل جاوید۔ لودھراں

☺: بھیا زین! یہ دوستی کیسا ناتا ہے؟

ﷺ: بھائی جی! دوستی ایسا ناتا..... جس سے لگ جائیں تحائف کے ڈھیر۔

اشعر عتیق۔ کراچی

☺: زین بھائی! جلدی سے بتائیں۔ میری مٹھی میں بند ہے کیا؟

ﷺ: ہاتھی۔

چاری نیند کہاں سے آئے کہ آپ کو چین مل جائے۔

ثریا پری۔ جہلم

☺: بھیا! مرد کاٹھ کا اُلو کب بنتا ہے؟

ﷺ: کان قریب لاؤ..... شادی کے ابتدائی دنوں میں۔

شمیم ربانی۔ کراچی

☺: زین جی! نند کے کاٹے کا کوئی علاج تو بتائیں؟

ایم یعقوب۔ ڈیرہ غازی خان

☺: زین صاحب! وہ مجھے دیکھ کر ایسا فرمائے؟

ﷺ: جیسے ہے وہ کوئی گائے۔

راشدہ اعجاز۔ کراچی

☺: بھیا مسکراہٹ کی قیمت لگائی جائے تو کیا ہوگی بھلا؟

سونے کا تازہ ترین بھاؤ دیکھ لو! بہنا۔

ایم وکیل عامر جٹ۔ساہیوال

زین بھیا! جب اپنے ہاتھ کے پکے کھانے کا مزہ نہ آئے تو کیا کریں؟

پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ فوراً کسی دوسرے کے ہاتھ کا پکا کھانا شروع کردیں۔

صائمہ واصف۔کراچی

زین جی! میگھا برسے تو کون یاد آئے؟

وہی جو ہمیشہ دل دھڑکائے۔

پارس جونیجو۔حیدرآباد

بھیا! اگر برسات میں ''کسی'' کو بارش سے الرجی ہونے کا خدشہ ہو تو کیا کیا جائے؟

''کسی کو'' فوراً اسٹور میں بند کردیں اور آپ موسم کا لطف اٹھائیں۔

نائلہ غضنفر۔جہلم

بھیا جی! برستی بارش میں کون سے پکوان کھانے چاہئیں؟

وہ پکوان جو ہمسائے ٹرے بھر کے بھیجیں۔

سوہا علی۔ملتان

بھیا مینڈکی کوز کام کب ہوتا ہے؟

جب اس کے مینڈک کو ہوتا ہے۔

شمائلہ اختر۔لاہور

بھیا جی! جب بھی بارش برستی ہے میری ساس، نندیں ہمارے گھر کے چکر کیوں بار بار لگانے لگتی ہیں؟

ارے..... آپ پکوڑے بہت مزے کے بناتی ہیں۔ اس لیے وہ بار بار چکر لگاتی ہیں۔

صفیہ رضوان۔اسلام آباد

بھیا! کیا یہ سچ ہے کہ عورت ہی کی آنکھ سے ساون برستا ہے؟

نہیں جی! سچ تو یہ ہے کہ یہ کام آج کل بیچارے مرد بھی بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

نگہت منیر۔اوکاڑہ

بھیا جی! یہ سانجھے کی ہانڈی چوراہے پر ہی کیوں پھوٹتی ہے؟

تاکہ دوسرے بھی اس ہانڈی کی تپش محسوس کرکے سبق سیکھیں۔

مصباح رمضان۔لاہور

بھائی جی! میں چاند کا فیشل کیسے کروں؟

اسٹیم سے اور کس سے۔

کرن شہزادی۔راولپنڈی

زین بھائی! ان کی پسندیدہ ڈش کون سی ہے؟

وہی جو اُن کی اماں بنادیں۔

☆☆......☆☆

"یہ ہوئی نا بات"

کوپن برائے ستمبر 2015ء	
	______
	______
نام:	______
پتا:	______

کراچی میں ایک دن

''اے......کیا بولتا ہے نی۔'' وہ میری ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر بولا۔ مرد کا بچہ بنو۔ نی۔ زبان سے مت پھرو۔ نی۔ نہیں تو لفڑا ہو جائے گا۔ صدر میں گھومتا ہے۔ جیب میں ساٹھ روپے ہے۔ نی۔ اب یہ جوڑا تم کو خریدنا پڑے گا۔ ہماری بوٹی کا سوال......

کراچی میں ایک جان کاہ دن کی روداد، بشیر احمد بھٹی کے شریر قلم سے

یہ کافی پرانی بات ہے۔ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ کراچی گیا تھا۔ عبدالصمد قادری صاحب کے ہم مہمان تھے۔ قادری صاحب کراچی کے علاقے کورنگی نمبر 4 میں رہتے تھے۔ مذہبی انسان تھے محنت کش تھے۔ دارالعلوم میں ان کی الیکٹرانکس کی جاب ہے۔ ہم چند روز کے لیے ان کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس لیے قادری صاحب ہمیں روزانہ کسی نئے علاقے کی سیر کراتے ہم خوب گھومتے پھرتے۔

کراچی روشنیوں کا شہر ہے۔ ہر پاکستانی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ زندگی میں ایک بار یہ بڑا شہر ضرور دیکھے۔ ہماری بھی یہی خواہش ہمیں کراچی لے گئی۔

ایک روز ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تھے تو قادری صاحب نے مژدہ سنایا کہ آج ہم صدر چلیں گے۔ ہم بخوشی تیار ہو گئے۔ ہم کلو کے ہوٹل پر آ گئے۔ کلو میاں کے ہوٹل کی چائے سے خوب محظوظ ہوئے۔ بڑی عمدہ چائے تھی۔ اس چائے سے ناشتے کی تھراپی ہوئی۔ دو سڑکیں وہاں سے مین روڈ کی طرف جا رہی تھیں۔ ہمیں روڈ سے صدر جانے والی وین میں بیٹھنا تھا۔ اس لیے ہم پیدل ہی ڈبل روڈ کی طرف آ گئے۔ قادری صاحب تھے' میں تھا' صدیق قریشی تھا اور سراج الدین تھا' جو قادری صاحب کا کزن ہے۔ ہم کل چار افراد تھے۔ خوش گپیاں کرتے ہوئے ہم ڈبل روڈ پر جا پہنچے۔ اس لیے وہی جانتے تھے کہ ہم نے کس نمبر کی وین میں سوار ہونا ہے۔

ایک ویگن آئی اور گزر گئی۔ دوسری آئی وہ بھی گزر گئی۔ ہم بے چین تھے کہ فوراً صدر اڑ کر پہنچ جائیں اور خوب سیر کریں۔ صدر کی بڑی تعریف سنی تھی کہ قابلِ دید ہے۔ ویگنیں آ رہی تھیں اور جا رہی تھیں۔ قادری صاحب ان میں سوار ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ بس اپنی جگہ کھڑے مسکرائے جا رہے تھے۔ آخر میں نے پوچھ لیا۔

''قادری صاحب سوار بے چین ہیں۔ سواریاں گزر رہی ہیں، آخر ہم کب تک یہاں کھڑے رہیں گے۔''

وہ مسکرا کر بولے۔ ''جب تک صدر جانے والی ویگن نہیں آجاتی۔ جب آئے گی تو سوار ہو جائیں گے۔ میں نمبر دیکھ کر بتادوں گا۔ میں چاہتا ہوں کوئی آرام دہ ویگن آجائے۔ یہ نہ ہو کہ تم تکلیف محسوس کرو۔''

انہوں نے ہمیں نمبر بتا دیا کہ ویگن کے فرنٹ پر ڈرائیور کے قریب پڑی تختی پر نمبر موجود ہیں۔ ابھی تک ہماری مطلوبہ نمبر والی ویگن نہیں آئی۔

اور پھر کچھ دیر بعد انہوں نے اعلان کر دیا کہ صدر جانے والی ویگن آ رہی ہے۔ انہوں نے آنے والی وین کا نمبر دیکھ لیا تھا وہ کچھ پریشان سے تھے۔ ہم پریشانی کی وجہ سمجھ نہ سکے۔ ویگن ہمارے قریب آکر رکی تو انہوں نے ویگن پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور بولے۔ ''سفر ذرا تکلیف دہ ہے، خیر سوار ہو جاؤ۔''

اترنے والے مسافر اتر چکے تھے۔ تمام سیٹوں پر لوگ براجمان تھے۔ اندر جگہ تنگ تھی۔ چھت بہت نیچی تھی۔ اندر کچھ مسافر سر جھکائے رکوع کی حالت میں کھڑے ہوئے تھے۔ میں' صدیق قریشی اور سراج الدین بھی اندر داخل ہوتے ہی مرغا بن گئے۔

قادری صاحب باریش آدمی تھے۔ وہ جونہی اندر داخل ہوئے ایک مسافر نے اٹھ کر احتراماً ان کو سیٹ دے دی۔ وہ بیٹھ گئے۔ ویگن چل پڑی۔ مسافر مرغے بنے ہوئے تھے مجبوری تھی۔ مرتے کیا نہ کرتے۔ سفر تو کرنا تھا۔ چنانچہ ہم تینوں بھی مرغے بن گئے۔ حالت کچھ یوں تھی جیسے ہم کبڑے انسان ہوں۔ قادری صاحب کی پیش گوئی میں تجربے کی رمق تھی۔ وہ کسی کشادہ ویگن میں ہمیں سوار کرانا چاہتے تھے۔ مگر ہماری جلد بازی پر انہوں نے کہہ دیا تھا کہ سفر تکلیف دہ ہوگا۔ ابھی تمہاری ضد تمہیں مرغا بنا کر چھوڑے گی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اب ہم مرغے بنے ہوئے تھے۔ کمی تھی تو صرف بانگ کی جو مرغے دیتے ہیں۔ ککڑوں کوں......''

مجھے اگر علم ہوتا کہ کورنگی صدر سے کافی دور ہے تو میں کشادہ ویگن کے انتظار کو عجلت پر ترجیح دیتا۔ میرا رخ اس طرف کو تھا جدھر وین جا رہی تھی۔ میرے مقابل ایک مسافر بھی مرغا بنا ہوا تھا اور میرا سر اس کی طرف تھا۔ اس کے منہ میں پان تھا۔ وہ مسلسل اپنے جبڑوں کو حرکت دے کر جگالی کر رہا تھا(۔تھوکنے کی جگہ نہ تھی اس لیے سرخ پان کا لعاب دہن وہ معدے کی نظر کر رہا تھا۔ ایک جگہ پر اچانک ڈرائیور نے زور دار بریک لگائی تو اس کبڑے مرغ بسمل کا سر زور سے میرے سر سے ٹکرایا۔ زور دار ٹکر لگی تو میری آنکھوں کی قندیلوں کے شرارے پھوٹ گئے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں غصہ پی گیا۔ اس میں اس مرغے کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ میں اگر زبان چلاتا تو بات بڑھ جاتی لڑائی جھگڑے کا امکان تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ اب سفر ہوشیاری سے کروں گا۔ یہ نہ ہو پھر ٹکر لگ جائے۔

کچھ دیر بعد میرا سارا دم خم ہو گیا۔ مرغا بنے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی گردن درد کرنے لگی تھی۔ کمر میں اینٹھن ہونے لگی اور ٹانگیں لرزنے لگیں۔ میں نے مفت کے اس رکوع سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ٹھان لی جب نماز میں بندہ رکوع کرتا ہے تو پڑھتا ہے' سبحان ربی العظیم' عبادت بھی ہو جاتی ہے اور ثواب بھی ملتا ہے۔ اس منی ویگن نے ہمیں مفت کا مرغا بنا دیا تھا۔ اس مفت

کے رکوع میں نہ عبادت شامل تھی اور نہ ہی ثواب ملنا تھا۔ جب بدن جواب دے گیا تو میں سیٹوں کے درمیان فرش پر اس طرح بیٹھ گیا جس طرح لاچار مجبور بھکاری بیٹھے ہوتے ہیں۔ دائیں بائیں سیٹوں پر بیٹھے ہوئے مسافر مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔

خدا خدا کر کے ہم صدر پہنچے۔ صدر تو ہمارے تصور سے بھی زیادہ خوبصورت نکلا۔ خوب گھومے پھرے۔ ویسے تو سارا کراچی خوبصورت ہے۔ کراچی کے کئی خوبصورت علاقے ہم نے نہیں دیکھے تھے۔ اس لیے ہمیں صدر بہت پیارا لگا۔ صدر میں غدر ہوگا یہ میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ہم نے خوب سیر کی۔ صدر کو اس طرح دیکھا جیسے دیہاتی شہر میں آ کر بتیاں دیکھتے ہیں۔ قادری نے حسبِ ضرورت شاپنگ کی۔ پھر ہم صدر سے نکلے اور لب سڑک فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس طرف بڑھے جہاں سے واپسی کی ویگن ملنے کے امکانات تھے۔ فٹ پاتھ پر انسانی ہجوم تھا۔ چلتے چلتے ایک جگہ میری نگاہ نیچے گئی تو فٹ پاتھ پر مجھے بالکل ایک نئی نکور چمکیلی چونی پڑی نظر آئی۔ رش کی وجہ سے چونی کسی کو نظر نہ آئی تھی۔ اتفاقاً میری نظر پڑ گئی۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے انسانی قدموں تلے چونی کی تذلیل ہو رہی ہو۔ بڑا نوٹ نیچے پڑا ہو تو لوگ فوراً اٹھا لیتے ہیں چونی بیچاری کو کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔ میں نے سوچا اسے میں اٹھا لوں۔ تا کہ اس بیچاری کو احساسِ کمتری سے چھٹکارا ملے۔ میں چونی اٹھانے کے لیے نیچے جھکا۔ ابھی میں نے چونی اٹھائی ہی تھی۔ سیدھا نہیں ہوا تھا کہ عین اسی لمحے میری گردن میں شکنجہ پڑ گیا۔ میں بوکھلا یا قریب ہی پان کی دکان تھی۔ اس کے سامنے اسٹول پر اسی سالہ بردبار شخص بیٹھا ہوا تھا جس کے سفید کپڑے اس کی بردباری کا اعلان کر رہے تھے۔ اس کے پاس گول سرے والی ہاکی نما چھڑی تھی۔ اس نے چھڑی سیدھی کی اور ہاکی نما حصہ میری گردن پر رکھ دیا۔ وہ گول ٹکڑا میری گردن میں فٹ ہو گیا۔ اس نے چھڑی کو جھٹکا دیا۔ میں بوکھلا گیا۔ آنکڑے میں پھنسی گردن کو گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اشارے سے بولا۔

''یہ چونی میری ہے ادھر لاؤ۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے چھڑی کے دباؤ سے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ میں نے ہاتھ سے چھڑی پرے کی اور چونی اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دی۔ صد شکر پان والا دکان دار پان بنانے میں مصروف تھا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا، ورنہ میری شرمندگی دو چند ہو جاتی۔ میں نے چونی اس کو دے دی۔ اس دوران سراج الدین، صدیق قریشی اور قادری صاحب کچھ آگے جا چکے تھے۔ اس کو نہ پتا چلا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ ورنہ ان کے سامنے خجالت اٹھانی پڑتی۔ بہر حال دل میں میں نے خفت محسوس کی۔

چونی بڈھے کھوسٹ کو دے کر میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھا۔ تا کہ ان لوگوں کے ساتھ جا ملوں۔ ابھی میں ان کے قریب پہنچا بھی نہیں تھا کہ ایک اور افتاد نے میرا راستہ روک لیا۔ ایک تیس پینتیس سالہ کالے رنگ کا شخص میرے راستے میں حائل ہو گیا۔ اس کے بال گھنگریالے تھے۔ شکل سے مکران کا لگتا تھا۔ اس کے کاندھے پر سلے ہوئے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے میری چھاتی پر ہاتھ رکھا اور مجھے روک کر بولا۔

''بالکل نئے جوڑے ہیں۔ ایک جوڑا لے لو سلے سلائے کپڑے ہیں۔ نہ ناپ کا ڈر نہ سلائی کا جھنجھٹ۔'' اس نے کندھے سے ایک ہی رنگ کا

جوڑا اتارا اور مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔
''یہ تم کو بالکل فٹ بیٹھے گا۔ تم پہلا گاہک ہے۔ ہماری بونی کرادو، ورنہ سارا دن کوئی گاہک نہیں ملے گانی۔''
میں نے اس جوڑے کی قیمت پوچھی۔ وہ بولا۔؟؟
''چار سو روپے دے دو۔'' اتنی رقم کا سن کر میں نے سوچا اس سے جان چھڑانے کا آسان نسخہ ہے کہ اسے بالکل کم رقم بتاؤں۔ تاکہ یہ میری جان چھوڑ دے۔ معاملہ بونی کا تھا۔ آسانی سے جان چھوٹتی نظر نہیں آرہی تھی۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔
''ایک سو روپے دوں گا۔ بولو۔ منظور ہے۔ ظہور ہے۔''
وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔
''اڑے نکالو۔ نی سو روپیہ۔ تم پہلا گاہک ہے۔ بونی خراب ہو جائے گا۔'' اس نے کپڑوں کو تہہ کیا اور میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ میری جیب میں اس وقت کل ساٹھ روپے تھے۔ باقی رقم میں سراج الدین کے بیگ میں چھوڑ آیا تھا جو اس وقت قادری صاحب کے گھر رکھا تھا۔ میں نے جیب سے رقم نکالی۔ اسے گنا وہ ساٹھ روپے تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ بھئی رقم کم ہے میں نے جوڑا نہیں خرید سکتا۔''
''اے...... کیا بولتا ہے نی۔'' وہ میری ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر بولا۔ مرد کا بچہ بنو۔ نی۔ زبان سے مت پھرو۔ نی۔ نہیں تو لفڑا ہو جائے گا۔ صدر میں گھومتا ہے۔ جیب میں ساٹھ روپے ہے۔ نی۔
اب یہ جوڑا تم کو خریدنا پڑے گا۔ ہماری بونی کا سوال ہے۔ نی۔ ہم تم کو نہیں چھوڑے گا۔ نی۔''
اتنے میں اس کے تین چار ساتھی وہاں آ گئے ان لوگوں کے پاس بھی کپڑے تھے۔ ان سب نے میرا گھیراؤ کر لیا۔ میں ہراساں ہو گیا۔ خواہ مخواہ کی مصیبت گلے کی مالا بن گئی تھی۔ اس دوران شیخ سراج الدین، صدیق قریشی اور قادری صاحب کچھ آگے نکل گئے تھے۔ میں دل میں ورد کرنے لگا۔ ''جل تُو جلال تُو۔ ان بلاؤں کو ٹال تُو۔''
وہ چار تھے میں اکیلا تھا۔ بات بڑھ جاتی تو انہوں نے میری وہ درگت بنانی تھی کہ خدا کی پناہ۔ میں پنجابی فلم کا ہیرو تو نہیں تھا کہ بھم بھم کر کے ان لوگوں کو مصنوعی گھونسے مارتا اور وہ بھاگ جاتے۔ میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ پہلے تو وہ ٹلنے پر تیار ہی نہیں تھے اگر ٹل بھی جاتے تو کچھ فائدہ ہو جاتا۔ اب ایک ہی بچاؤ کا طریقہ تھا کہ میں ان کو جوڑا خریدے بغیر ساٹھ روپے بطور بونی ہدیہ پیش کر کے جان چھڑا لیتا۔ میں اس معاملے پر سوچ رہا تھا کہ وہ گھنگھریالے بالوں والا بولا۔
''اے جلدی کرو نی۔ ہمارے دھندے کا ٹائم ہے نی۔''
مجھے تھوڑا سا تاؤ آ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ میرے پاس سو روپیہ نہیں ہے۔ نی۔ میں اسے کیسے خریدوں نی۔''
''کیا نی 'نی لگا رکھا ہے۔'' اس کا ساتھی میرے طنز کو سمجھ گیا اور بولا۔ ''یہ چوہے کا ہوتا ہے نی 'نی۔ ہمارے ساتھ مخول مت کرو۔ نی۔''
معاملہ خاصا گھمبیر ہو گیا تھا۔ ایک راہ گیر صورت حال دیکھ کر رک گیا۔ اس نے میرا حلیہ اور لباس دیکھا تو سمجھ گیا کہ میں کراچی کا نہیں ہوں پنجاب سے آیا ہوں۔ یہ مشٹنڈے اسے خوفزدہ کر رہے ہیں۔ وہ جوڑے فروشوں سے شفقت آمیز لہجے میں بولا۔
''کیا بات ہے بھئی، کیوں بیچارے کو تنگ کر رہے ہو۔''
''تم راستہ ناپو۔ نی۔ یہ ہمارا معاملہ ہے۔''

ان غنڈوں میں سے ایک بولا۔

''سو روپے میں سودا ہوا ہے۔ اب یہ سودے بازی سے مکرتا ہے نی۔ اس کا زبان ہے کہ گا......''

اس نے ایسی بات کہی کہ میں شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اسے ایک زوردار گھونسہ مار دوں۔ لیکن میں صبر کر گیا۔ مجبوری تھی۔ وہ چار تھے میں اکیلا تھا۔ میں جان چھڑانے کے چکر میں تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ صدیق قریشی' سراج الدین اور قادری صاحب کے کانوں میں اس معاملے کی بھنک پڑے۔ کیوں کہ میری عزت کا سوال تھا۔ بے عزتی ہو رہی تھی اور دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہاں مجمع لگ گیا۔ راہ گیر تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھے ہوگئے۔ دفعتاً میری نظر اس طرف گئی۔ جس طرف میرے تینوں ساتھی گئے تھے۔ وہ مجھے قریب نا پا کر واپس آرہے تھے۔ اب تو گھبراہٹ سے میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ ''یا خدا! یہ مفت کی مصیبت کہاں سے گلے پڑ گئی۔'' میں نے دل میں کہا۔ قادری صاحب وہاں پہنچے۔ میں نے ان کو لرزہ بداندام لہجے میں ساری بات بتادی۔ انہوں نے ان کپڑا فروشوں سے کہا۔

''ٹھیک ہے بھئی! ہم تمہیں سو روپے دیتے ہیں۔ کپڑے اپنے پاس رکھو۔ ہم نے نہیں خریدنے۔'' انہوں نے ان کو سو روپیہ دینا چاہا۔ تو وہ بولے۔

''اگر کپڑے نہیں لینے تو ہم سو روپیہ کیوں لیں۔ کیا ہم بھکاری ہیں۔ نی۔ سو روپیہ مولوی صاحب اپنے پاس رکھو۔ نی۔ اس سے بولو۔ آئندہ ایسا سودا ہرگز نہ کرے۔ نی۔'' قادری صاحب نے اپنی ذہانت سے معاملہ خوش فہمی سے نمٹا دیا تھا۔ مجمع چھٹ گیا۔ وہ چاروں مجھے گھورتے ہوئے زیر لب گالیاں دیتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ میں شرم کے مارے نڈھال ہوگیا میرے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا بدن میں جان ہی نہیں۔ کاٹو تو لہو نہیں۔ صدیق قریشی' سراج الدین اور قادری صاحب سے نظریں ملاتے ہوئے میں گھبرا رہا تھا۔ صدیق قریشی نے قادری صاحب سے کہا۔

''جب آپ ان کو سو روپے دے رہے تھے تو آپ نے یہ کیوں کہا۔ کہ کپڑے ہم نے نہیں لینے۔'' قادری صاحب بولے۔

''یہ کپڑے خریدنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ چوری کہ ہوں تو مزید کسی الیے سے ہم دو چار ہو سکتے ہیں۔ ان کے آگے پیچھے دوسرے نو سرباز گھوم رہے ہوتے ہیں۔ جونہی ان سے کوئی آدمی کپڑے خریدتا ہے یہ کپڑے والے رقم لے کر کھسک جاتے ہیں۔ ان کے گروہ کے دوسرے آدمی کپڑے خریدنے والے کو گھیرتے ہیں اور یہ عندیہ پیش کرتے ہیں یہ کپڑے چوری کہ ہیں۔ ہمارے ساتھ تھانے چلو۔ ڈرا دھمکا کر خریدار کی جیب کا صفایا کر دیتے ہیں۔ ان ٹھگوں کا یہ دھندہ ہے۔ اس لیے ان سے کپڑے خریدنا مصیبت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔'' پھر قادری صاحب مجھے تلقین کرتے ہوئے بولے۔

''ہوشیار رہا کرو۔ ایسے سودے نہ کیا کرو۔'' پھر ہم ویگن میں سوار ہوئے اور کورنگی نمبر 4 جا اترے۔

☆......☆......☆

اس رات میں بستر پر لیٹا تو کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند کا نام ونشان نہ تھا۔ ایک تو ہم ویگن میں مرغے بنے۔ پھر میری گردن میں بوڑھے نے چونی کی خاطر چھڑی پھنسائی۔ اوپر سے کپڑے فروشوں نے بے عزتی کردی۔ یوں لب سڑک تماشا بنا۔

☆☆......☆☆

ڈی۔ خان

سیف، کنگنا کی فلم نام کے انتظار میں

نواب خان اور ریوالور رانی ریما کگادی کی اس لواسٹوری فلم میں کام کررہے ہیں۔ جاپانی ناول سے ماخوذ اس فلم کو کچھ عرصہ قبل سیف نے پروڈیوسر سے اختلافات کے باعث چھوڑا تھا۔ مگر اب پھر سے آمد یہ بتاتی ہے کہ فلم واقعی خاص ہے۔ کہانی مختصراً یہ ہے کہ کنگنا اپنے سابق شوہر کو قتل کردیتی ہے اور اس قتل کی تحقیقات سیف علی خان کرتے ہیں۔ تیزی

سے شوٹ ہونے والی فلم کو تاحال کوئی نام نہیں دیا جا سکا ہے۔ حالانکہ اس وقت کنگنا کی گڈی تنو، منو، ویڈ ریٹرنز کے بعد چڑھی ہوئی ہے۔

پنجاب ایکسپریس

چنائی ایکسپریس کے بعد روہیت شیٹھی نے شاہ

رخ کو لے کر پنجاب ایکسپریس شروع کردی ہے۔ چنائی ایکسپریس 2013 میں بلاک بسٹر فلم ثابت ہوئی تھی۔ اب دیکھتے ہیں پنجاب ایکسپریس کیا دھمال ڈالتی ہے۔ فی الحال شاہ رخ کے فین اس فلم کا بے صبری سے انتظار کررہے ہیں۔

ایان علی جوڈیشنل کسٹڈی میں

ایان علی کو راولپنڈی کورٹ نے گزشتہ ماہ 18 دن کے جوڈیشنل ریمانڈ کے لیے جیل میں منتقل کردیا ہے۔ 14 مارچ کو کروڑوں کی مالیت کے

ڈالرز اسمگل کرتے ہوئے ٹاپ ماڈل ایئرپورٹ پر رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھیں۔

'ٹیٹل آف ڈورا'

پروڈیوسر ریہا کپور، کی تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کرنے والی فلم 'ٹیٹل آف ڈورا' کا اس وقت ٹریڈ پنڈتوں کو شدت سے انتظار ہے۔ اس فلم کے لیے انہیں سونم اور فواد خان کی ڈیٹس کا بہت زیادہ

انتظار کرنا پڑا۔ کیونکہ 'خوبصورت' کے ہٹ ہوتے ہی دونوں اسٹارز کی ڈائریز اگلے کئی سالوں تک فل تھیں۔ 'ٹیٹل آف ڈورا' نامی ناول سے ماخوذ اس فلم کا نام بھی یہی رکھا گیا ہے۔ سیاسی خاندانوں میں بچپن کی محبت کا کیا انجام ہوگا، دیکھنے کے لیے تھوڑا سا انتظار اور...... کیونکہ اِس فلم کا موضوع یہی ہے۔

جیکولین فلمیں فلاپ، لائیو پرفارمنس ہٹ

بولی وڈ اداکارہ جیکولین فرنینڈس نے لندن کے ایک بزنس مین کے بیٹے کی شادی پر پرفارم کر کے

چار کروڑ روپے کمالیے۔ اس شادی میں شرکت کے لیے جیکولین فرنینڈس نے دو روز لندن میں گزارے تھے۔ جیکولین کی فلمیں فلاپ ہو رہی ہیں لیکن وہ لائیو پرفارمنس میں سپرہٹ جا رہی ہیں۔

باجی راؤ مستانی

حال ہی میں جاری ہونے والے باجی راؤ مستانی کے ٹریلر نے تہلکہ مچادیا ہے۔ سنجے لیلا بھنسالی کی فلم باجی راؤ مستانی میں رام لیلا کی جوڑی دیپیکا پڈکون اور رنویر سنگھ کے ساتھ پریانکا بھی جلوہ گر

ہیں۔ فلم میں شامل کیے گئے گانے میں اداکارہ دیپیکا

پڈوکون اور پریانکا چوپڑا کے کردار ... ہے۔خبریں زوروں پر ہیں کہ دیپکا پڈوکون اور پریانکا پر فلمایا گیا یہ گانا دیوداس میں ایشوریا رائے اور مادھوری پر فلمائے گئے گانے ڈولا رے ڈولا کو ٹکر دینے والا ہے۔ باجی راؤ مستانی بہت جلد ریلیز ہونے والی ہے۔امید ہے یہ فلم بھی سنجے لیلا بھنسالی کی کامیاب فلم ثابت ہوگی۔

عامر خان، صحت داؤ پر لگادی

مسٹر پرفیکٹ عامر خان نے اپنی آنے والی فلم دنگل کے لیے خوب وزن بڑھا لیا ہے۔اس وقت

عامر خان کی صحت مندی کے چرچے زوروں پر ہیں ۔نتیش تیواری کی فلم دنگل میں عامر خان نے لگ بھگ 25 کلو وزن بڑھایا ہے۔امید ہے عامر خان کی آنے والی فلم دنگل کامیابی کے نئے ریکارڈ بنانے میں کامیاب ہوگی۔

ماہرہ خان، رئیس سے پہلے بن روئے

لولی وڈ کی نامور ہیروئن ماہرہ خان رئیس سے پہلے لولی وڈ کے سینما اسکرین کی زینت بن چکی ہیں۔عیدالفطر پر ریلیز ہونے والی فلم 'بن روئے' کا بہت چرچا تھا۔لیکن بہترین پرفارمنس کے باوجود بھی سینما ویورز نے ماہرہ خان کے ہوتے ہوئے بھی کسی دیوانگی کا اظہار نہ کیا۔اور فلم سیدھی ڈبے میں چلی

'رانگ نمبر' سپرہٹ ہوگئی۔ ماہرہ اپنی اداکاری کے ذریعے بڑا نام بنا چکی ہیں اور یہ ان کی کامیابی ہے کہ بولی وڈ کے فلم میکرز نے ماہرہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور کنگ خان کے ساتھ فلم رئیس میں بطور ہیروئن کاسٹ کرلیا۔شاہ رخ خان کی فیورٹ ہیروئنوں میں ماہرہ خان بھی شامل ہوگئی ہیں۔ ماہرہ خان کی فلم رئیس تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کرتے ہوئے مکمل ہوگئی ہے۔لیکن رئیس سے پہلے 'بن روئے' کا حالیہ اسٹیٹس ماہرہ خان کے کیریئر پر ضرور اثرانداز ہوگا۔

فوادخان نے مسٹر چالو چھوڑ دی

فوادخان نے ادھر کرن جوہر کپور اینڈ سنز سائن کی تو دوسری طرف انہیں فوراً ہی پریانکا چوپڑا کے ساتھ لیڈنگ رول میں مسٹر چالو میں ریما کاگتی نے سائن کرلیا تھا۔فلم کی شوٹنگ اسٹارٹ ہوچکی تھی۔اور امید تھی کہ یہ فلم 2015 ہی میں نمائش پذیر ہو جائے گی۔لیکن برا ہو بولی وڈ کا کہ فواد خان کو دیگر ہیروز کی طرح کھلے کھلا سین کرنے کے لیے دے دے

گئے تھے۔ فواد خان نے کمپرومائز کرنے کے بجائے

فلم چھوڑنے کو ترجیح دی اور چاکلیٹی ہیرو مسٹر چالو بننے کے بجائے صاف ستھرا خان بن گئے۔ ویلڈن فواد خان کاش ایسی ہی سوچ بولی وڈ جاکر اپنے ملک کی عزت داؤ پر لگانے والے سپر اسٹارز کی بھی ہوجائے تو کیا ہی بات ہے۔

عائشہ عمر کے جلوے

لولی وڈ کی مستانی اداکارہ کہلانے والی عائشہ عمر جنہوں نے بلبلے کے ذریعے کامیابی کے آسمان کو چھو

لیا۔ اس وقت اپنے دیرینہ خواب یعنی "سلور اسکرین" کی رانی بننے کی بھی تعبیر پالی ہے۔ فلم کراچی سے لاہور ریلیز ہوکر شائقین فلم کو محظوظ کررہی ہے۔ عائشہ عمر کی بے باک اداکاری اور جلوے یقیناً اس فلم کی کامیابی کا سبب بنیں گے۔ ہماری طرف سے ایک اور فلم ہیروئن کے اضافے پر لولی وڈ کو مبارکباد۔

سلمان خان اور ہرتیک روشن ٹورس ورلڈ ایوارڈز میں نامزد

بولی وڈ کے سپر ہیروز سلمان خان اور ہرتیک روشن کی ایکشن فلمز لاس اینجلس میں ہونے والے ''ٹورس ورلڈ ایوارڈز'' میں نامزد کی گئیں۔ جہاں ان فلموں کا مقابلہ سال کی بہترین ہولی وڈ ایکشن فلمز سے ہوگا۔ دبنگ خان کی سپر ہٹ فلم ہولی وڈ میں

بیسٹ اسٹنٹ ایوارڈ کے لیے نامزد کی گئی ہے جہاں ''کک'' کا مقابلہ ایکسپینڈیبل تھری اور ٹرانسفارمرز جیسی ہولی وڈ فلمز سے ہوگا۔ دوسری جانب ہرتیک اور کترینہ کیف کی فلم بینگ بینگ ''بیسٹ فائٹ ایوارڈ'' کے لیے نامزد ہوئی۔ اس کیٹیگری میں رائز آف این ایمپائر اور کیپٹن امریکہ جیسی فلمز بھی شامل ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بولی وڈ کی فلمز ہولی وڈ فلمز کو مات دے پاتی ہیں یا نہیں۔

☆☆......☆☆

نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل

مختار بانو طاہرہ

زندگی اپنے ساتھ جہاں بہت ساری خوشیاں لے کر آتی ہے وہیں بہت سارے ایسے مسائل بھی جنم لیتے ہیں جو اس زندگی کو مشکلات کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں۔ان میں سے بیشتر اُلجھنیں انسان کی نفسیات سے جڑی ہوتی ہیں اور انہیں انسان از خود حل کر سکتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی اُن ہی اُلجھنوں کو سلجھانے کی ایک کڑی ہے۔ اپنے مسائل لکھ بھیجیں ٗہماری کوشش ہوگی کہ آپ ان مسائل سے چھٹکارہ پالیں۔

شرمین لاہور

باجی! بے خیالی میں میری ایک رانگ نمبر پر بات ہوگئی...... لڑکے کی آواز میرے کزن سے ملتی تھی۔ اسے میرا نام بھی معلوم تھا۔ میں نے اس سے پندرہ منٹ تک بات کی، پھر مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ کوئی اور ہے۔ میں نے فون بند کردیا۔ لیکن اُس نے کوئی غیر اخلاقی بات نہیں کی اس لیے اس کی دوبارہ کال آنے پر میں نے پھر بات کرلی۔ اسی دوران گھر میں گہما گہمی بڑھ گئی۔ بھائی کی شادی قریب آ رہی ہے۔ مہمانوں نے آنا جانا شروع کردیا۔ میں نے لڑکے سے کہا اب فون مت کرنا...... مجھے تم جیسے فضول لوگوں سے نفرت ہے۔ جواب میں وہ کہنے لگا کہ میں جانتا ہوں تمہارے بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔ تمہیں مجھ سے نفرت ہی سہی مگر محبت میں کرتا ہوں۔ تم چاہو تو تمہاری شادی بھی جلد ہوسکتی ہے۔ میرے لیے تو گھر والے پہلے ہی پریشان ہیں۔ اس بات پر میں خاموش ہوگئی۔ اُسے کوئی جواب نہ دیا۔ اور نہ اب بات کرتی ہوں۔ کیا کوئی لڑکا ایسی لڑکی سے شادی پر رضا مند ہوسکتا ہے جو اس سے اپنی نفرت کا اظہار کردے۔

☆ ارادے کے ساتھ غلط نمبر ملا کر اجنبی لڑکی سے بات کرنے والے لوگوں پر کسی بھی قسم کا اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کا مقصد لڑکیوں سے محض گفتگو کرنا، ان کو بے وقوف بنانا، انہیں پریشان کرنا۔ ان کے سخت جملوں پر لطف اندوز ہونا ہے اس سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔ یہ سمجھ لیں کہ کسی سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ وقت آنے پر اچھی جگہ شادی ہوجائے گی۔

فیصل۔ مرید کے

اچھی باجی! میرے والد نے بہت ایمانداری سے زندگی گزاری، اس پر انہیں فخر ہے جبکہ ہم نے دیکھا کہ ان کے دوست جو اسی عہدے پر کام کرتے ہیں، ان کا معیارِ زندگی ہم سے بہت اچھا ہے۔ مجھے اور میری امی کو پیسے کی اہمیت کا احساس ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے میں نے۔ والد سے کہتا ہوں اپنے محکمے میں ملازمت دلوادیں۔ وہ تیار نہیں ہوتے۔ کیا کوئی ایسا باپ ہوگا جو اپنے بیٹے کی ترقی اور خوشحالی میں مدد کرنا نہ چاہے۔

☆ آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ ایمانداری، نیکی اور سچائی میں دل و دماغ اور روح کا سکون ہے۔ اگر ضمیر کا سودا کر کے دنیا خریدی جائے اور معیارِ زندگی بڑھایا جائے تو وہ خوشی نہ صرف عارضی ہوسکتی ہے بلکہ سکون سے بھی خالی ہوگی۔ کہیں کوئی بے اعتمادی ضرور ہے جو والد کے ساتھ اتفاقِ رائے نہیں۔ ان کی طرف سے بدگمان ہرگز نہ ہوں۔ اعلیٰ تعلیم

دلوانے کا مطلب آپ کی ترقی اور خوشحالی کی خواہش ہی ہے۔

حارث۔ایبٹ آباد

میرے دوست اتنے مخلص نہیں جتنا میں ان کے ساتھ ہوں۔ میں ہر وقت ہر اک کے کام آنے کو تیار رہتا ہوں۔ ایک دوست کے والد اسپتال میں داخل تھے۔ان کو خون کی ضرورت پڑی، میں نے دیا۔ وہ بھول گیا۔اسی طرح کئی دوستوں کو اپنی ہمت سے بڑھ کر رقم قرض دی۔ انہوں نے واپسی پر بہت تنگ کیا۔بعض تو ابھی تک ناراض ہیں۔کوئی احسان تک نہیں مانتا۔

☆انسانی معاملات میں احساس کا مطلب ہے تنگدست قرضدار کو مزید مہلت دینا۔قرضہ وصول کرتے ہوئے آسانی کرنا۔ دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہوئے ایثار سے کام لینا۔ جس نے نیک سلوک نہ کیا ہواس کے ساتھ نیک سلوک کرنا، برا سلوک کرنے والے سے بدلہ لینے کی قوت رکھنے کے باوجود معاف کر دینا۔کوئی احسان نہ مانے اس کو نہ جتانا اور بھول جانا۔اللہ کے بندوں کے کام آنا عبادت ہے۔اس کا صلہ اللہ ہی دیتا ہے۔تعلقات کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے یہ خیال رکھیں کہ آئندہ کسی کو اتنا قرض دیں کہ آپ کے لیے پریشانی نہ ہو۔

شاہدہ سرگودھا

میں بہت صفائی پسند ہوں۔آج کل میرے دانت میں بہت درد ہے۔رات بھر جاگتی ہوں سوچتی ہوں اگر دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس گئی تو اور زیادہ تکلیف ہوگی۔ایک تو مجھے ان کے اوزاروں سے ڈرلگتا ہے۔اور دوسرے ان کے کلینک میں گندگی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔اتنی طبیعت گھبراتی ہے کہ متلی کا احساس ہونے لگتی ہے۔

☆ دانت کی تکلیف معمولی نہیں ہوتی۔ اس کو برداشت کرنا آسان کام نہیں،لیکن گندگی کا احساس آپ کے لیے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے یہی وجہ ہے کہ دانت کی شدید تکلیف برداشت کر رہی ہیں۔اس سے نجات کے لیے ڈاکٹر یا سرجن سے ملنا ضروری ہے۔کوالیفائڈ سرجن اپنے کلینک میں صفائی کا اچھا انتظام رکھتے ہیں۔ وہ سرجری کے دوران جو چیزیں استعمال کرتے ہیں وہ بھی صاف ستھری ہوتی ہیں۔جب صاف ستھرے ماحول مین علاج کی سہولت مل جائے تو ذہن میں آنے والے ان خیالات کو روکیں جو گندگی کا احساس دلاتے ہیں اور محسوس کریں کہ درد سے آرام کتنا ہے۔

اُم فضا۔حیدر آباد

باجی! میں بہت حساس اور خاموش طبیعت کی مالک ہوں۔خود اعتمادی کی کمی ہے۔دوست کچھ خاص نہیں ہیں۔لوگوں کی نظروں میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔نظر انداز کرتے ہیں۔انٹر میں فیل ہو گئی۔ دوبارہ پڑھنا چاہتی ہوں مگر کوئی راہ نہیں بن رہی۔اسکول میں پڑھاتی تھی وہاں سے بھی جاب ختم ہوگئی۔

☆ خاموش طبع ہونا اچھی بات ہے۔اور ایک حد تک حساس ہونا بھی خوبی ہے۔ کیونکہ لوگ نرم دل بھی ہوتے ہیں۔ عام لوگوں سے دوستی اچھی بات ہے کیونکہ اس طرح انسان خود خاص اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔لوگ سب کو نظر انداز کرتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ان کے کسی کام کا ہو۔ امتحان میں فیل ہو جانے کے مطلب ہے آپ نے ذہنی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔علم کا شوق اور سچی لگن ہوئی تو ضرور کوئی راہ بنے گی۔ جاب ختم ہونے پر پریشانی ہوتی ہے مگر خود کو تیزی سے ترقی کے راستے پر لے جانے کا یہ اہم موقع ہے۔اب رہی خود اعتمادی کی کمی کی بات، یہ صرف گفتگو سے بھی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اٹھنے، بیٹھنے، چلنے کے انداز سے بھی نمایاں ہوتی ہے۔لہٰذا اس جانب بھی متوجہ ہوں۔اپنی صلاحیتوں کا اعتراف، اچھا استعمال وقت کی قدر، علم میں اضافہ ،خود کو ہر خوبی اور خامی کے ساتھ قبول کرنا، جذبات میں ٹھہراؤ انسان کو پُر اعتماد بناتا ہوں۔

☆☆.....☆☆

نادیہ طارق

پیارے قارئین! برسات کا موسم جب اپنی چھب دکھلانے لگتا ہے تو موسم کا اثر ہمارے کھانوں پر بھی براہِ راست پڑتا ہے۔ اس ماہ موسم کے حساب سے ہم آپ کے لیے مزیدار کھانوں کی تراکیب لائے ہیں جو یقیناً آپ کے ہاتھوں سے تیار ہو کر دستر خوان کی رونق بڑھانے کا باعث بنیں گی۔

تھائی چکن کیسروالے

اجزاء

چکن (ران کا حصہ گرل کیا ہوا) : دو عدد
نوڈلز : سو گرام
تھائی سوپ : ایک پیکٹ
گاجر : ایک عدد
پودینہ / دھنیا : گارنش کے لیے

ترکیب: ایک دیگچی میں نمک ڈال کر پانی اُبال لیں۔ پھر اس میں نوڈلز ڈالیں تاکہ وہ نرم پڑ جائیں (کچے نہ رہیں) اور انہیں پانی سے نکال کر الگ رکھ لیں۔ چکن سے کھال اور ہڈیاں نکال دیں اور دھو لیں پھر سوپ بنانے کے لیے پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں۔ اس سوپ میں باریک گاجریں بھی ڈال دیں اور سوپ کو اُبلنے دیں۔ اس اسٹیج پر سوپ میں نوڈلز بھی ڈال دیں اور انہیں ایک اُبال دیں۔ یہ تیار تھائی سوپ بے حد لذیذ اور قوت بخش ہوتا ہے۔ اسے گرم گرم پیش کریں۔ چاہیں تو دھنیا، پودینہ سے گارنش کر لیں۔

چکن مسالا کھوپرا

اجزاء

چکن اسٹاک : ڈیڑھ سو ملی لیٹر
کھوپرا کریم : پون کپ
تیل : آدھا کپ
چکن : آٹھ سو گرام (بغیر کھال اور ہڈی کے لمبے پارچوں میں کٹی ہوئی)
لیموں : ایک عدد (چھلکا باریک کٹا ہوا اور جوس)
سبز پیاز : چار عدد (باریک کٹی ہوئی)
مونگ پھلی کا مکھن : چار کھانے کے چمچ
تازہ لال مرچ (کٹی ہوئی) : ایک عدد

ترکیب: چکن اسٹاک اور کھوپرا کریم کو خوب مکس کیجیے پھر چکن پر لگائیں اس طرح کہ کریم چکن میں اچھی طرح جذب ہو جائے۔ اب اسے ایک طرف رکھ دیں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں اور چکن (اوپر والا) اُس میں گولڈن فرائی کریں۔ اب اسی کڑاہی میں پہلے سبز پیاز اور سرخ مرچ ڈال کر تھوڑا بھون لیں پھر اُس میں مکس کریں۔ مونگ پھلی کا مکھن، کھوپرا، کریم مکسچر، لیموں کے باریک کٹے چھلکے مع جوس تھوڑے تھوڑے وقفے سے کڑاہی میں چمچ چلاتی رہیں تاکہ کڑاہی میں مسالے نہ لگیں۔ جب

مسالا تیل چھوڑے اور خوشبو دے تو اس تیار چکن مسالا کھو پرا ڈش کو سرونگ پلیٹ میں نکال لیں۔ غذائیت اور لذت سے بھرپور ڈش ہے۔

براؤنیز

اجزاء

مکھن	: آدھا پاؤ
شکر	: ایک پاؤ
چاکلیٹ (میلٹ کی ہوئی)	: آدھا پاؤ
دودھ	: پون کپ
ونیلا ایسنس	: آدھا چائے کا چمچہ
اخروٹ	: آدھا پاؤ
میدہ	: سوگرام
بیکنگ پاؤڈر	: ایک چائے کا چمچہ
کوکو پاؤڈر	: دو کھانے کے چمچے

(کوکو پاؤڈر کو تھوڑے سے گرم پانی میں حل کر لیں)

انڈے	: دو عدد

ترکیب: میدہ، بیکنگ پاؤڈر، کوکو پاؤڈر کو چھان لیں۔ مکھن کو پھینٹ لیں۔ تھوڑی تھوڑی کر کے شکر ڈالیں۔ ایک ایک کر کے انڈے ڈالیں۔ اس کے بعد ونیلا ایسنس پھر فریش ملک، پھر میلٹ کی ہوئی چاکلیٹ، پھر میدہ ڈالیں۔ اس کے بعد لکڑی کے چمچے کی مدد سے ملائیں اور تھوڑے اخروٹ ڈال کر مکس کریں۔ گریس اور پیپر لگے 8 x 8 کے پین میں ڈالیں۔ باقی اخروٹ اوپر چھڑک دیں۔ تھوڑی انڈے کی سفیدی اور کوکو پاؤڈر سے اوپر برش کریں۔ آدھے گھنٹے بیک کریں جب ٹھنڈا ہو جائے تو اس کے چھ ٹکڑے کاٹ کر سرو کریں۔

مکس فرائیڈ رائس

اجزاء

چاول (اُبلے ہوئے)	: دو کپ
چائنیز نمک	: ایک کھانے کا چمچہ
تیل	: ایک چوتھائی کپ
سویا سوس	: ایک کھانے کا چمچہ
نمک	: یک کھانے کا چمچہ
ہری پیاز	: دو عدد (چوپ کی ہوئی)
شملہ مرچ	: ایک کپ (چوپ کی ہوئی)
انڈے	: چار عدد فرائیڈ
مٹر	: ایک کپ (اُبلے ہوئے)
گاجر	: ایک کپ
کالی مرچ	: ایک کھانے کا چمچہ
لہسن	: ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب: چاول کو نمک کے پانی میں دو کنی تک اُبال لیں۔ تیل گرم کریں اس میں انڈے فرائی کر کے نکال لیں۔ اس میں لہسن ڈال کر فرائی کر لیں۔ دو منٹ فرائی کرنے کے بعد مٹر، گاجر، شملہ مرچ اور پیاز ڈال کر دو منٹ فرائی کریں۔ اب نمک، چائنیز نمک، سویا سوس، کالی مرچ اور انڈہ ڈال کر مکس کریں۔ اب چاول ڈال کر اچھی طرح مکس کر کے پانچ منٹ پر رکھ کر اتار لیں۔

چکن ویجی ٹیبل پکوڑے

اجزاء

مرغی کا قیمہ	: ایک کپ
کٹی ہوئی بند گوبھی	: آدھا کپ
اُبلے ہوئے مٹر	: آدھا کپ
اُبلے ہوئے آلو	: دو عدد
کارن فلور	: چار کھانے کے چمچے
میدہ	: دو کھانے کے چمچے
نمک	: حسب ذائقہ
سویا ساس	: ایک کھانے کا چمچہ
اجی نو موتو	: آدھا چائے کا چمچہ

انڈا : ایک عدد
تیل : حسب ضرورت

ترکیب: مرغی کے قیمے میں بند گوبھی، مٹر اور اُبلے ہوئے آلو ڈال کر اچھی طرح مسل کر ملا لیں۔ پسی ہوئی کالی مرچ، سویا ساس، نمک، اجی نو موتو اور لیموں کا رس ڈال کر تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں پھر اس آمیزے میں میدہ اور کارن فلور بھی ملا لیں۔ انڈا پھینٹ لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور تیار آمیزے کے چھوٹے چھوٹے پکوڑے بنائیں۔ انڈے میں ڈبو کر کڑاہی میں ڈالتی جائیں۔ دھیمی آنچ پر سنہرا ہونے تک تل لیں۔ ٹماٹو کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

نوڈلز ود بیف بالز

اجزاء

اُبلے ہوئے نوڈلز : دو کپ
کٹی ہوئی سیم کی پھلی : آدھا کپ
سویا ساس : دو کھانے کے چمچے
نمک : حسب ذائقہ
قیمہ : آدھا کپ
پسا ہوا گرم مصالحہ : ایک کھانے کا چمچہ
بھنا ہوا بیسن : دو کھانے کے چمچے
پسا ہوا پپیتا : ایک کھانے کا چمچہ
چلی گارلک ساس : دو کھانے کے چمچے

ترکیب: سب سے پہلے قیمے میں پپیتا ملا کر پیس لیں۔ پھر اس میں پسا ہو گرم مصالحہ، نمک اور بھنا ہوا بیسن ملا کر کوفتے بنا لیں۔ کسی گہری دیگچی میں تھوڑی سا پانی اور دو چمچے زیتون کا تیل ڈال کر ہلکی آنچ پر کوفتے پکنے رکھ دیں جب پانی خشک ہو جائے تو چولہا بند کر دیں۔ ایک ساس پین میں دو چمچے تیل ڈال کر کٹی ہوئی سیم کی پھلی کو ہلکا سا تل لیں۔ سویا ساس اور تھوڑا سا نمک ڈال کر چمچہ چلائیں جب بھاپ اوپر آنے لگے تو کوفتے نوڈلز میں ملا کر ڈھکنا رکھ دیں۔ ڈش میں نکالنے کے بعد چلی گارلک ساس ڈال کر پیش کریں۔

ٹرائفل پڈنگ

اجزاء

سادہ اسفنج کیک (تازہ) : آدھا پونڈ
فروٹ جام : دو کھانے کے چمچے
بالائی : آدھا کپ
کنڈینسڈ ملک : تین کپ
چینی : حسب پسند
کسٹرڈ پاؤڈر (ونیلا) : تین بڑے چمچے
فریش کریم : آدھا کپ
نمکین مکھن : چار کھانے کے چمچے

ترکیب: کیک سلائس کی شکل میں کاٹ لیں۔ ان پر مکس فروٹ جام لگا کر سینڈوچز بنا لیں۔ جس ڈش میں ٹرائفل سرو کرنا ہو اس میں ان سینڈوچز کے چار چار ٹکڑے کر کے ڈال دیں۔ اب آدھا کپ دودھ میں آدھا کپ بالائی مکس کریں اور ان سینڈوچز کے ٹکڑوں کو ان میں بھگو دیں۔ (تھوڑا تھوڑا اوپر ڈال کر بھگوئیں)۔ ایک کھانے کا چمچہ دودھ میں کسٹرڈ پاؤڈر حل کر لیں۔ اب بقیہ دودھ گرم کریں۔ چینی حل کریں اور حل شدہ کسٹرڈ پاؤڈر اس میں ڈال دیں۔ ساتھ ہی مکھن بھی ڈال دیں اور خوب اچھی طرح چمچہ چلائیں۔ گاڑھا ہونے پر چولہے سے اتار لیں، لیکن چمچہ چلاتے جائیں اور چلاتے ہوئے ہی اس کو خوب ٹھنڈا کر لیں تاکہ جم نہ سکے۔ جب ٹھنڈا ہو جائے تو کیک والی ڈش پر ڈال دیں اور سیٹ کر دیں۔ اب فریش کریم کو اچھی طرح بیٹ کریں۔ کسٹرڈ آدھا گھنٹہ فریج میں رکھیں۔ ٹھنڈا ہو کر جم جائے تو اوپر سے کریم ڈال دیں۔ اچھی طرح پھیلا دیں کہ ڈش سفید کریم ہی کی دکھائی دے اور کسٹرڈ بالکل ڈھک جائے۔ یخ ہونے پر سرو کریں۔ چاہیں تو اوپر سے چھلے ہوئے بادام سے گارنش کر لیں۔

☆☆.....☆☆

ساتھیو! اکثر ہمیں کسی ایسی بیماری سے سامنا کرنا پڑتا ہے، جس کے لیے ہمیں سمندر کی تہہ یا آسمان کی بلندیوں، جنگل بیابانوں یا پہاڑوں تک پر جانا پڑ جاتا ہے مگر... جان ہے تو جہان ہے۔ خدا اگر بیماری دیتا ہے تو اس نے شفا بھی دی ہے۔ قدرت کے طریقہ علاج کا آج بھی کوئی مول نہیں۔ حکمت کو آج بھی روز اول کی طرح عروج حاصل ہے۔ اسی لیے طبیب اور حکیم صاحبان کو خدائی تحفہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی صحت اور تندرستی کے لیے ہم نے یہ سلسلہ بعنوان 'حکیم جی' شروع کیا ہے۔ امید ہے ہمارے مستند اور تجربہ کار حکیم صاحب آپ کی جملہ بیماریوں کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کریں گے۔ نیا سلسلہ حکیم جی! آپ کو کیسا لگا؟ اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

خارش، کیل، چھائیاں

خارش (Itching)

اسباب:

☆ ہاضمے کی خرابی، میٹھی، گٹ اور تیل والی اشیاء بکثرت استعمال کرنے اور خواتین میں ایام ماہواری کی خرابی سے بھی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔

علامات:

خارش خشک و تر دو قسم کی ہوتی ہیں۔ خشک میں مریض کو کھجاتے کھجاتے چین نہیں آتا۔ جلد میں چبھن یا سوزش کی شکایت پائی جاتی ہے۔ کھجلی کی وجہ سے مریض سو بھی نہیں سکتا۔ تر خارش میں جسم پر سفید دانے ہوتے ہیں جن میں پیپ بھری رہتی ہے اور ان میں جلن اور تکلیف ہوتی ہے۔

مہاسے (کیل) Pimple(Black head)

اسباب:

☆ خواتین میں حیض کی خرابی کی وجہ سے یہ تکلیف پیدا ہو جاتی ہے۔ زیادہ مرغن کھانے اور گرم اشیاء کا بکثرت استعمال، بدہضمی اور خرابی خون بھی اس کے اسباب ہیں، مسامات کا کشادہ ہونا، گلٹیوں کی خرابی، قبض اور بواسیر جیسے امراض بھی مہاسوں کی پیدائش پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

علامات:

☆ چہرے پر چھوٹے چھوٹے دانے نکل آتے ہیں جن کو دبانے سے سفید مواد نکلتا ہے اور گڑھا پڑ جاتا ہے آرام آنے پر سیاہ رنگ کا داغ پڑ جاتا ہے۔ دانے چہرے پر بار بار نکلتے ہیں۔

چھائیاں (Freckles)

اسباب:

☆ چہرے پر چھائیوں کا سبب خون کی خرابی، مادہ سودا کا غلبہ، شدید بخار میں مبتلا رہنا، دھوپ میں چلنا پھرنا، گاہے بگاہے۔ ہاضمے کی خرابی اور جگر میں نقص ہونے کی وجہ سے رخساروں کے اوپر دھبے پیدا ہو جاتے ہیں۔ خواتین میں رحم کی خرابی یا ایام ماہواری کے بند ہونے کی شکایت میں بھی چھائیاں پڑ جاتی ہیں، حمل کے دوران بھی خواتین کے چہروں پر ایسے دھبے دکھائی دیتے ہیں۔

علامات:

☆ اس مرض میں چہرے کے حسن و جمال میں فرق پڑ جاتا ہے اور چہرے کے اوپر سرخ، نیلے، سیاہ یا زرد دھبے پڑ جاتے ہیں۔ چہرے کی رنگت بھی سیاہی مائل ہو جاتی ہے۔

کیل چھائیوں اور مہاسوں کے لیے:

نسخہ نمبر 1:

اجزاء	وزن
عناب	10 گرام
چیرائتہ	10 گرام
پنیر	10 گرام
عشبہ	10 گرام
افستین	10 گرام

ترکیب:

☆ ان تمام اجزاء کو چار گلاس پانی میں پکائیں کہ یہ دو گلاس رہ جائے۔ ایک گلاس صبح اور ایک گلاس رات کو پئیں۔

نسخہ نمبر 2:۔

خارش کے لیے مرہم:

گندھک	20 گرام
کاشکاری سفیدہ	20 گرام
کافوری دیسی	10 گرام
ناریل کا تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

ان تمام اجزاء کو باریک پیس کر ناریل کے تیل میں ملا کر لگائیں۔

گرمی دانوں کے لیے نسخہ نمبر 3۔

اجزاء	وزن
ملتانی مٹی	1 پاؤ
پیپرمنٹ	5 گرام
کافور	5 گرام
قلمی شورہ	20 گرام
گندھک	50 گرام

ترکیب:

ان تمام اجزاء کو پیس کر ایک جگہ پانی میں ملا کر جسم پر لگانے سے گرمی دانے فوری ختم ہو جائیں گے۔

☆☆......☆☆

بیوٹی گائیڈ
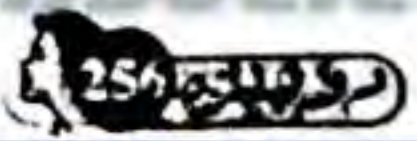
آپ کے جانے پہچانے اسکن اسپیشلسٹ **ڈاکٹر خرم مشیر**

ہر ماہ آپ کی بیوٹی سے متعلقہ مسائل کے حل کے ساتھ

اس ماہ ہم بیوٹی گائیڈ میں خوبصورتی کے بارے میں اہم معلومات اور گھر بیٹھے ایسی بہترین بیوٹی ٹپس دیں گے جو گھر اور بیوٹی پارلر جانے کے بعد آپ کے لیے نہایت اہم ثابت ہوں گی۔ میک اپ کی آگہی' آپ کے حسن میں چار چاند لگا سکتی ہے۔ آپ کو اِس ماہ کا بیوٹی گائیڈ کیسا لگا؟ آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

کیا آپ کو لگتا ہے کہ آپ خوب صورت نہیں یا آپ واقعی خوب صورت ہیں؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے آپ کو کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب آپ اپنی دیوار پر لگے آئینے سے کریں اور اپنے آپ کا جائزہ لیں۔ آپ کو اس بات کا خود ہی اندازہ ہو جائے گا اور اس بات کا منفی یا مثبت جواب مل جائے گا۔ اگر آپ کا جواب "ہاں" میں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ یا پھر آپ کی بیوٹیشن بہت اچھی ہیں جو بہتر طور پر آپ کے حسن کی حفاظت کرتی ہیں۔

اگر اس کا جواب "نہیں" میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خود یا آپ کی بیوٹیشن آپ کی جلد پر زیادہ توجہ نہیں دیتیں۔ یہ ساری حقیقت آپ کے سامنے موجود ہے۔

سن بلاک کی آپ کو سب سے پہلے ضرورت ہے۔ اپنے میک اپ سے قبل اسے استعمال کریں۔ اس کے لیے آپ کو ایسے لوشن کی ضرورت ہے جس میں اینٹی آکسی ڈینٹ شامل ہو۔ بالغ خواتین کے لیے ایلزبتھ آرڈن کی سیرامین پرفیکٹ موئسچر کریم بہت سود مند ہے۔

آپ فاؤنڈیشن یا کنسیلر ضرور استعمال کریں مگر ایک بات یاد رکھیں کہ یہ دس ماہ سے زائد پرانی نہ ہو۔ برش پینسل کے لیے آپ کا انتخاب سنٹ لارینٹ ایڈنیٹ ہونا چاہیے۔ نینارکی کا فلالیس کنٹرول موئسچرائزر اور پاؤڈر کے لحاظ سے بہترین انتخاب ہے کیونکہ ہمارے موسم کے لحاظ سے تیار کیا جاتا ہے اور ٹو اِن ون کے طور پر دستیاب ہے۔ اگر آپ کو کریم کے طور پر درکار ہو تو پھر سینٹ لارینٹ کا لیکوئیڈ لائن فاؤنڈیشن استعمال کریں۔

پُرکشش نظر آنے کے لیے: آپ کی ماہر آرائش حسن کو چاہیے کہ وہ آپ کے حسن کے لیے بہتر مشورہ دے۔ چند ایک بنیادی آئی کلر اور بلشر سے ہٹ کر آپ کو بتائے۔ آپ اس سلسلے میں بھی توجہ دیجیے۔ کلرفیس بلشر ایک عمدہ اور ہلکا آئی بلشر ہے۔ بنیادی نیلا' سنہری' تانبے کی رنگت کا آئی شیڈ دیکھیے' کورگل' کریسٹن' یور نینارکی کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ آئی پینسل کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ یہ سیاہ براؤن اور ہلکی نیلی با آسانی مل جاتی ہے اور اس کا

اہم حصہ ہے۔
آپ آئی پینسل کو اپنی جلد پر پھیر کر اس کی روئی اور رنگ کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ مسکارا استعمال کیے بغیر آپ گھر سے باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ یہ آپ کی آنکھوں کے حسن میں مزید اضافے کا باعث ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ آپ کے مجموعی تاثر کو زیادہ پرکشش بناتا ہے۔

آپ کے ہونٹ: شاعروں نے ہونٹوں کے بارے میں بڑے قصیدے کہے ہیں ہونٹوں کو لب گل اور نہ جانے کیا کیا کہا ہے۔ وہ اپنے محبوب کے حسن کا تذکرہ کرتے ہوئے لبوں کا ذکر کرنا کبھی نہیں بھولتے یہ چہرے کا وہ حصہ ہے جو بقول شاعر پھولوں کی پتیوں سے مشابہ ہے۔ لہٰذا اگر آپ حسین بننا چاہتی ہیں تو پھر اپنے لبوں کے حسن اور ان کی حفاظت پر بھی توجہ دیں۔ لپ اسٹک کے ہلکے اور خوشنما رنگ آپ کو لیکمے کے اورنج لپ کلر میں مل سکتے ہیں جو کہ خاص طور پر وٹامن سی اور قدرتی پھلوں کے اجزاء پر مشتمل ہے۔ یہ 27 کلاسک رنگوں اور 25 خصوصی رنگوں میں دستیاب ہے جن میں گلابی' چمپاگنی' اسٹرابری' بلیک بیری' بادام وغیرہ شامل ہیں۔ لپ اسٹک کے رنگوں میں سرخ رنگ ایسا ہے جو سب ہی خواتین میں مقبول ہے۔ ہم اس بات سے بھی واقف ہیں کہ سرخ رنگ کی جانچ اور مکمل سرخ رنگ کتنا مشکل ہے۔ اگر آپ کے پاس زیادہ جگہ نہیں ہے تو آپ چار مختلف شیڈ دینے کے لیے ضرور رکھیں۔ اس کے انتخاب کے لیے کلیر نیس' نینار کی' ریولون اور لیکمے کے ہاں بہت اچھے اور دیدہ زیب رنگ موجود ہیں۔ ان میں لیکمے نے لپ کلر پلیٹس بھی متعارف کروائے ہیں جو کس اینڈ میچ کے طور پر کم جگہ گھیرتے ہیں۔

جلد کی ہم آہنگی: خواتین اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ میک اپ میں مکمل فاؤنڈیشن کی کیا اہمیت ہے۔ یہ ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے کہ درست شیڈز کا انتخاب کریں۔ لوریل پیرس نے آپ کے لیے یہ مشکل آسان کر دی ہے۔ ان کی حالیہ مصنوعات ٹرو میچ پہلا میک اپ ہے جو آپ کی جلد سے مطابقت اور ہم آہنگی رکھتا ہے۔ ٹرو میچ کو چوبیس مختلف جلد کے مطابق تیار کیا گیا ہے جو کہ بالکل قدرتی لگتا ہے۔ اس میں یہ خاصیت ہے کہ یہ جلد کی مطابقت کے انتخاب کے بعد آپ کی جلد میں جذب ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کے چہرے کو بھی نکھارتا ہے۔ اس میں وٹامن بی' ای اور گلیسرین شامل ہیں جو جلد میں جذب ہو کر اسے توانائی پہنچاتی ہیں۔

بہت خوبصورت: اس کے علاوہ ایک اہم چیز کو آپ اب تک نظر انداز کرتی رہی ہیں۔ وہ چیز جو ڈریسنگ ٹیبل سے میک اپ میں معاون ہوتی ہے لیکن میک اپ سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے یہ ہر جگہ نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ آپ کے ہاتھ ہیں جنہیں پوری توجہ کی ضرورت ہے ایک اچھا لوشن لیکمے کا ہے۔ آپ کے ہاتھوں کو ملائم' نرم اور جوان رکھتا ہے لونا بلیو کی نیل پالش ہیں آپ کے ناخنوں کی حفاظت کے لیے موجود ہے۔ اپنے لباس کے لحاظ سے آپ نیل پالش کا انتخاب کر سکتی ہیں جن میں سرخ' عنابی' سنہرا' تانبے کے رنگ عموماً شام کے اوقات میں اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ یاد رکھیں نیل پالش ریموور آپ کے ناخنوں پر رنگوں کی بہاریں بدلنے میں فوری مدد کرتا ہے۔

اہم غذائیت: آپ اپنی بیوٹی پارلر کی ماہر آرائش حسن کے پاس جا کر اپنے میک اپ کو صاف کروائیں اور اپنی جلد کو غذائیت پہنچانے کے لیے وچی کی نورما ڈوم اینٹی امپر فیکشن جیل استعمال کریں۔ اگر آپ چند اور بنیادی اشیاء استعمال کرنا چاہیں تو فوریسٹ ایشنل اور لیکمے کے موئسچرائزر بھی استعمال کر سکتی ہیں۔

☆☆......☆☆